



# انٹرمیڈیٹ کالج میگزین

## علی گڑھ

جلد (۲) فروری و مارچ سنہ ۱۹۳۰ء شمارہ (۲ و ۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# انٹرمیڈیٹ کالج میگزین

جلد ۲ | بابت ماہ فروری و مارچ سنہ ۱۹۳۰ء | نمبر ۲ و ۳

## فہرست مضامین

# حالی کا درجہ اُردو شعرا میں

(از محمد ظفر احمد صاحب صدیقی متعلم انٹر کالج)

تاریخ سے باخبر حضرات پر یہ حقیقت آفتاب کی طرح روشن ہے کہ شاعری سے دنیا میں ہزارہا انقلاب رونما ہوئے ہیں۔ اکثر شاعری کی بے پناہ قوتوں نے آنِ واحد میں قوموں کی قسمت کا پانسہ پلٹ دیا ہے۔ متعدد بار شاعری نے دو قبیلوں یا دو فردوں کو مشتعل کرنے میں آگ کا کام کیا ہے اور پھر نائرۂ غضب کے بجھانے میں پانی کی خدمت بھی اسی نے انجام دی ہے۔ یونان و روما، مصر و ہند کے علمی اور ادبی کارنامے اور ان کی حیرت انگیز تاثیرات آج تک تاریخِ عالم کے صفحات پر زریں حروف میں ثبت نظر آتی ہیں۔ عرب ہی کو دیکھئے۔ بازارِ عکاظ کے میلے اور وہاں شعرا کا باہم مقابلہ اور کمالِ سخن کا مظاہرہ کون نہیں جانتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب خاندان میں کوئی شاعر نیک نامی حاصل کرتا، قومی تفاخر اس کے سر پر عقیدت کے پھول برساتا اور خاندانی حمیت اس کی دستار پر طرۂ امتیاز سجاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ وحی اور الہام کی زبان نے ایسی ہی شاعری کو حکمت اور ایسے ہی بیان کو سحر سے تعبیر کیا ہے۔

ایرانی شاعری دل کی اُمنگ اور طبیعت کے ولولے کا نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ درباری تحریک اور انعام کی تحریص کے باعث وجود میں آئی۔ اسی وجہ سے ایرانی شاعری یہ زورِ تاثیر، یہ حریت فکر، یہ ہنگامہ آفرین شان اور یہ انقلاب انگیز کیفیت پیش کرنے سے قاصر رہی۔ بلکہ عربی ادب میں بھی عجمی عناصر کی آمیزش کے بعد وہ جادو نظر نہیں آتا جو متقدمینِ عرب کا حصہ تھا۔

اُردو شاعری نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو فارسی شعرا کی آغوش میں پایا۔ اُس کے سامنے اگر کوئی نمونہ تھا تو ایران کی شاعری جس کا بڑا حصہ تکلف و تصنع، نزاکتِ خیالات، رنگینیِ استعارات سے گراں بار تھا۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا یعنی اُردو شاعری اور خصوصاً عشقیہ شاعری (بہ استثنائے چند) واقعیت اور اصلیت سے کوسوں دور جا پڑی، ہمارے شعرا کو بقولِ آزاد "خیالی طوطا مینا بنانے یا ہوائی قلعے تعمیر کرنے کے سوا کوئی کام

رہا"۔ اگر مدح ہے تو بے اصل اور تغزل ہے تو بے کیف۔ اساتذۂ اُردو کے قصائد کے دفتر کے دفتر پڑھ جایئے گو ممدوح کی حیثیت ایک معمولی رئیس سے زیادہ نہیں لیکن ہفت اقلیم کے سلاطین اس کے آستانۂ جلال پر جبینِ عقیدت ملتے ہیں۔ غزلیات کا بھی کم و بیش یہی عالم ہے۔ محبوب کی زلف روزِ قیامت سے زیادہ دراز اور اس کا دہن جزو لایتجزا سے معدوم تر۔ ظاہر ہے کہ جب کمالِ سخن ان امور پر منحصر ٹھیرا تو کلام میں تاثیر کا ہونا معلوم۔

۱۸۳۷ء تک اُردو ادبیات کا قافلہ اسی فرسودہ روش پر چل رہا تھا کہ قدرت نے ایک مجددِ عصر، ایک مصلحِ زبان پیدا کیا جس کو سعدیِ ہند کہنا ذرہ بھر مبالغہ نہ ہوگا۔ آپ کا نامِ نامی خواجہ الطاف حسین ہے۔ حالی تخلص پانی پت میں پیدا ہوئے۔ عربی فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد سترہ سال کی عمر میں دہلی تشریف لائے۔ وہاں غالب مصطفٰے خاں شیفتہ، آزردہ، نیرّ وغیرہ جیسے باکمال حضرات کی صحبت ملی جس نے ان کے جوہرِ طبیعت پر جلا کا کام کیا۔

## حالی کی شاعری

حالی کا طرۂ امتیاز اور مایۂ ناز ان کا سادہ اور پُر اثر طرزِ بیان ہے جو قدم قدم پر ان کے کمالِ سخن کی شہادت دیتا ہے۔ وہ درد و داغ کے جھوٹے قصے اور گل و بلبل کے فرضی افسانے سنانے کے بجائے قوم کا مرثیہ لکھتے ہیں۔ خط و خال و گیسو میں اُلجھنے کی بجائے نیچر کا وسیع میدان ان کے سمندِ فکر کی جولانیوں کے لئے وقف ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں دل سے نکلتا اور دل میں گھر کرتا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں ؎

بس زیادہ پیسنے سے لینے کیا حاصل تجھے + پس چکے اے آسیائے گردشِ ایام ہم

کیا مسلمانوں کے حالِ زار کا نقشہ کوئی اس سے زیادہ دردناک الفاظ میں پیش کر سکتا ہے۔

ایک جگہ ہندوستان کی شکایت ان الفاظ میں کرتے ہیں ؎

پھر گئی سرحد سے تیری فوجِ یوناں جس طرح　　کاش پھر جاتے یونہیں در سے ترے ناکام ہم

ان دو مصرعوں میں شکایت کا جو دفتر بند ہے اور مسلمانوں کی بربادی کا جو مرقع دیا ہے اس کی تعریف زبان کی طاقت سے باہر ہے۔ پھر جس حسرت سے کہا ہے "کاش پھر جاتے .... الخ" اس پر بے اختیار آنسو نکل پڑتے ہیں مسلمانوں کی حالت کے اس قدر جلد تغیر کو آگے چل کر شکوۂ ہند میں کتنے لطیف پیرایہ سے ادا کیا ہے ؎

بزم کو برہم ہوئے مدت نہیں گزری بہت　　اُٹھ رہا ہے گُل سے شمعِ بزم کی اب تک دھواں

کہہ رہے ہیں نقشِ پائے رہرواں اے خاکِ ہند ٭ یاں سے گزرا ہے ابھی اک باتجمل کارواں

گناہ کے بعد ایک وہ وقت آتا ہے جب انسان اپنے ضمیر کے ہاتھوں۔ اپنا قصور تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور غفلت کا پردہ ہٹ جاتا ہے۔ کیا خوب لکھا ہے ؎

دیکھے ہیں یہ دن اپنی ہی غفلت کی بدولت ٭ سچ ہے کہ بُرے کام کا انجام بُرا ہے

ایک جگہ اہلِ زمانہ کی غفلت کا خاکہ اڑایا ہے ؎

آفاتِ بحر سے ہیں ناواقف آشنا سب ٭ ہنستے ہیں ناخدا پر روتا ہے ناخدا جب

مصائبِ پیری کی شکایت کس نے نہیں کی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ساری شوخی اور طراری خاک میں مل جاتی ہے حالؔی نے اس مضمون کو باندھا ہے مگر جوانی کی کجرائی کا عالمِ پیری کی بیچارگی سے مقابلہ کر کے شعر کے حسن کو دوبالا کر دیا۔ لکھتے ہیں ؎

ہوئے تم نہ حالؔی جوانی میں سیدھے ٭ مگر اب مری جان ہونا پڑے گا

بہار کی بے ثباتی گل کی ناپائداری شعرا نے خوب خوب طریقے سے دکھائی ہے۔ لیکن ذرا حالؔی کی زبان سے بھی سنئے ؎

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل ٭ کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

---

کبک و قمری میں یہ جھگڑا ہے چمن کس کا ہے ٭ کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

---

ملے گا نہ گلچیں کو گل کا پتا ٭ ہر اک پنکھڑی یوں بکھر جائے گی

حالؔی نے عشقیہ اشعار میں بھی اپنے رنگ کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ خیالات ہیں تو اونچے۔ جذبات ہیں تو بلند طوالت کے ڈر سے یہاں صرف چند شعروں پر اکتفا کیا جاتا ہے ؎

پھل کچھ اے نخلِ وفا تجھ میں نہیں ٭ جو لگائے گا تجھے پچھتائے گا

---

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

حالی ہمیشہ صنائع بدائع سے پرہیز کرتے رہے۔ مبالغہ دُور از کار تشبیہات ان کے کلام میں کم ملیں گی یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری تصنع سے پاک ہے اور درد و تاثیر میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔

حالی کے کلام کی ایک بڑی خصوصیت تنوع ہے۔ وہ ایک ہی بات کو نہیں دہراتے بلکہ کبھی فلسفہ و تصوف کے پیچیدہ مسائل حل کرتے نظر آتے ہیں تو کبھی ملکی و سیاسی گتھیاں سلجھانے میں مشغول دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی مسجد میں زاہدِ خشک، کبھی میخانہ میں رندِ لاابالی، کبھی درسِ اخلاقیات دیتے ہیں تو کہیں تعلیم سرور۔

لیکن عشق ہے تو عشقِ حقیقی اور شراب ہے تو شرابِ معرفت۔ کیا مجال کہیں سوقیانہ یا مبتذل جذبات کا شائبہ بھی پایا جائے۔ مندرجہ ذیل اشعار سے ناظرین حالی کی قادر الکلامی اور تنوعِ خیالات و مضامین کا اندازہ کریں مفصل بحث کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں ہے

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں ؎ اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

---

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا ؎ ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

---

کرتے کیا پیتے نہ گر وقتِ عشائے ناصح ؎ وقت فرصت کا یہ کس طرح گنوایا جاتا
عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید ؎ خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

---

جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز ؎ دوستو دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز

معترضین کا اعتراض ہے کہ حالی اکثر جگہ قوانینِ شاعری کی خلاف ورزی کر جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی زبان میں اور شاعری میں کہیں کہیں عیب ضرور ہیں۔ جیسے تعقید، تنافرِ ترکیب، حشو وغیرہ۔ مثلاً

تعقید کی مثال :-

یہ خاک آج جس پہ ہیں جمع اہلِ آرا ؎ یہاں ہو چکے کرشمے کیا کیا ہیں آشکارا

تنافرِ ترکیب :۔ ۵

جس دین کی حجّت سے سب ادیان تھے مغلوب الخ

میری ناچیز رائے یہ ہی کہ ان عیبوں کو مشکل ہی سے لغزش کہا جا سکتا ہی۔ حالیؔ چوں کہ توسیعِ زبانِ اُردو کے حامی تھے اس لئے اُنھوں نے یہ اجتہاد کیا۔ نیز اگر اس کا خیال کرتے تو تاثیرِ کلام سے ہاتھ دھونا پڑتا۔

حالیؔ کی شاعری پر ایک غائرانہ نظر ڈالنے ہی سے معلوم ہو جائے گا کہ جو روش اُنھوں نے اختیار کی اس کے وہ موجد بھی تھے۔ اگرچہ ان کے زمانہ میں اور ان کے بعد آزادؔ، اقبالؔ، اکبرؔ وغیرہ نے قومی یا نیچرل نظمیں لکھیں لیکن ابتدا کا سہرا حالیؔ کے سر ہی رہتا ہی اور اگر ہم یہ کہیں کہ اُنھوں نے ہی اس کو معراجِ کمال تک پہنچا دیا تو بھی بیجا نہ ہوگا۔

# ایک افسانہ

(۱)

مولوی ہدایت حسین کا شمار شہر کی ان برگزیدہ ہستیوں میں تھا جن کی ذاتِ بابرکات سے لوگوں کو حقیقی عقیدت اور واقعی ارادت تھی۔ اس عہدِ پرآشوب میں بھی ان کا دامن شہرت ہر قسم کی آلودگیوں سے بری تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ کسبِ معاش کی طرف سے بے نیاز تھے۔ ایک مختصر سی جائداد وراثتاً ان کے قبضہ میں آئی تھی جو ان کی محدود ضروریاتِ زندگی کے لئے کافی سے زیادہ تھی۔ ان کی قانع طبیعت ہوس کو اس سے بڑھکر قدم رکھنے کی اجازت بھی نہ دیتی۔

مولوی صاحب پر لوگوں کا اعتقاد اس درجہ راسخ ہوگیا تھا کہ بغیر رسید و گواہ ان کے پاس امانتیں رکھ جاتے۔ خیانت کا تو ذکر ہی کیا۔ مولوی صاحب آنکھ اٹھاکر بھی دیکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ مطالبہ پر بجنسہٖ حوالہ کردیتے۔ یہ تھا ہوس اور ایمان کا مقابلہ۔ مولوی صاحب اس امتحان میں پورے اُترتے لیکن جب ضرورت مندی و افلاس کی بے پناہ قوتیں ایمان کی طاقت کے خلاف متحد ہوجائیں اس وقت بڑے بڑوں کے قدم جادۂ مستقیم سے ڈگمگا جاتے ہیں اس لئے ان کے تقوے کی بابت کوئی رائے قائم کرنا ابھی قبل از وقت ہے۔

(۲)

دہقانوں کی کیا ایک عالم کی منتظر نگاہیں سوئے فلک لگی ہوئی ہیں۔ مگر بادلوں کا نشان نہیں۔ ہرے بھرے کھیت کسی کے نخلِ تمنا کی طرح خشک ہوکر رہ گئے ہیں۔ معمولی زمینداروں کا تو ذکر ہی کیا۔ بڑی بڑی حقیتوں کے مالک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ اس پر سرکاری مال گزاری کا تقاضا عذابِ جاں ہے۔

مولوی ہدایت حسین کو کبھی روحانی تصرف کا دعویٰ نہیں ہوا۔ بفرضِ محال اگر ہوتا بھی تب بھی آفاتِ سماوی کے سامنے سرِ عجز خم کرنا پڑتا۔ پھر وہ بھلا ان دنیاوی مصائب سے متاثر کیوں نہ ہوتے۔ ان کو بھی وہی خشک سالی کا رونا تھا۔

اگر دستِ غیب ہوتا یا صراحتاً یوں کہئے کہ حلقۂ مریدین سے کچھ نذر نذرانہ کا سلسلہ جاری ہوتا تب وہ اس خشک سالی میں بھی بند نہ رہتا مگر وہ اس سے بھی محروم تھے۔ ان کے دل میں نورِ ایمان کا جو ہر تو تھا وہ اس ضمیر فروشی پر آمادہ نہ ہونے دیتا مولوی ہدایت حسین نے جہاں تک ان کی ذات سے تعلق تھا ان تکالیف کو دلیرانہ خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور بہرحال میں خدائے بزرگ و برتر کا شکر ادا کرتے رہے۔ مگر کہتے ہیں مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ مولوی صاحب کی مشکلات میں اضافہ کرنے کے لئے ان کا اکلوتا لڑکا احمد بسترِ علالت پر پڑ گیا۔ مگر انھوں نے اس آزمائش پر بھی دامنِ صبر کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

لیکن جب بچے کی بڑھتی ہوئی بیماری اور اپنی بے کسی پر غور کرتے تو باوجود ضبط کی انتہائی کوشش کے آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا آتیں۔ حسرت سے آسمان کی طرف دیکھ کر رہ جاتے۔ اس حالت میں بھی سوائے شکر کے کچھ زبان سے نہ نکلتا۔ لیکن عورت کا دل بھی کس قدر نازک ہوتا ہے۔ احمد کی ماں اپنے کلیجے کے ٹکڑے کی ردی حالت کو دیکھتی اور خونِ جگر پی پی کر رہ جاتی۔

(۳)

رات کا وقت تھا۔ احمد کی ماں اس کے پاس بیٹھی ہوئی پنکھا جھل رہی تھی۔ مولوی صاحب نماز وظیفہ سے فارغ ہو کر بستر پر لیٹے تھے مگر نیند آنے کا نام نہ لیتی تھی۔ کرب اور بے چینی کی حالت میں کروٹیں بدل رہے تھے۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ آخر احمد کی والدہ نے اس طرح مہرِ سکوت کو توڑا " دیکھتے ہو۔ احمد کی حالت روز بروز ردی ہوتی جا رہی ہے۔ آخر کیا انجام ہونا ہے۔ "

مولوی صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لی جس سے معاملہ کی نزاکت کے احساس کا پتا چلتا تھا اور کہا۔ " جو تقدیرِ الٰہی ہے وہی ہوگا۔"

" مگر اس کے یہ معنی تو نہیں کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔"

" آخر تمھیں بتاؤ میں کیا کر سکتا ہوں۔ نسخہ رکھا ہوا ہے مگر آئے کہاں سے۔ زمانہ کا یہ رنگ کہ ایک پیسہ کا بھی اعتبار نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے کسی کے آگے دستِ سوال پھیلاتے بھی شرم آتی ہے۔"

اس پر احمد کی ماں بحرِ خیالات میں غرق ہوگئی۔ چہرہ کا متغیر رنگ دل کے اندرونی جذبات کا پتا دے رہا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی بات زبان تک آ آ کر رک جاتی ہے۔ آخر رکتے رکتے دبی زبان سے کہا۔

"وہ ... جو ... تمہارے صندوق میں ... روپئے ... رکھے ہیں"

"روپیہ! میرے صندوق میں کہاں؟"

احمد کی ماں نے ذرا آہستہ سے جواب دیا:

"اے ہاں۔ وہی پروسن والے"

مولوی صاحب ان الفاظ کو سن کر مبہوت ہو کر رہ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جواب بالکل خلافِ توقع ہے۔ آخر مستقل مزاجی سے جواب دیا۔

"وہ امانت ہے۔ اس میں خیانت کرنا میرے لئے قطعی ناممکن ہے"

"نوج۔ خیانت تمہارے دشمن کریں لیکن عاریتاً ایک آدھ روپیہ لو تو کونسا گناہ ہے۔ اللہ جب دے گا تو سب سے پہلے ادا کر دیا جائے گا"

کچھ تو بچے کے خیال نے مولوی صاحب کو بے تاب کر دیا تھا اور کچھ بیوی کی سحر بیانی سے مرعوب ہو کر بولے۔

"احمد کی بیماری کی خود مجھے فکر ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ امانت کو ہاتھ لگا کر میں اپنے ضمیر کو ہمیشہ کے لئے مجرم بنانا نہیں چاہتا۔ اگر پروسن موجود ہوتیں تو ان سے پوچھ لینے کے بعد کچھ مضائقہ نہ تھا۔ بہر حال خدا مالک ہے"

مولوی صاحب کی اندرونی اضطراری کیفیت کا ان کے چہرہ سے مطالعہ کر کے ان کی اہلیہ نے زیادہ ترغیب دلانے والے الفاظ میں کہنا شروع کیا۔

"ذری سوچو تو کب سے بچے کی زبان پر دانہ نہیں گیا ہے آخر اس معصوم کا بھی کچھ خیال کرو۔ پروسن جب آئیں ان سے معاف کرا لینا۔ بیچاری ایسی نہیں ہیں میں قسم کھا کے کہتی ہوں ذرا آزردہ نہ ہونگی۔ اور آزردہ ہونے کی بات ہی ایسی کونسی ہے۔ ابھی ان کے آنے میں دو ایک مہینے ہیں جب تک خدا کوئی نہ کوئی سبیل کر دا ہی دے گا"

ہم نہیں کہہ سکتے کہ بیوی کی ترغیب اور بچے کی محبت میں سے کس نے مولوی صاحب کی بنیادِ ایمان متزلزل کرنے میں زیادہ حصہ لیا۔ غرض مولوی صاحب نیم راضی سے معلوم ہونے لگے۔ اس عرصہ میں ان کی بیوی نے اپنی جادو بیانی کو جاری رکھا کہ مبادا ایمان کی دبی ہوئی آگ پھر نہ مشتعل ہو جائے۔ مولوی صاحب عجب پس و پیش میں تھے۔ کبھی بچے کی

محبت کا جذبہ غالب آجاتا کبھی ضمیر ملامت کرتا۔ آخر بہ ہزار دقت اتنے پر آمادہ ہوئے کہ "میں اپنے ہاتھ سے ایک پیسہ نہ چھوؤنگا تم ہی اس معصیت میں اپنے ہاتھ آلودہ کرو۔"

---

اس قلیل عرصہ میں بچّے کی حالت میں ایک غیر معمولی تغیر معلوم ہوتا تھا۔ دوا کے پینے سے نہ وہ بخار کی شدّت تھی نہ کرب و بے چینی۔ مولوی صاحب خدا کی اس مہربانی کا شکر بھی ادا نہ کرنے پائے تھے کہ نئی آفت کا سامنا تھا۔ سرکاری مال گزاری کا سخت تقاضا اور بہ صورت عدم ادائیگی قرقی یا حوالات۔ بیوی نے وہی پچھلا نسخہ تجویز کیا یعنی جہاں پروسن کے روپیوں میں سے دو چار لئے ہیں وہاں پچاس ساٹھ اور سہی۔ آبرو سب سے مقدم ہے، مولوی صاحب نے اس دفعہ نہ تیور بدلے، نہ پیشانی پر بل ڈالے اور نہ حیرت و استعجاب کا اظہار کیا۔ خاموشی سے سر جھکا دیا۔

الغرض یہ بلا بھی سر سے ٹلی لیکن آج مولوی صاحب رہ رہ کر دل پر ایک بوجھ سا محسوس کر رہے تھے اتنے میں کسی نے آکر خبر دی کہ پروسن سفر سے آگئیں اور روپیہ منگوایا ہے۔ مولوی صاحب سرکاری پیادوں کو دیکھکر بھی اتنے پریشان نہ ہوئے ہونگے جتنا یہ خبر سُن کر۔ بیوی پر ایک نگاہ قہر آلود ڈال کر کہا:

"ہائے تو نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ احمد کو میں اپنے ہاتھ سے قبر میں سلا دیتا۔ سرکاری پیادے مجھے اسیر کر کے لے جاتے اس سے قبل کہ آج دنیا کی نظر میں خائن ٹھیروں اور کل خداوند عالم کے روبرو بد دیانتی کا مجرم ٹھیروں۔"

یہ الفاظ مشکل سے ادا ہوئے ہونگے کہ مولوی صاحب کی آنکھ کھل گئی۔ مولوی صاحب کو یہ معلوم کر کے بے انتہا مسرت ہوئی کہ گزشتہ واقعات خواب پریشاں سے زیادہ ثابت نہ ہوئے۔ تاہم ان کو ایک تنبیہ خیال کر کے درگاہ خداوندی میں سر بسجود ہو گئے اور امتحان سے قبل متنبہ کر دینے پر صدق دل سے شکر ادا کیا۔ پھر اتنے میں احمد نے آنکھ کھولی اور پانی مانگا اس وقت سے اس کی حالت روبہ اصلاح ہوتی گئی۔

---

# ہلالِ عید اور شاعر

(از حکیم احمد علی خاں صاحب حامدی متعلم انٹر کالج)

## ہلالِ عید

مضطرب رکھتی ہی کس شوخ کی فرقت تجھکو — یاد کس گل کی ہوئی باعثِ کلفت تجھکو
کیوں پریشان ہی تو کس کی ہی حسرت تجھکو — لے نہ ڈوبے کہیں گردابِ محبت تجھکو

ایک عالم کو مرا جلوہ نشاطِ دل ہی
تجھکو منظور مگر کون مہِ کامل ہی

## شاعر

آہ اے چاند کہوں کیا مری حالت کیا ہے — تو جو پوچھے تو بتا دوں غم و حسرت کیا ہے
درد ہی سوز ہی کاہش ہی گراں جانی ہے — میری تقدیر کی دنیا بھی تو طوفانی ہے
دل کی جمعیّت و تسکیں کو ترس جاتا ہوں — ضبطِ غم ہو نہیں سکتا تو برس جاتا ہوں
کہتے ہیں عشق کی دنیا کبھی بے نور نہیں — میری آنکھیں تو مگر نور سے معمور نہیں
دیکھتا ہوں میں ہر اک چیز میں ظلمت کے نشاں — مجھکو آتی ہی ہر اک شے میں نظر یاس نہاں

---

اے مہِ چرخ کہ ہی حسن کی دنیا تجھ میں — کیوں نظر آئے نہ نیرنگِ تجلّا تجھ میں
اے کہ پنہاں ہی ترے نور میں دنیائے نشاط — اے کہ ہے تیری کرن برقِ تجلّائے نشاط
ناصیہ سے ترے ظاہر ہیں خوشی کے آثار — تیری آنکھوں سے ٹپکتے ہیں دُرِ خوشِ انوار
افقِ غرب پہ تو صورتِ الہام آیا — لو مبارک ہو کہ وہ عید کا پیغام آیا

آتے ہی ندی مسرت کی بہانے والے — اپنی کرنوں کو ہر اک دل میں ترانے والے
آنے سے تیرے جہاں بھر میں ہے ہلچل پیدا — تو نے جادو کوئی دنیا پہ مگر پھونک دیا
تجھ میں میرے لئے بھی سحر ہی پوشیدہ مگر — جم کے رہ جاتی ہیں نظریں مری تیرے رُخ پر
مجھکو بھی ہوتی ہے یک گونہ تسلی تجھ سے — یعنی پالیتا ہوں میں اک نئی ہستی تجھ سے
دیکھتا ہوں میں ترے حُسن میں اک رازِ نہاں — مجھکو آتا ہے نظر تیری شعاؤں میں جہاں
مخزنِ حُسن ہے تو تُو ہے تمنا میری — یا کہ سوئی ہوئی بدبختی کی دنیا میری

---

اے کہ ہے تاب تری برقِ تجلا کی مثال — تیری کرنوں میں ہے اُن شوخ نگاہوں کا جمال
تابشیں تیری مرے دل میں اُتر جاتی ہیں — بن کے لیلیٰ اسی محمل میں اُتر جاتی ہیں
تیرے رخساروں پہ ہوجاتا ہے دھوکا مجھکو — جاننے لگتا ہوں میں اپنی تمنا تجھکو
تیری ان نازنیں ابروؤں میں کھو جاتا ہوں — پھر چمکتی ہوئی اُمیدوں میں کھو جاتا ہوں
جانتا ہوں کہ اُسی حسن کی آغوش میں ہوں — خوبیِ بخت سے پھر عالمِ مدہوش میں ہوں
پھر ہوں میں بیخود و سرشار زکیفیتِ حسن — پھر مرے دل کو ہے حاصل وہی حیثیتِ حسن
پھر مری جان میں ہیجان سا اک پیدا ہے — پھر مری روح پہ ایک جوشش کرم فرما ہے
آگے پھر میری نگاہوں کے وہی جلوہ ہے — جاکے کوئی عدم آباد سے لوٹ آیا ہے
میری خاطر جو تھی ملحوظ نہ سویا کوئی — موت کی نیند سے جاگ اُٹھا ہے گویا کوئی

---

خوف آتا ہے مگر پھر کہیں یہ بات نہ ہو — زلف کی آڑ میں سوتی شبِ ظلمات نہ ہو
کہیں کھاتا نہ ہوں میں زلف کا دھوکا شب پر — تابشِ ریگ کو سمجھا نہوں دریا کی خبر
نہ پڑے بعد میں اس فہم پہ رونا مجھکو — ہنس کے رہ جائے ملمع ہی نہ سونا مجھکو

اے مرے چاند ترے چرخ پہ کب ممکن ہے — جاگ اُٹھے پھر کبھی گائے ہوئے نغموں کی لَے
غیر ممکن ہے کہ مرکر کوئی جی جائے گا — آہ کیوں کر عدم آباد سے لوٹ آئے گا
اب کہاں دہر میں وہ حسن وہ صورت باقی — غم نصیبوں کے لئے رہ گئی حسرت باقی
نہ رہا آج کو میسر مہِ کامل نہ رہا — موت! فریاد ہے میں زیست کے قابل نہ رہا

٭

لیکن اے چاند یہ کیا مجھکو صدا آتی ہے — دھیمی دھیمی کسی جانب سے نوا آتی ہے
سوچتا ہوں کہ یہ آواز کہاں سے آئی — یا خدا یہ تو مرے دل کے مکاں سے آئی
کوئی بیٹھا ہوا آلا سی سُناتا ہے مجھے — رمز کچھ گہرے حقائق کے سُجھاتا ہے مجھے

٭

اے کہ ہے قلب ترا زخم سے افگار ہنوز — اے کہ ہے آنکھ تری درد سے خونبار ہنوز
اے کہ انوار سے معمور ہے سینہ تیرا — واقفِ رازِ ازل ہے دلِ بینا تیرا
طرب و عیش سے لبریز ہے دنیا تیری — تو سمجھتا ہے غم انگیز ہے دنیا تیری
فرض ہے تجھ پہ کہ تو درد کو راحت سمجھے — شرم ہے تو جو مصیبت کو مصیبت سمجھے
تو ہمہ کیفِ مسرت ہے مسرت کیا ہے — تجھ سے سرشارِ محبت کو مصیبت کیا ہے
درد کہتے ہیں کسے کاوشِ کلفت کیا ہے — اک فریبِ نگہِ حس کی حقیقت کیا ہے
جاگ اُٹھ ڈھونڈھ لے دنیائے مسرت اب بھی — انھیں تکلیفوں میں پوشیدہ ہے راحت تیری
زندگانی سے مری مفت ہوئی یاس تجھے — اُٹھ اگر میری محبت کا ہے کچھ پاس تجھے
مرکے میں نے تجھے دکھلایا ہے جاں ہو جانا — کسی مظلوم کے سینے میں نہاں ہو جانا
موت کیا چیز ہے کچھ اس سے نہیں کام مجھے — جاوداں کرکے رہا ہے ترا پیغام مجھے
جو فنا ہو کے بھی باقی ہے وہ ہستی ہے مری — تیز تر ہوتی ہے ترشی سے وہ مستی ہے مری
چشمِ بینائے حقیقت ہو تو میں زندہ ہوں — مرکے بھی تیرے لئے دہر میں پائندہ ہوں

سب سے معذور رہی تجھ سے میں معذور نہیں — تو جو سمجھے تو ترے دل سے کبھی دور نہیں
اب بھی خوابیدہ تمنا کو جگا دیتی ہوں — آگ سی ایک ترے دل میں لگا دیتی ہوں
بن کے نشتر تری رگ رگ میں کھٹکتی ہوں میں — اشک کی شکل میں پلکوں سے اُٹھتی ہوں میں
تو سمجھتا ہے جسے کاہشِ دل میں ہی تو ہوں — درد میں بھی تو ہوں ہاں سوزشِ دل میں بھی تو ہوں
پردۂ مرگ کے پیچھے سے جھلک باقی ہے — میری اس منظرِ ہستی میں چمک باقی ہے

کوئی آساں نہیں دنیا سے گزرنا میرا
فرض ہے تیرے دلِ زار پہ مرنا میرا

# ہنسنے والا بھوت

(از خواجہ احمد عباس صاحب متعلم انٹرمیڈیٹ کالج)

پچھلے دسمبر میں میں بھی ان چند بدنصیب لڑکوں میں سے تھا جو بڑے دن کی چھٹیوں میں اپنے وطن نہیں گئے تھے۔ جیب کا خالی ہونا، وطن کا دُور ہونا اور کچھ کچھ امتحان کی تیاری کا خیال۔ ان چند وجوہات سے مجھے بھی ان دو لڑکوں کا شریکِ حال ہونا پڑا جو اثنائے تعطیل میں جوبلی (یا پنجاب) ہوسٹل میں مقیم تھے۔ تقدیر کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ہم تینوں کی کچھ زیادہ ملاقات بھی نہ تھی کیوں کہ میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا اور وہ دونوں نویں اور سیکنڈ ایر کے ہم لوگوں کے کمرے بھی ایک دوسرے سے بہت دُور واقع ہوئے تھے۔ میں ۱۳ نمبر میں اور باقی دونوں میں سے ایک ۲ نمبر اور دوسرا ۲۸ نمبر میں مقیم تھے۔

اس زمانے میں میں نو بجے سو کر اُٹھتا دس بجے تک ناشتہ کرتا۔ دو یا تین بجے تک پڑھتا اور پھر سائیکل پر سوار ہو کر شہر یا کسی دوسرے بورڈنگ ہاؤس کی سیر کو نکل جایا کرتا تھا۔

ایک روز مجھے شہر سے واپسی میں دیر ہوگئی جب واپس ہوا تو دیکھا کہ بھائی مظہر سٹور کے سامنے کھڑے ہیں سلام علیک کے بعد وہ مجھے اپنے کمرے (واقع میرس ہوسٹل) میں لے گئے۔ جہاں میں نے کھانا کھایا اور وقت گزارنے کے لئے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کردیں۔ دورانِ گفتگو میں مظہر نے مجھ سے بھوت پریت کی بابت میری رائے دریافت کی۔ میں نے اس کا جواب صرف ایک قہقہہ سے دیا۔ "تو کیا تم نے پنجاب ہوسٹل کے بھوت کو جو وہاں کے پاخانوں میں رہتا ہے کبھی نہیں دیکھا" میرے دوست نے کہنا شروع کیا "لیکن جو واقعہ میں تم کو سناتا ہوں وہ نہ صرف چشم دید ہے بلکہ خود میرے ساتھ گزرا ہے۔ پچھلے سال جب کہ میرا قیام پنجاب ہوسٹل میں تھا ایک رات جاڑوں کے موسم میں مجھے پاخانہ جانے کی ضرورت پیش آئی جوں ہی میں نے پاخانہ کے اندر قدم رکھا ایسا معلوم ہوا

جیسے کوئی لمبا تڑنگا شخص دانت نکالے راستہ روکے ہوئے کھڑا ہے۔ دہشت کی وجہ سے میرے ہاتھ سے لوٹا گر پڑا اور میں اپنے کمرے کی طرف بھاگا جہاں گھستے ہی میں نے کواڑ بند کر لئے اور لحاف میں منھ چھپا کر لیٹ گیا۔ اس واقعہ کی وجہ سے مجھے رات بھر نیند نہیں آئی۔ بار بار ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی شخص شیشوں میں سے جھانک رہا ہے لیکن سب سے زیادہ تعجب کی یہ بات ہے کہ علی الصباح جب میں لوٹا اٹھانے پاخانے میں گیا تو وہ وہاں نہ ملا بلکہ فرسٹ فلور کے صحن میں پڑا ہوا پایا گیا۔ تو کیا اس واقعہ کے سننے کے بعد بھی تم بھوتوں کے وجود کے قائل نہیں ہو گے؟"

میں بھلا کب قائل ہونے والا تھا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ یہ اس کا وہم تھا اور گھڑی کی طرف دیکھ کر جو ۱۱ ½ بجا رہی تھی میں نے اس سے کمرہ جانے کی اجازت مانگی۔

اگرچہ میں جن بھوت وغیرہ کا قائل نہ تھا تاہم میرے دوست کی تقریر کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ مجھے کمرے پہنچنے تک جو چیز نظر آتی تھی وہ بھوت معلوم ہوتی تھی لیمپ پوسٹ، ٹینس کورٹ کے بانس، چوکیدار۔ اس کا کتا۔ غرض ہر چیز بھوت معلوم ہوتی تھی۔

جو لوگ پنجاب ہوسٹل کے جغرافیہ اور تاریخ سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ میرا کمرہ ۱۳ ان پاخانوں کے بالکل قریب ہی جو بھوتوں کا مسکن خیال کئے جاتے ہیں۔ میں کمرہ میں داخل ہوا اور شمع روشن کی لیکن جیسے ہی میں کھڑکی کو بند کرنے کے لئے اس کی طرف بڑھا وہ ہوا کے ایک جھونکے سے بجھ گئی۔ میں میز کی طرف دیا سلائی لینے کے لئے بڑھا لیکن ابھی میں میز تک نہ پہنچا تھا کہ ایک خوفناک قہقہہ سنائی دیا۔ یہ قہقہہ انسانی نہ تھا۔ لہذا میرا خیال فوراً بھوتوں کی طرف مبذول ہوا اور میں اتنا خوف زدہ ہو گیا کہ شمع میرے ہاتھ سے زمین پر گر پڑی میں کچھ دیر خاموش کھڑا رہا لیکن پھر سوچا کہ یہ سب وہم ہے۔ میں نے میز پر سے دیا سلائی کا بکس اٹھایا کہ دیا سلائی جلا کر شمع روشن کروں لیکن دیا سلائی بکس میں سے نکالی ہی تھی کہ پھر وہ خوفناک قہقہہ سنائی دیا۔ اس دفعہ ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی شخص میرے اس خوف پر مضحکہ اڑا رہا ہو۔ میرے ہاتھ خوف سے کانپنے لگے اور میرے ہاتھ سے بکس گر کر دیا سلائیاں فرش پر منتشر ہو گئیں۔ میں نے ٹٹول کر دیا سلائیاں اور بکس اٹھایا لیکن جو دیا سلائی جلاتا تھا وہ ہوا کے جھونکے سے بجھ جاتی تھی۔ بڑی مشکل سے دیا سلائی جلی تو شمع غائب تھی۔ مجھے کوئی ایک درجن دیا سلائیاں اس کو ڈھونڈنے میں صرف کرنی پڑیں۔ جیسے ہی میں اس کو جلانے کے لئے اٹھانے لگا مجھے ایسا

محسوس ہوا۔ جیسے کوئی چیز میرے پاس سے گزری اور کارنس کے قریب اس خوف ناک قہقہہ کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دوبارہ شمع جلائی اور کمرے کے چاروں طرف دیکھنا شروع کیا۔ لاحول ولاقوۃ میں ہنستے ہنستے پاگل ہوگیا جب کہ میں نے کارنس پر ہاؤس ٹیوٹر صاحب کے طوطے کو بیٹھا ہوا دیکھا جو اتفاقیہ کھلی ہوئی کھڑکی سے اندر آگیا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ سوائے ہنسنے کے کوئی اور بولی جانتا ہی نہ تھا۔

# لُر

(از رشید احمد صدیقی ، علیگ ، مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

کرسمس کا زمانہ تھا جب انگریزی کیک اور ہندوستانی سردی کھاتا ہے۔ بارش ہو رہی تھی' ہوا تیز و تند' سردی نہیں کپکپی کا عالم تھا' رات تاریک جیسے تارکول کا سمندر' بیوی بچوں سے جو کچھ بچا تھا وہ جسم پر لپٹا ہوا تھا۔ پارسال کی روئی دار مرزئی تیرس کے سال کا سوئٹر اور مفلر۔ اس سے پہلے کا کمّل اور محاذ جنگ سے پلٹا ہوا جسٹر۔ دو دو موزے ایک دوسرے کے پردہ پوش۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی' سب لوگ اس اطمینان سے بیٹھے ہوئے تھے گویا نہ یونیورسٹی تھی اور نہ پولس' نہ بیوی تھی نہ انفلوائنزا' ایک سکوت کا عالم تھا۔ معلوم ہوتا تھا ہر شخص اپنے جذبۂ درمیان کے اعتبار سے ایک فرد واحد ہے اور وہ بھی ایسا جس نے چھوٹے چھوٹے قرضوں کو ایک بڑا قرض لے کر ادا کر دیا ہو۔ بھوک لگی نہ ہو اور قضائے حاجت کے لئے اٹھنا نہ پڑے۔ مختصر یہ کہ جس پر بیوی اور اللہ میاں دونوں مہربان ہوں۔

کمرہ سے باہر موسم اپنی تمامتر آشوب ناکیوں کے ساتھ مصروفِ کارزار تھا اور ہم اس عافیت کے ساتھ اپنے کمرہ کے اندر بیٹھے ہوئے تھے گویا اس سے بڑھ کر موسم کی توہین کا کوئی دوسرا طریقہ نہیں تھا۔ اسی زمانہ میں ویسرائے اور سینٹا کلاز اپنے اپنے محافظین اور مقربین کے ساتھ کلکتہ میں رونق افروز ہوتے ہیں اور مہاتما گاندھی اپنی تمام چرخہ زائیوں یا ہندوستانیوں کے ساتھ کہیں اور ہوتے ہیں۔ پھر مسٹر کیریار اور مسٹر پٹیل کے ہوتے جب والسرائے بالقابہ کلکتہ جا سکتے ہیں تو پھر ہم کو بیوی بچوں کی کیا پروا ہو سکتی تھی۔ ایک کرسی پر تکیہ لگائے ہوئے اور ربڑ کے حلقہ پر جس کے اندر ہوا بھری ہوئی تھی اس طور پر بیٹھے تھے گویا

سری گنیش ائیمہ !

اتنے میں یخ سیال کا ایک زبردست جھونکا' سوکھی پتیوں' بجلی کی چمک اور بادل کی گرج کے ساتھ' کواڑ کو زور کا دھکا دیتا ہوا اس تیزی اور تندی کے ساتھ کمرہ میں داخل ہوا گویا ساری چٹخنیاں اور چولیں پاش پاش ہو جائیں گی۔ لیمپ گل' حواس غائب' مرشد نے پکارا ایک نعرۂ حیدری۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا یا حسین !

خلفشار کم ہوا' دیا سلائی جلائی گئی تو دیکھتے ہیں' حاجی بلغ العلیٰ بشکل سینٹا کلاز وارد ہیں بس یوں سمجھ لیجیے کہ ایک داڑھی اور ایک کمل پر حاجی صاحب اس طور پر مسلط ہیں جس طور پر سارے ہندوستان پر یونین جیک۔ جہاں تک حاجی صاحب کے حلیہ کا تعلق ہے بہت کم لوگ اس راز سے آشنا ہوں گے کہ فی الحقیقت داڑھی اور کمل حاجی صاحب پر مسلط نہیں ہوتے' ایسی عام شکلیں تو ماگھ میلہ اور غازی میاں کی درگاہ پر کافی سے زیادہ تعداد میں نظر آئیں گی' بلکہ خود حاجی صاحب کمل اور داڑھی پر مسلط ہوتے ہیں۔ یہی فرق حاجی بلغ العلیٰ صاحب مدفیوضہٗ اور دیگر قسم کے لوگوں میں بہ الامتیاز ہے

حاجی صاحب کا حلیہ (یا چیب؟) ریاضی کے اعتبار سے اس قاعدہ کے تحت میں آئے گا۔

(ک × د) ح

لیکن حاجی صاحب کا تذکرہ آگیا ہے تو متشابہ لگنا بھی بے محل نہیں ہے۔ چنانچہ بعض ماہرین ریاضی کا ابتک خیال رہا ہے کہ جسم کے لئے ابعادِ ثلاثہ یعنی لمبائی چوڑائی اور موٹائی کا پایا جانا لازمی ہے لیکن ریاضی کے بعض جدید الخیال مفکرین کا خیال ہے کہ جسم کے لئے یہ شرائط ناکافی ہیں کیونکہ اگر یہ شرائط سہ گانہ صرف آنی (Instantanious) ہیں تو پھر جسم کہاں اس لئے جسم کے متیقن کرنے کے لئے جہات سہ گانہ (یعنی لمبائی چوڑائی موٹائی) کے ساتھ وقت یا ٹھہراؤ کا پایا جانا بھی لازمی ہے۔

حاجی صاحب ان دنوں قانون مسعودی اور رمضان شریف سے الجھے ہوئے ہیں اس لئے ممکن ہے ریاضی و ہندسہ کے اس دلچسپ نظریہ سے باز پرس نفرمائیں ورنہ بعید نہ تھا اگر کسی وقت جبکہ ہم بالکل غافل اور خالی الذہن ہوں حاجی صاحب بجہات سہ گانہ ہم پر نازل ہو جائیں کیونکہ اس وقت بھی انکی آمد یا تو صرف بجہات سہ گانہ تھی یا صرف بشرط اولیٰ ایا جہت رابع (۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔ متشابہ انتہی)

ہاں تو پھر حاجی صاحب نظر آئے لیکن کوئی شخص یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ گنگنا رہے ہیں' یا فرمائش کرنیوالے ہیں یا لیٹ جانیوالے ہیں۔ لوگوں نے یک زباں ہو کر کہا' آ خاہ حاجی صاحب قبلہ' فرمایا

بالم نیا ڈگا مگ ڈولے

معلوم نہیں نیا ڈول چکی تھی یا نہیں لیکن ریش مبارک پر اب بھی اہتزاز طاری تھا' بولے اور کیوں جی تم میں سے کوئی جانکی بائی سے واقف ہے' قاضی صاحب نے مصلّے پر سے سلام پھیرا'

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مرشد نے کہا، کوئی نہیں، قاضی صاحب، یہ تو حاجی بلغ العلیٰ تشریف لائے ہیں، قاضی صاحب نے ایک ایسے لہجہ میں جس میں خشیت خشونت اور خفت سب ہم آہنگ تھیں، فرمایا،

اعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیأت اعمالنا ......... الخ

حاجی صاحب نے دریافت فرمایا، کس مسئلہ پر غور کر رہے تھے کہ ایک طرف سے آواز آئی۔

بھائیو، اپنی اپنی ٹانگیں اٹھاؤ آسمان گرا پڑتا ہے! سنتے ہیں مرشد ہنکارے 'بم مہادیو، ٹن گنیش!

میں نے پوچھا، ان دونوں میں کوئی فرق بھی ہے فرمایا مسلم لیگ اور مہاسبھا کا۔

اصغر صاحب بولے، نہیں لکھنؤ اور لاہور کا۔

حاجی بلغ العلیٰ نے گردن کو جھٹک کر کہا ہمں، مس میو اور جان بل کا۔

جگر صاحب نے وجد میں آکر کہا۔ ہائے کچھ نہیں، تیرا اور میرا۔

قاضی صاحب نے فرمایا۔ چائے —— پانی کا۔

گھر میں سے بڑی بی ہانپتی کانپتی آئیں، کہا، میاں! بیوی!!

سب نے یکزباں ہو کر تصدیق کی، بالکل ٹھیک میاں، بیوی کا!

حاجی صاحب بولے، ارمان، کوئی مضمون نہیں لکھتے۔ میں نے کہا کیا اور کس پر، کہنے لگے اسی جملہ پر:

اپنی اپنی ٹانگیں اٹھاؤ، آسمان گرا پڑتا ہے

میں نے کہا یہ کیا تھا، کہنے لگے اعلانِ جنگ بھی اور اعترافِ شکست بھی، میں نے کہا کس کا فرمایا گُرگا۔

میں نے کہا اچھا یہی سہی، تو پھر درویشوں کے تجربہ میں جس جس قسم کے گُر آئے ہوں سنائیں۔ حاجی صاحب یکلخت قالین پر سے مسند پر بیٹھ گئے۔ فرمایا بالکل ٹھیک، میں پریسیڈنٹ ہوں۔

---

حاجی صاحب نے مرشد کی طرف داڑھی اور آنکھ کو حرکت دی اور مرشد نے پہلو بدلا،
ناانصافی ہوگی اگر مرشد کا بھی لگے ہاتھوں ناظرین سے تعارف نہ کرادیا جائے۔

حاجی بلغ العلیٰ اگر برق آور دیتے تو مرشد بھی کم و بیش باد آور دیتے، موصوف کے آنے سے پہلے لوگ کچھ سرما زدہ سے ہو رہے تھے کہ اتنے میں کمرہ کا کواڑ کھلا، ور آپ اسطور پر ڈرتے جھجکتے ہوئے داخل ہوئے اور داخل ہوتے ہی سارے مجمع پر چھا گئے جیسے کبھی انگریزوں کی آمد ہندوستان میں ہوئی ہوگی۔

فرمایا: آپ لوگ بھی عجیب ہیں، آج اسٹیشن پر نہ کوئی تانگہ ملا، اور نہ یکہ، سردی اس بلا کی پڑ رہی ہے اور میرے پاس نہ چھتری نہ کمل، میں نے کہا اگر آپ کے یہ اعتراضات بحیثیت ممبر کورٹ ہیں تو خیر سنگ آمد و سخت آمد، ورنہ جہاں تک میرے حافظہ یا ہمت کو دخل ہے ارباب کمیشن نے ہم پر کہیں یہ اعتراض نہیں کیا ہے کہ اسٹاف والے تانگہ نہیں چلاتے یا اُن میں اس کی صلاحیت نہیں ہے۔ یا موسم کو غیر معتدل رکھتے ہیں۔ یا مسکین اور ناداروں کو کمل اور چھتری نہیں تقسیم کرتے۔ طیش میں آکر فرمایا، یہ خوش فکری، گر وہ نباشد کہ میڈیکل کالج کی نذر کر آئے۔ کمیشن کی رپورٹ میں ان باتوں کا صاف صاف تو بیشک کہیں تذکرہ نہیں ہے۔ لیکن ایک مدالیسی ضرور ہے کہ اگر بر روئے کار لائی گئی تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تانگہ چلانے والے کا پوزیشن کافی قابل رشک ہے، اور جاڑے میں بارش کا ہونا اور کمل اور چھتری سے محروم رہنا۔ کیا معنی رکھتا ہے۔

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!

تھوڑی دیر کے لئے میں بھی بھول گیا کہ گر وہ کہاں تھا اور عقل کہاں، میں نے کہا چرخا نباشد، قبل از مرگ واویلا تو کچھ نہ ان کو آپ پر بیڑا ہی کرتے ہونگے۔ کمیشن کی جس مد یا سفارش کا آپ حوالہ یا دھمکی دیتے ہیں۔ وہ رپورٹ میں اتنا واضح نہیں ہے جتنا ہمارے اُردو کے ایک شعر میں ہے جو کورس میں بھی داخل ہے۔

نہ اتنا برّشِ تیغِ جفا پہ ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں بھی

آپ تو چشم بد دور اُس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جو ہمارے آقا ہیں اور ماشاءاللہ غالب سے اتنی الفت رکھتے ہیں کہ دیوانِ غالب کا بہترین پاکٹ ایڈیشن نہایت اہتمام اور انہاک کے ساتھ کاویانی پریس برلن سے شائع کر چکے ہیں، کیا اتنا نہیں کر سکتے کہ صرف اس کا ایک شعر ذہن نشین فرمالیں، بجائے اس کے کہ پورا دیوانِ غالب پاکٹ میں ہو، یہ کہیں بہتر ہے کہ اس کا صرف یہ شعر

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں

پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے!

دماغ میں ہو، اتنا سُننا تھا کہ قاضی صاحب نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اے میاں خاموش، نہ وقت دیکھتے ہو اور نہ آدمی، خطائے بزرگاں گرفتن خطاست،

حاجی بلیغ العلےٰ صاحب نے فرمایا، اجی تم بھی کہاں سے کہاں پہونچ گئے۔ سنا تو ہوگا۔

فضیحت گوش کن قاضی کہ ارماں دوست تر دارند

مریضانِ خلافت فنڈ پسند "پیر" و "مرشد" را

قاضی صاحب نے تیوری بدلکر فرمایا، میاں فاروق، تم بھی لونڈوں میں مل گئے، ذرا وقت کی نزاکت کا تو خیال کیا ہوتا صورت دیکھئے تو سقراط اور حرکات دیکھئے تو طور وارڈ، لاحول ولا قوۃ (لہجہ بدلتے ہوئے) اے میاں رشید ڈاکٹر صاحب کی مخلصانہ نصیحت کو تمنے کچھ اور سمجھ لیا، انکا مطلب بالکل وہ نہ تھا جو تمنے سمجھا، وہ بھلا کب ہم سے باہر ہو سکتے ہیں، اجی ڈاکٹر صاحب ان کو تو معاف ہی کر دیجئے ابھی بیماری سے اُٹھے ہیں۔ آپ سے تو ہم سب آپ کے زمانۂ طالب علمی سے واقف ہیں، آپ کی یونین کی وائس پریسیڈنٹی، آپ کی جادو بیانی اور آپ کی سینیر بریر مانیٹری پر اب تک ہم سب عش عش کرتے ہیں، آپ تو اس ایس ایسٹ ہی میں رہتے تھے، شاید ۲۰ نمبر کے کمرہ میں، رشید صاحب، وہی کمرہ جس میں انس صاحب رہتے تھے، جس کا آج کل میں وارڈن ہوں۔ میں نے کہا جی بس اب رہنے دیجئے، آپ میرے بزرگ ہیں اور اُستاد بھی، اور یہ سبق بھی میں نے آپ ہی سے سیکھا ہے۔ آپ کو وہ مضمون بھی یاد ہے جو آپ نے انھیں بزرگ کے ہمقوم کے آرٹیکل کے جواب میں مدینہ میں شائع کرایا تھا۔ آخر اس کی بنا کیا تھی۔

آپ تو ماشاء اللہ مجھسے زیادہ مُسِن بھی ہیں اور تندرست بھی، پھر اگر مجھے حرارت آگئی تو آپ ڈاکٹر صاحب کے کمالات پر خطبہ کیوں دینے لگیں اور پھر خطبہ کی کیا ضرورت ہے، کیا محض ممبر کورٹ ہونا کافی سے زیادہ نہیں ہے، ایک طرف سے آواز آئی [illegible] حاذق صاحب کی تھی،

درود سے بتواں گفتن سجود سے میتواں کردن!

لیکن اگر حاذق صاحب کو اس سے انکار ہے تو پھر سمجھ لیجئے میرے ہی کان بج رہے تھے۔

قاضی صاحب گلا صاف کر کے کچھ فرمانے والے ہی تھے کہ مرشد نے پکارا،

کھیل ختم پیسہ ہضم!

کوئلے منگائیے، چائے لائیے، بستر مہیا کیجئے، آئینہ کنگھا لائیے، ایک لوٹا گرم پانی، جگر صاحب کچھ ارشاد ہو اقبال وغیرہ کہاں ہیں، آپکا زخم کیسا ہے، گھر میں سلام کہلائیے، سالن زیادہ اور مرچیں کم ہوں، حاذق صاحب کی کچھ معقولات منگائیے، اصغر صاحب اپنے اشعار کی بیاض لائیے، نہ کام کھانسی کی دوا، ذوالفقار صاحب آپ لوگ مسز حمید سے واقف ہیں عظمت صاحب کہئے اجنبی تو نہیں، خالد صاحب آپکا موٹر تو ٹھیک ہے، آج کا اخبار بھی ملسکیگا، ایک لوٹا پانی فوراً آئے غسلخانہ کدھر ہے، اور وہاں اسوقت خط بنوانیکا بھی سامان ہوسکتا ہے؟ ——— سوالات اور فرمائشات کے اس ماگھ میلا میں کس کو یارائے زباں درازی ہوسکتا تھا، چنانچہ مرشد نے غسل خانہ میں تخلیہ کیا اور تھوڑی دیر کے لئے ہر شخص ایک دوسرے کا منہ اسطور پر تکنے لگا گویا ہر ایک، دوسرے کو بیوقوف سمجھتا تھا۔

غسلخانہ سے گنگنانے کی آواز آئی، معاً دروازہ کھلا اور مرشد شاداں و فرحاں برآمد ہوئے۔ انگیٹھی اور چائے موجود تھیں، قاضی صاحب نے فرمایا، کہئے ڈاکٹر صاحب، موسم غیر معمولی طور پر غیر معتدل ہو رہا ہے۔ سفر میں تو غیر معمولی زحمت ہوئی ہوگی۔ فرمایا جناب علی گڑھ اسٹیشن تک تو ٹھکانے ٹھکانے چلا آیا۔ یہاں آکر البتہ معلوم ہوا کہ موسم قطب شمالی کا ہے اور یونیورسٹی مسلمانوں کی ہے۔ نہ ٹانگہ ——— اصغر صاحب بولے دیکھئے ڈاکٹر صاحب یونیورسٹی اور ٹانگہ کا پھر خلط مبحث ہو رہا ہے ——— مرشد نے کہا اصغر صاحب، رشید صاحب کی عصبیت پر نہ جائیے آپ تو شاعر اور بفضلہ اُن چند شعرا میں سے ہیں جو بعض دوسرے شعرا کو اپنے سے بہتر مانتے ہیں یا مان سکتے ہیں، سُنا ہوگا۔

مقصد ہے ناز و غمزہ وے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر۔

رشید صاحب کا کیا وہ تو شروع سے سمجھ چکے ہیں کہ ذاکر حسین خاں، اندوہگنیاں، چہ میگوئیاں، گلچھتیاں، پن چن زائیاں وغیرہ لکھنے پر قادر نہیں ہیں۔ اُن کی تعریف کیجئے تو ہنستے ہیں اور اسطور پر گویا تعریف کرنے والا احمق ہے نہ کیجئے تو مرض کی آڑ پکڑ کر جھلاتے ہیں حالانکہ دونوں حالتوں میں حماقت انھیں کی متیقن ہوتی ہے۔

میں نے کہا اچھا میری حماقت تو متیقن اور اظہر من الشمس ہے اسٹیشن سے یہاں تک آنے میں جناب نے جس ذوق سلیم اور اصابت فکر کا ثبوت دیا ہو اسکا تذکرہ کیجئے۔ کہنے لگے، ٹرین سے اُترا ایک کمل و دو گوش۔ اوّل تو اس قلی سے

سخت ندامت ہوئی جو بے تابانہ میرے کمپارٹمنٹ میں مع اسباب اتارنے کی اُمید و نیت سے داخل ہوا۔ یہاں کیا دھرا تھا۔ کمل جسم پر اور دونوں ہاتھ خالی جیبوں میں، لیکن اس نے جس انداز سے مجھے دیکھا یا گھورا (جلدی میں یا مصلحتاً میں اس کو متیقن نکر سکا) اس سے صاف پتہ لگتا تھا کہ اُس کے نزدیک، میرے پاس اسباب ممکن ہے رہا ہو یا نہو ٹکٹ یقینی نہ تھا۔ یا پھر جس بدحواسی سے میں ڈبہ سے باہر آیا اُس سے تو قلی کو ضرور یقین ہوگیا ہوگا کہ ممکن ہے ٹکٹ ہو، لیکن اس درجہ کا کبھی نہوگا جس میں سے میں برآمد ہوا۔ میں کسیقدر خجالت و خشونت کے ساتھ پھاٹک کی طرف روانہ ہوا۔ واپسی ٹکٹ تھا۔ مسافروں کا ہجوم، میں نے سوچا پھاٹک پر ٹھہر کر ٹکٹ بابو کو، اپنے آپ کو اور سارے مسافروں کو زحمت دینے کے بجائے خود ہی ٹکٹ کو کیوں نہ دو حصوں میں تقسیم کردوں، آمد کا دیدونگا، واپسی کا رکھ لونگا، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، لیکن اس وقت غسلخانہ میں دوسرا ٹکڑا گرا پڑا تھا اٹھا کر دیکھتا ہوں تو معلوم ہوا کہ آمد کا اپنے پاس ہے اور واپسی کا ٹکٹ بابو کے پاس!

حاضرین نے مختلف جذبہ کے ساتھ اس واقعہ کو سُنا،

اے ماشاءاللہ، لاحول ولاقوۃ، چہ چہ چہ، قہ قہ قہ، ہی ہی ہی، کسی نے کہا جلیل صاحب کو اطلاع دیجائے، کسی نے خلافت کمیٹی سے رجوع کرنیکی رائے دی، کسی نے پولس کو اطلاع کرنے پر زور دیا، جگر صاحب نے کہا ابھی کوئی دوڑ جائے تو مل سکتا ہے، مرشد نے کہا یہ کچھ علیگڑھ کے سفرہی کا کرشمہ ہے اب تک تو یہ ہوتا تھا کہ واپسی کا ٹکٹ یا ویک اینڈ ٹکٹ لیکر آتا تھا اور جب یہاں سے گلو خلاصی ہوئی تھی تو معلوم ہوتا تھا میعاد گذر چکی ہے۔ پہلے تو خیر دو سرونکی جان کو دعا دیتا تھا آج تو کیا کہوں، از ماست کہ بر ماست کا مضمون ہے حاذق صاحب نے بھی جگر صاحب کی تحریک کی تائید کی، میں نے ایک پوائنٹ آرڈر پیش کیا کہ اسوقت کمرہ سے باہر جانے کیلئے کون صاحب آمادہ ہیں ——

قاضی صاحب نے جلدی سے فرمایا، اجی جانے بھی دو جان کا صدقہ مال، قدمِ درویشاں ردِّ بلا ——

خانصاحب بول اُٹھے، کیوں نہو قاضی صاحب، باہر جانے ہی کا عذر نہیں بلکہ طعام و قیام کا بھی بندوبست کرلیا!

مرشد نے کہا جانیکو تو میں تیار ہوں، لیکن، .........، لوگوں نے کہا نہیں نہیں ڈاکٹر صاحب آپ کیوں زحمت فرمائیں، اس تکلیف سے تو آپ کا آنا ہوا، پھر صحت بھی نادرست ہے۔ مرشد نے فرمایا، نہیں یہ سب کچھ نہیں، میں نہایت آسانی کے ساتھ جا سکتا ہوں.......... لیکن،

لوگوں نے کہا، نہیں نہیں، جناب کوئی بات بھی ہو، آپ بالکل خستہ ہو رہے ہیں۔

مرشد نے چمک کر کہا، آپ صاحبان کو میرے ضعف یا پست ہمتی کا صرف مغالطہ ہے، آپ فرمائیں تو میں اسی وقت وائس چانسلر کے ہاں تک چلا جاؤں، سارے مجمع میں اک ہیجان پیدا ہو گیا اور ہر ایک لپک کر مرشد کے پاس آ گیا، ڈاکٹر صاحب، ہرگز نہیں ہرگز نہیں، ایسا نہ کیجئے گا، کچھ ہو جائے اسوقت ہم آپ کو وائس چانسلر کے پاس کبھی نہ جانے دینگے، قاضی صاحب بولے کیوں میاں رشید کہتا نہ تھا کہ مذاق کا وقت نہیں رہا، دیکھا بات کہاں سے کہاں پہونچ گئی۔ ٹھیک کہا ہے کسی نے۔

کہ بر من آنچہ کرد آں آشنا کرد

حاجی بلغ العلےٰ صاحب بھی کھلبلائے، فرمایا، قاضی صاحب یہ سارا فتنہ رشید ہی کا جگایا ہوا ہے اور یہ نہیں دیکھتے کس اطمینان اور بلاغت ادا کا اظہار فرما رہے ہیں، آپ کو وہ شعر نہیں تو مصرعہ تو یاد ہی ہوگا۔

کیسا میٹھا ہے کبو تر مرا اُلّو بنکر

میں نے کہا، مانا یہ سب میرا ہی کرا دھرا ہے لیکن بات کیا ہوئی مرشد کا نہ پورا جملہ ختم ہونے دیتے ہیں اور نہ پورا ما فی الضمیر پھر معلوم کیسے ہو کہ کیا ہو رہا ہے یا ہونیوالا ہے۔ لوگوں نے کہا تم ہی سوال جواب کر لو، ذرا میدان میں تو اترآؤ، میں نے کہا ذرا میدان ہی میرے سامنے کر دیجئے۔ لوگوں نے چائے کی سینی کھینچی تو معلوم ہوا کہ مرشد بھی اسی کے ساتھ اسی رفتار کے ساتھ قریب تر ہو رہے ہیں۔ اب میدان اور مرد میدان دونوں مریض کے مقابل تھے، میں نے کہا مرشد، میں دیکھتا ہوں سینی اور سینی کے ظ   ، برابر خالی ہوتے چلے جا رہے ہیں اور آپ ہیں کہ اُس مولوی کے بھی تیور کو شرما رہے ہیں جس نے جمعہ کے دن خط بنوایا ہوا اور سنیچر کے دن بچوں کی روح قبض کرنے آیا ہو۔ کہنے لگے بھئی میں کیا کروں یہ لوگ تو خدا جانے کیا سمجھے رہتے ہیں۔ میں نے کہا تو پھر آپ آخر صاف صاف کیوں نہیں کہتے، بات کیا ہے؟ کسیقدر جھنجھلا کر، فرمایا، مجھے آپ نے سمجھ کیا رکھا ہے، کیا میں خود اسٹیشن تک نہیں جا سکتا، اور کیا معلوم چائے پیکر میں چلا جا سکتا ہوں۔ لیکن!

لوگوں نے پھر کچھ پہلو بدلنا چاہا لیکن میں نے کسی قدر ترشرو ہو کر کہا، حضرات اس "لیکن" کو تو ذرا صاف ہو لینے دیجئے، سارا فتنہ اسی "لیکن" نے برپا کر رکھا ہے۔ ہاں مرشد لیکن؟ گرج کر جواب دیا لیکن لیکن لیکن کیا...... وہ "قلی"!!

مجمع سے پھر کچھ صدائیں بلند ہوئیں، "یہ نہ کہئے!" "کیوں نہ ہو!" "ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"۔ ایک طرف

سے آواز آئی '' اچھا تو آپ غریب اسٹاف والوں ہی پر شیر ہیں'' میں نے کہا مرشد یہ تو بڑی کرکری ہوئی۔ نان کوآپریشن
کے زمانہ میں آپ نہ پولیس سے ڈرے نہ جیلخانہ سے، ایک زمانہ میں آپ ہیضہ اور پلیگ سے بھی نہیں ڈرتے تھے، بیوی کو تو
آپ کبھی خاطر ہی میں نہ لائے، بیوی کا نام سُننا تھا کہ چونکے، فرمایا 'بھئی ایک بات کرسکتے ہیں' میں نے کہا وہ کیا، کہنے لگے
کل صبح بیوی بچے وطن جاتے ہوئے علیگڑھ سے گذریں گے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی کھانسی زکام کی دوا نہایت مفید اور
سریع الاثر ہے' میں نے کہا یہ کیا؟ گھڑک کر فرمایا 'ذرا صبر تو کیجئے'، بات ختم نہیں ہوئی اور بیچ میں کود پڑے آخر یہ کہاں کی
تہذیب ہے' میں نے کہا اچھا اچھا معاف فرمایئے آپ کے دو جملوں کے درمیان کوئی لفظ یا لہجہ یا انداز ایسا نہیں پایا
جاتا جس سے دونوں میں کوئی ربط یا نسبت ظاہر ہوتی ہو، اس لئے مجھے لامحالہ جملہ معترضہ بننا پڑتا ہے، فرمایا 'دیکھتے
ہیں موسم کتنا خراب اور خطرناک ہو رہا ہے، بیوی بچوں میں سے کسی ایک کو یا سب کو راستہ میں نمونیا ہوگا' ایک بوتل
اسی دوا کی اسٹیشن بھیج دیتے، سب پیتے ہوئے گھر پہونچ جائینگے' میں نے کہا اتنے عاقبت اندیش تو آپ پہلے نہ تھے،
کہنے لگے یورپ سے آنے کے بعد کچھ ایسی ہی طبیعت ہوگئی ہے' میں نے کہا مُرشد یہ تو کچھ پروپگنڈا معلوم ہوتا ہے۔
یورپ سے واپس آکر لوگ سب سے پہلے ہندوستانی والدین اور ہندوستانی بیوی ہی پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔
کہنے لگے بھائی اپنا اپنا تجربہ میرے لئے تو یورپ جاکر ہندوستانی بیویوں کی قدر بڑھ گئی۔ میں نے کہا مرشد یورپ جاکر
آپ نے عورتوں کے بارے میں کیا رائے قائم کی، حاذق صاحب بھی دُلائی اور حُقّہ کے ساتھ مرشد کے قریب آگئے اور
ہمہ تن اشتیاق نظر آنے لگے، اور سارا مجمع اسطور پر ہمہ تن گوش ہوگیا گویا ہم سے لیکر حاجی بلغ العلیٰ تک تمام لوگ اسی
مسئلہ کی تشریح کے بعد عازم یورپ ہونگے۔ ہر طرف سے سوالات کی یورش ہوئی، کسی نے کہا کیوں ذاکر صاحب وہاں
اسلامی طریقہ نکاح بھی جاری ہے' ایک بزرگ نے فرمایا 'کیوں صاحب سُنا ہے وہاں سے بیوی لائے تو ہندوستان
میں کلکٹر صاحب ناراض ہوجاتے ہیں' ایک دوسرے حضرت بولے اور کیوں ذاکر صاحب کیا یورپین بیوی پر خرچ زیادہ
بیٹھتا ہے' ایک طرف سے آواز آئی کیوں صاحب اگر کوئی انگریزی نہ جانتا ہو تو اس کی بھی شادی ہوسکتی ہے۔ ایک صاحب
نے خفیف سی سرد آہ کھینچکر دریافت کیا کیوں جناب ذاکر صاحب، وہاں شادی کے لئے عمر کی تو قید نہیں ہے۔ ایک
صاحب ذرا زیادہ محتاط طبیعت بولے اور کیوں ذاکر صاحب اس قسم کی تحریک وہاں کیسے کی جاسکتی ہے۔ فرض کیجئے
کوئی شخص آپ کا خط لیکر جائے' مرشد گھبرا کر کوئی غیر ذمہ دارانہ فقرہ یا غیر شاعرانہ حرکت کرنے والے ہی تھے کہ مولانا ابوبکر

صاحب تشریف لائے، سب لوگ کھڑے ہو گئے۔ مصافحہ اور مزاج پرسی میں بیت الغزل سے لوگ محروم رہ گئے۔

کچھ دیر کے بعد مولانا واپس تشریف لے گئے، حلقہ مریدان پھر سے قائم ہوا، مرشد نے فرمایا، اسٹیشن سے باہر آیا تو نہ یکہ نہ پولیس، نہ کوئی بھکاری اور نہ کوئی خوانچہ والا، ایک طرف صرف ایک یکہ پر دو بزرگ مراقبے میں تھے اور یہ مشکل سے پتہ لگایا جا سکتا تھا کہ ان میں سواری کون ہے اور یکہ بان کون، گھوڑے اور یکہ کی حالت بھی کچھ ایسی ہی غیر یقینی تھی۔ فی الفور اس کا تصفیہ کرنا ناممکن تھا کہ یکہ کو گھوڑا کھینچیگا یا گھوڑے کو یکہ۔ چنانچہ اس صورتِ حال سے فائدہ نہ اٹھانا صریح حماقت تھی۔ بغیر کسی مزید غور و فکر کے میں بھی یکہ پر جا کر اسطور پر بیٹھ گیا گویا ایک نامعلوم مدت تک کہیں جانے کا قصد نہیں تھا۔ اس دوران میں ایک موٹر زناٹے اور سنّاٹے کے ساتھ نکلی، جس میں تین چار حوا کی بیٹیاں اور کچھ ازپسران نوح اسطور پر بیٹھے ہوئے تھے گویا عورتیں ان کو بھگائے لئے جا رہی تھیں اور چونکہ تعلیم یافتہ تھے اسلئے اس اندیشہ سے ملول معلوم ہوتے تھے کہ تعزیراتِ ہند میں عورتوں کو بھاگنے یا بھگا لیجانے پر بازپرس کی جا سکتی تھی۔ اور جب صورتِ حال یہ ہو کہ کسی تعلیم یافتہ اور روشن خیال مرد کو تعلیم یافتہ تر اور روشن خیال تر عورتیں لے بھاگیں یا بھگا لیجائیں تو اس بیسویں صدی اور انگریزی حکومت میں کوئی کیا کر سکتا ہے۔

اس درمیان میں دو بندروں میں جو درخت کے اوپر تھے کسی نازک مسئلہ پر اختلاف آرا ہوا۔ ایک کے سینہ سے کوئی ولیعہد چمٹے ہوئے تھے اور چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ دوسرے بزرگ کا چہرہ سنجیدہ لیکن بیک گراؤنڈ کے بارے میں غالب کا خیال تھا۔

مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلود یاد آیا — کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

بہرحال چیخ اور شور کا وہ عالم تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے رعد و برق بھی ماند پڑ گئے اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہی شفق آلود بزرگ ہمارے یکہ کے قریب آ گئے اور اس رکھ رکھاؤ لیکن ملتجی نگاہوں سے ہماری طرف دیکھنے لگے کہ ایسا منظر بڑے بڑے ڈرائنگ روم میں بھی بمشکل نظر آ سکتا تھا۔ موٹر اور بندر کے خلفشار نے ہماری آمد و ورود سے مل جلکر ہمارے دوستوں کو پیامِ بیداری دیا۔ اتفاق سے میں جن کا ہدوش ہوا وہ مسافر نکلے۔ فرمایا کدھر کا قصد ہے میں نے کہا اتنا جلد تو کہیں کا ارادہ نہ تھا لیکن اگر آپ کی رائے یہی ہے تو بسم اللہ، کہنے لگے آخر کہاں جایئے گا (ایک بھائی کے ساتھ جو آدھے ہی راستہ پر لوٹ گئی) میں نے کہا جہاں اور جدھر یکہ لیجائے۔ اتنے میں یکہ بان بھی چونکا گھوڑے

نے بھی اپنے غیر تکیہ ہونیکا ثبوت دیا اور وہ بھی اس طور پر کہ حفظانِ صحت کی ساری تدابیر اور اصول تھوڑی دیر کے لئے معرضِ خطر میں پڑ گئے۔

یکّہ والے نے کہا میں تو شہر جاؤنگا۔ میں نے کہا میں بھی وہیں چلونگا میرے جیوٹ اور سکونِ خاطر کو یکّہ والے نے مشتبہ نگاہ سے دیکھا۔ اور کچھ ایسی حرکات کرنے لگا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ مجھ میں بعض جراثیم قابلِ دست اندازی پولیس پائے جاتے تھے۔ اس ناروا سلوک کا اثر میرے بزرگ ہم یکہ پر پڑا بلکلت چونک پڑے اور کڑک کر فرمایا 'مردود انکی شان میں یہ گستاخی' آنکھیں پھوٹ گئی ہیں' دیکھتا نہیں خلافت کمیٹی بیٹھے ہوئے ہیں۔ یکّہ والے نے بڑے میاں کی اِس پُرجوش لیکن بے سروپا خطابت کو کچھ زیادہ اہمیت نہ دی اور ایک ایسے لب و لہجہ اور انداز سے جس میں حقارت و حسرت دونوں شامل تھیں' بولا میاں میں تو تمہارے خیال سے سوچ میں پڑ گیا تھا جب تم کو اس ضعیفی میں اپنی جان' مال' یا آبرو کا خیال نہیں ہے تو میرا کیا۔ چلو' سردی پانی سے نہ مرے' یونہی مرے! میں نے رفعِ شر کے خیال سے چند آنے پیسے یکہ والے کو نذر کئے اور کہنے لگا بھائی چل اور جلدی چل' علی گڑھ کا خدا ہی مالک ہے جہاں کے یکہ والے بھی کسی ہستی سے ڈر سکتے ہیں۔ بڑے میاں بولے' مولوی صاحب یہاں کے یکہ بان نہیں پیش امام ذات شریف ہیں' میرے ہی محلہ کے پیش کو لے لیجئے' پیش امام کاہے کو ہے پورا تھانیدار ہے' سوا نماز پڑھنے اور اذان دینے کے دنیا بھر کا کام کرتا ہے' نکاح پڑھ نہیں آتا' اس کی کمی خود نکاح کرکے پوری کرتا ہے۔ معلوم نہیں کتنی بیویاں اور لڑکے لڑکیاں ہیں جنکی وجہ سے گھروں پر روٹیاں نہیں بچتیں اور مسجدیں نمازیوں کے جوتے۔ کیوں مولوی صاحب گھروں میں روٹیاں اور مسجد میں نمازی نہ ہوں تب سوراج ملسکتا ہے' میں نے کہا' جناب والا' سوراج ملسکے یا نہیں یونیورسٹی ضرور ملجائیگی۔ بہرحال ہمارے دوست انتہائی جوش اور انہماک کے ساتھ لیکن رازدارانہ انداز سے گفتگو کرتے رہے۔ یکہ چلتا رہا۔ (معہ تمام سامان اور اشخاص ضروریہ وغیر ضروریہ کے) ایسا ہی جیسا کہ مسلمانوں کی انجمنیں یا تعلیم گاہیں چلتی رہتی ہیں۔ یا جس طور پر عشاق کا بیان ہے کہ اکثر ان کے گلے پر خنجر پھرا کرتا ہے۔

شہر آ گیا۔ اور ایک مقام پر ہمارے بزرگ نے یکہ کو رکوا دیا اور گلی میں ہو لئے' یکّہ والے نے دریافت کیا' اور میاں آپ کدھر جائینگے۔ میں نے کہا کالج۔ کہنے لگے تو اسٹیشن ہی پر کیوں نہ کہدیا۔ میں نے کہا تمہارا کیا بگڑا' تمکو یہاں تک کے پیسے دیدئے۔ رہا کالج جانا اُسکے پیسے یہ لو۔ یکہ والے نے کہا میں تو کالج نہیں جاؤنگا آج بھر کی روٹی کمائی

سردی پانی میں جانور کو تکلیف ہوگی، گھر میں چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اُن کی خبر لوں گا' میں نے کہا تو پھر میں بھی تمہارے گھر چلونگا اس نے کہا آپ جاکر کیا کریں گے۔ میں نے کہا تم جاکر کیا کروگے' کہنے لگا' میں تو بچوں کی خبر لونگا' گھوڑے کو دانہ گھاس دونگا اور پھر آرام کرونگا۔ میں نے کہا میرا بھی یہی ارادہ ہے۔ بڈھے نے سمجھا کہ قصہ طوالت بھی پکڑیگا اور دلچسپ بھی ہے اس نے نہایت اطمینان سے اپنے میلے بوسیدہ لباس کے معلوم نہیں کس گوشہ سے ایک بیڑی نکالی اور سلگا کر پینے لگا' پھر کہا میاں آپ کو مجھ سے مطلب کیا؟ میں نے کہا میں اپنا مطلب کیوں بتاؤں۔ اس نے کہا' تو پھر آپ میرے گھر کیوں جائے' میں نے کہا اور کیوں نہ جاؤں۔ اس نے ایک دفعہ پھر مجھے نیچے سے اوپر تک دیکھا' اور مجھکو کچھ ایسا معلوم ہوا کہ آج کئی دن بعد اس نے اپنی آنکھوں کو پوری وسعت کے ساتھ کشادہ کیا تھا' جس کو بیڑی کے دھوئیں نے پھر چھپا دیا کہنے لگا تو پھر بیٹھ جاؤ۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم سب تاریک نمناک اور غلیظ گلی میں پہونچے۔ اس کے آگے ایک چھوٹا سا احاطہ تھا' جس میں کثرت سے ہر قسم کے درخت کھڑے تھے' کہیں کہیں سے دھواں اُٹھ رہا تھا جس کی وجہ سے موسم کی تاریکی اور ناخوشگواری اور زیادہ بڑھ گئی تھی' درختوں کے اوپر بندر اور کوّے درختوں کے نیچے مرغیاں اور بچے شور مچا رہے تھے۔ درختوں کی پتیوں سے چھن چھن کر بارش کے قطرے گر رہے تھے جن کی آواز اس شور اور ہنگامہ سے ملکر ایک طرح کا عجیب سماں پیدا کرتی تھی جس کا صرف تصور کیا جا سکتا ہے' اور شاید مُشکل۔

گھوڑا کھولدیا گیا' جو خود بخود آہستہ آہستہ کسیقدر لنگڑاتا ہوا ایک بوسیدہ سی جھونپڑی کی طرف چلا' لیکن اسکے ضعف اور آہستہ خرامی سے پایا جاتا تھا کہ اسے اپنے ناکارہ یا ضعیف ہونے کا غم نہ تھا بلکہ دن بھر کا کام اپنے مالک کی مرضی کے مطابق انجام دینے پر ایک گونہ اطمینانی کیفیت طاری ہے۔ کوٹھری میں سے دو چھوٹی چھوٹی بچیاں یکلخت کلکاریاں لگاتی' نیم برہنہ' بے سد لاغر' گھوڑے کی طرف دوڑیں' ایک نے گھوڑے کے گلے میں بانہیں ڈالکر جھولنا شروع کیا' دوسری نے پیچھے سے دُم پکڑ کر کھینچنا شروع کر دیا۔ گھوڑا بھی کھڑا ہو گیا اور اس خاموشی اور انداز استغنا کے ساتھ گویا بچیوں کی اس لطف و تفریح میں شریک ہونا بھی اسکے فرائض میں تھا وہ فرائض جنکی انجام یابی بجائے خود ایک انعام ہوتی ہے۔ یکہ درخت کے نیچے سر بسجود کر دیا گیا' یکہ والا مجھے جھونپڑی میں لے گیا' ایک طرف کچھ گھاس پھیلی ہوئی تھی۔ اسپر ایک میلی سی بالکل پھٹی پرانی توشک سی ڈالدی گئی۔ میاں بیٹھ جاؤ' میں ذرا گھوڑے کو ٹھکانے لگا لوں۔ کھونٹی پر سے توبڑا اٹھایا' کچھ گھاس سمیٹی' ایک درخت کے نیچے چھپر تھا' گھوڑا وہاں پہونچکر رک گیا تھا' یکہ والے نے گھوڑے کے سامنے گھاس

ڈالدی اور تو بڑا اجڑھا دیا۔ بچیاں گھوڑے کو چھوڑ کر یکہ بان سے لپٹ گئیں۔ کبھی تو بڑے میں سے مٹھی بھر کر چنے نکال لیتیں، اس کو کھاتی جاتیں اور گھوڑے کے سامنے والی گھاس پر لوٹ جاتیں۔

گھوڑے کی خدمت سے فراغت پاکر یکہ بچیوں سمیت جھونپڑی میں آیا، مجھکو دیکھکر بچیاں یلکخت چونک پڑیں۔ یکہ والے نے کہا۔ ڈرو نہیں ہمارے مہمان ہیں، ان میں سے جو بڑی تھی سہم کر کہنے لگی، ابا کیا تم پھر یکہ لیکر جاؤ گے۔ میں نے فوراً جواب دیا نہیں۔ اب یہ رات بھر تمہارے ہی ساتھ رہینگے۔ یکّہ بان نے یکّہ پر سے بچھونا اتار کر گھاس پر ڈالدیا۔ بچیاں اسپر بیٹھ گئیں، میں نے پوچھا اور کیوں میاں تمہارا نام کیا ہے؟ اُس نے کہا عیدو۔ میں نے کہا کیوں عیدو ان بچیوں کی ماں کہاں ہے؟ عیدو اس سوال کو ٹال گیا، اور اس طور پر گویا رہا۔ بچیوں کے سامنے اس کا تذکرہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کہنے لگا۔ میاں ذرا دیر ہوگی، سالن دن کا رکھا ہوا ہے، بس روٹیاں ڈالنی ہیں۔ میں نے کہا نہیں اس کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ایک نوٹ دیا اور کہا یہ لو بازار جاکر کھانا لاؤ۔ عمدہ عمدہ کھانے، کچھ پھل اور مٹھائیاں۔ عیدو نے کہا میاں یہ نہیں ہو سکتا، اسوقت تو آپ کو ہمارے روکھے پھیکے ہی پر بسر کرنا ہوگا۔ میں نے کہا۔ اچھا میں تمہارا کھانا کھاؤنگا لیکن تمکو میرا کھانا کھانا پڑے گا۔ تم فوراً جاکر سب چیزیں لاؤ۔ اس درمیان میں تمہاری بچیوں کے ساتھ بات کرونگا۔ عیدو کچھ سوچتا ہوا بازار چلا گیا۔ میں نے لڑکیوں سے بات کرنا شروع کیا، میں نے تم کیا کھیلتی ہو۔ بڑی نے کہا میرے پاس گڑیاں ہیں، میں نے کہا مجھے لاکر دکھاؤ، دونوں بچیاں جھپٹ کر ایک ہانڈی اٹھا لائیں، ہانڈی کے اندر گھاس بھری ہوئی تھی، گھاس کے اوپر ایک صاف سا کپڑا اچھا ہوا تھا، اس پر دو گڑیاں رکھی ہوئی تھیں، گڑیوں کے اوپر بطور چادر ایک ٹکڑا گرم اونی کپڑے کا تھا۔ بڑی لڑکی نے گڑیوں کو اس احتیاط اور احترام کے ساتھ باہر نکالا، جس طور پر شاید رولس رائس [illegible] کے اندر سے کوئی ڈیوک اپنی بیگم کو بھی نہ نکال سکتا یا کوئی ماں اپنے سوتے ہوئے مریض بچے کو نالچہ پر سے اٹھاتی ہوگی، دونوں بچیوں کے چہرہ پر احتیاط، محبت، اور تشویش کی ایک جھلک تھی جب تک کہ گڑیاں پورے طور پر ہانڈی سے نہ نکالی گئیں۔ میں نے گڑیوں کو اسی احترام و عقیدت کے ساتھ لے کر اپنے دامن میں رکھ لیا۔ بچیوں کی تشویش مسرت سے بدل گئی۔ اس میں شک نہیں یہ گڑیاں صرف ایک ماں ہی کے ساتھ کی بنائی ہوئی ہو سکتی تھیں۔ ماں کا وہ ہاتھ جو اپنی زندہ گڑیوں کو دنیا کی تمام پوشیدہ اور آشکار آفات سے محفوظ رکھنے پر آمادہ رہتا ہے۔ اضطراری اور غیر اضطراری دونوں طرق

پر۔ ان بچوں کی ماں کو بہتر سے بہتر کپڑا جو عیدو کے گھر میں میسر آسکا ہوگا ان گڑیوں پر صرف کئے گئے تھے کہیں کہیں گوٹے پٹھے کے ایک آدھ تار بھی نظر آجاتے تھے۔ ناک میں ایک چھوٹی سی نتھ تھی۔ اور دونوں کانوں میں بالیاں، ہر چیز پر امتدادِ زمانہ کا اثر تھا، لیکن باوجود اس کثافت اور خستگی کے جو گڑیوں پر مسلط تھی ایک چیز سب سے زیادہ نمایاں تھی اور وہ ماں کی محبت و شیفتگی تھی جو ان گڑیوں کے تار و پود میں سرایت کئے ہوئے تھی۔ ان گڑیوں کو دیکھکر ماں اور بچیاں دونوں نظر کے سامنے آجاتی تھیں، ہندوستان کی نیک، مفلوک الحال، شریف اور صابر و شاکر ماں بیویوں کا یہ ایک حزیں نمونہ تھا۔ یہ لفتنہ تھا ایک جاں نثار غریب بیوی کا، اور یہی نہیں بلکہ اس کے فلاکت زدہ پارہ ہائے جگر یعنی ان بچیوں کا جنکے لئے یہ بنائی گئی تھیں۔ میں نے پوچھا "ان کی شادی کب ہوگی" چھوٹی بولی۔ ابا نے اس کا دولہا نمائش میں سے لانے کو کہا ہے۔ میں نے کہا یہ کھائی کیا ہیں؟ بڑی بے اختیار ہنس پڑی، گویا یہ سوال انتہائی ناواقفیت اور معصومیت کا تھا، اور یہی نہیں بلکہ ان کے ہنسنے ہی کے لئے کیا بھی گیا تھا لیکن چھوٹی پر اس کا اثر نہیں ہوا، اس نے سنجیدگی سے جواب دیا، اس کی شادی ہو جائیگی، تب کھائیگی، میں نے کہا تمہارے پاس اور کھلونے بھی ہیں۔ انھوں نے کہا ہم اسی کو کھیلتے ہیں۔ میں نے کہا یہ گھوڑا جو یکہ میں چلتا ہے کس کا کھلونا ہے؟ دونوں کچھ حیرت زدہ ہوئیں اور پھر بڑی لڑکی نے مسکرا کر اور اس انداز سے گویا اس نے پہیلی بوجھ لی تھی، کہا، کھلونا، ارے وہ تو گھوڑا ہے۔ لیکن چھوٹی کو اطمینان نہیں ہوا، اس نے کہا تم ہی بتاؤ یہ کس کا کھلونا ہے۔ کھلونا ہوتا تو ہانڈی میں بند ہوتا۔ اتنا بڑا کھلونا کس کا ہوتا ہے، میں نے کہا یہ گھوڑا تو کھلونا ہے دونوں نے بے اختیار ہو کر پوچھا، کس کا، میں نے کہا تم ہی بتاؤ، دونوں کچھ دیر تک سوچتی رہیں، اور جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا، تو فرطِ اشتیاق سے دونوں نے آکر میرا ہاتھ پکڑ لیا، ایک نے شانہ پر ہاتھ رکھا اور خوشامدانہ انداز سے جس میں والہانہ اشتیاق پورے طور پر جھلک رہا تھا، یہی نہیں بلکہ اس انداز سے گویا میری ہمت افزائی بھی مقصود ہے، پوچھا، اچھے سچ بتاؤ کس کا کھلونا ہے، میں نے کہا، اللہ میاں کا، دونوں سہم سی گئیں، کہنے لگیں، اللہ میاں اتنا بڑا کھلونا کھیلتے ہیں، اللہ میاں کتنے بڑے ہیں ابا کے برابر؟ میں نے کہا ان سے بھی بڑے۔

اتنے میں عیدو لدا پھندا آگیا، کھانے پینے کے ہنگامہ میں اللہ میاں کی وسعت و ضخامت آئی گئی ہوئی، بچیاں کھا پی کر سو گئیں، میں نے کہا عیدو اب میرے لئے ایک یکہ لاؤ، عیدو یکہ لانے گیا، میں نے جلدی سے اپنا کمل

بچیوں پر ڈالا۔ اور آپ کے پاس چلا آیا ——— سب لوگ دم بخود تھے۔

باہر بارش اور ہوا ابھی شاید تھم گئی تھی!

مڑ کے دیکھتے ہیں تو حاجی بلغ العلےٰ غائب ہیں، پھر جب صدر موجود نہوں تو اصل موضوع پر کیسے بحث ہو سکتی تھی چنانچہ گُر کی داستان شروع نہ کیجا سکی۔ بعض حضرات نے اعتراض کیا کہ مضمون میں تو گُر کا کہیں پتہ نہیں ہے دیکھا تو واقعی نہ تھا۔ حاجی صاحب سے رجوع کیا گیا تو فرمایا۔ سب کے سب اندھے ہیں، دیکھتے نہیں شروع ہی میں کتنا جلی گُر موجود ہے۔ ایک طرف سے آواز آئی سُنی بھی!!

(باقی کچھ نہیں)

# ایک طائر کو آئینہ پر محوِ حیرت دیکھکر

(از محمد ظفر احمد صاحب صدیقی متعلم انٹر کالج)

کیوں ہے تو اے طائرِ معصوم محوِ اضطرار
پھر رہا ہے آئینہ کے گرد ہو کر بیقرار

دیکھ کر تو عکس اپنا کس لئے بیتاب ہے
کیوں تری ہستی میں جوشِ فطرتِ سیماب ہے

آئینہ کو تو سمجھتا ہے مگر کنجِ قفس
ہے گماں تجھکو اسیر اس میں ہے کوئی ہم نفس

جذبۂ ہمدردیٔ ہم جنس لایا ہے تجھے
یا پسند اپنا ہی حسنِ دلکش آیا ہے تجھے

اپنی صورت پر اگر شیدا ہے تو دیوانہ ہے
دل ترا سرِّ حقیقت سے ابھی بیگانہ ہے

خود نما یا محوِ اندازِ خود آرائی کہوں
سخت حیران ہوں تجھے کس کا تماشائی کہوں

اے گرفتارِ طلسمِ صد فریبِ آرزو
اے اسیرِ حلقہائے دامِ موجِ رنگ و بو

اپنے عکسِ جلوۂ رنگیں پہ ہے حیرت تجھے
دے رہی ہے کسقدر دھوکہ تری صورت تجھے

ہے گرفتارِ فریبِ حسنِ روئے یار تو
آئینہ میں تجھکو ہے شاید اسی کی جستجو

دل ترا سرشارِ کیفِ بادۂ دیدار ہے
اپنی ہی صورت پہ تجھکو خود گمانِ یار ہے

کچھ وفورِ شوق میں تجھکو نظر آتا نہیں
دوست میں اور آپ میں کچھ فرق تو پاتا نہیں

یہ فریبِ حسن ہے یا انتہائے عشق ہے
جوشِ کیفِ نغمۂ رنگیں نوائے عشق ہے

---

آئینہ خانہ میں دنیا کے یہی ہے میرا حال
میں بھی ہوں تیری طرح محوِ تماشائے جمال

میں بھی ہوں بیخود بقدرِ وسعتِ ذوقِ نیاز
اُٹھ گیا ہے اپنے بیگانہ کا دل سے امتیاز

دیکھتا سب کچھ ہوں محسوس نظر کچھ بھی نہیں
جلوہ فرما کون ہے مجھکو خبر کچھ بھی نہیں

ہے مرا ہی عکسِ رخ یا صورتِ زیبائے یار
عالمِ امکاں میں ہے یہ کسکے جلووں کی بہار

present system. New hospitals and sanitoriums have been established and the people are taught to take care of their health and live cleanly. Fine arts are encouraged and the Government has opened, since the Revolution, a large number of museums and art galleries. Realising that the stability of the present system depends on a continued alliance between workers and peasants large sums of money are spent on improvement of agriculture—including better seeds, better stocks and the introduction of modern agricultural machinery. Permanent agricultural exhibitions have been opened in almost every Volost (group of villages): when the peasants visit important centres they are provided special accommodation at a nominal cost in what are known as "Peasants' Homes" where they are induced to give up old agricultural methods in favour of the new. The declared aim of the Government is to substitute collective for individual farming but not much success has attended its efforts so far. It is this policy which, for obvious reasons, has failed to secure the approval of the Kulakas (by which name well-to-do peasants are known in Russia). Care is also taken to advertise broadcast all that the Government has done, is doing or proposes to do for the good of the rural population. The Government has laid down a programme of industrial and agricultural development for the next five years and is giving the greatest publicity to it. It is prepared to be judged by the record of its achievement during the last ten years; but in addition to this it knows the art of exalting itself by its profession.

### English Manners.

Mary Borden, the Anglo-American novelist, writing, in the Harper's Magazine on "Manners,' says:

In England people care less about good manners than good form. The English people are in general too intensive and too lacking in curiosity to have really good manners; for the lack of curiosity means lack of sympathy and a wide indifference to what others feel or think. Being very modest people or, what is the same thing, excessively proud but not vain, and with an intence positive dislike for showing off, their manners on the whole are better than one might expect; for, though they don't care a rap about pleasing, they don't care either about showing their displeasure, and so probably they show little or no sign of any kind. Indifference is their prime social quality; that it does not make for the gaiety of nations goes without saying.

I repeat again, the Englishman does not care what strangers think. He assumes that he is better than they are, and in any case he knows that he is self-sufficing. His blank classic stare means that he wouldn't care a rap if the whole of Europe and America sank under the sea, so long as the British Isles and, incidently, the British Dominions, survived the catalysm.

### Impressions of Soviet Russia.

As I expected I saw no privately owned automobiles except a few running between the city and the Kremlin which houses the Government's administrative offices. Buses and tramcars convey passengers but both these are extremely crowded. In these everybody thinks it is his privilege to push against you and in sheer self defence you act likewise. The Russians are a remarkably courteous people but I take it that a departure from the normal standard is permitted because if you stand on ceremonies there is little chance of your getting into a car or bus or getting out of it at your destination. To relieve congestion, the Government proposes to build an underground railway. Moscow is almost as costly as London. There are a number of taxis but the fare is much higher than in Paris or Berlin.

Very useful work is being done by the Soviet Government in several directions. Great efforts are being made for the young who are the rising hope of the

boycott of municipalities and local bodies.

### Concluding Session.

The concluding day of the Congress was held on the 1st January, 1930 and perhaps the most debatable motion even in Congress annals, *viz*, that on the repudiation of debts—was put from the chair and passed. Thus, at the final sittings on New Year's day, resolutions on the following subjects were passed by the Congress :—

(1) Every obligation to be inherited by " Independent India, is to be subject to investigation by an independent tribunal; obligations found to be other than "just and justifiable" will be repudiated.

(2) Rulers of Indian States are to confer responsible government on their peoples.

(3) An assurance is to be made to the Sikhs regarding a satisfactory solution of the communal problem.

In their concluding speeches Pandit Jawaharlal Nehru President of the Congress, and Dr. Kitchlew, Chairman of the Reception Committee, laid stress on the declaration of Independence.

Indian Review.

---

### Unemployment in Great Britain.

Unemployment, says a recent writer, seems to be the chronic, if not the incurable illnes which Britain contracted in the Great War. The Labour Government is, apparently, as powerless to deal with this problem as the governments that preceded it. One and a quarter million persons are now unemployed, and the new Unemployment Insurance Bill totalling £12,500,000 for the year, though a heavy burden for the British taxpayer, provides doles that are ridiculously small. The Independent Labour Party, representing the radical element has tried to force the Government to increase the allowances, but the Government replied that the money was not available. In spite of this answer, the radical group at first voted against the Labour Party on the Unemployment Insurance Bill. The Bill, however, was steadily pushed forward and passed. Unemployment is likely to be a serious danger spot to the Labour Government in the immediate future.

The Treasure Chest.

---

in specific areas, and for this purpose the Congress should authorise the All-India Congress Committee to take the necessary action, where-ever and whenever it considers it desirable."

* * * *

The President wound up with the stirring words.

"We have conspiracy cases going on in various parts of the country. They are ever with us. But the time has gone for secret conspiracy, we have now an open conspiracy to free this country from foreign rule, and you comrades, and all our countrymen and countrywomen are invited to join it. But the rewards that are in store for you are suffering and prison, and it may be. death. But you shall also have the satisfaction that you have done your little bit for India, the ancient, but ever young, and have helped a little in the liberation of humanity from its present bondage.

**The Resolutions.**

The Congress met again in open session on the 31st when Mr. Gandhi moved and Dr. Ansari seconded the first resolution on the Delhi bomb incident. There was some opposition and the house seemed divided, but it was passed, 897 voting for and 816 against.

Introducing the Independence resolution as adopted by the Subjects Committee, Mr. Gandhi characterised it as the root of the future Congress work. The resolution declared complete Independence as the meaning of Swaraj for the purposes of the Congress creed and resolved on the complete boycott of the legislatures as a preliminary step towards organising a campaign for Indepenence.

Pandit Motilal Nehru, seconding the motion made a stirring appeal to the Congress to follow Mr. Gandhi's lead. The resolution was hotly contested and there were in all 14 amendments from such diverse speakers like Pandit Malavia, Messrs. Kelkar, S. C. Bose, S. Satymurti, Prakasam, Dr. Alam and others.

All the fourteen amendments were then put to vote, and those of Pandit Malavia and others were rejected summarily amidst shouts of "Gandhi-ki-jai." Mr. Subhas Bose's amendment received some support, but the opposition was so overwhelming that a count was not demanded.

It will be noticed that the only alteration in the Resolution was the deletion of the reference to the

...But let there be no repetition of Chauri Chaura; let there be no turning back, once we get our feet onward, let the slogan be :

"Onward, onward until the goal is reached."

**Pandit Jawaharlal's Presidential Address.**

Pandit Jawaharlal Nehru's Presidential Address was a fine piece of imaginative rhetoric. He put a forceful plea for the declaration of the goal of the Congress as independence and the scrapping of the Nehru Constitution, on the ground that the conditions for co-operation mentioned in the Calcutta resolution remain unfulfilled.

"Independence means complete freedom from British domination and British Imperialism," declared Jawaharlal.

"Having attained our freedom I have no doubt that India will welcome all attempts at world co-operation and federation and will even agree to give up part of her own independence to a large group, of which she is an equal member."

And he went on to add :

"This Congress has not acknowledged and will not acknowledge the right of the British Parliament to dictate to us in any way. To it we make no appeal. But we do appeal to the Parliament and conscience of the world, and to them we shall declare; I hope, that India submits no longer to any foreign domination."

* * *

There shall be no gain for ourselves or for our community if all of us are slaves in a slave country. And what can we lose if once we remove the shackles from India and can breathe the air of freedom again? Do we want outsiders, who are not of us and who have kept us in bondage to be the protectors of our little rights and privileges when they deny us the very right to freedom?"

Pandit Jawaharlal thinks it will be unwise to declare a boycott of courts and schools at this stage. As regards the Councils; he is for a complete boycott of them.

"This boycott will only be a means to an end. It will release energy and divert attention to the real stuggle which must take the shape of non-payment of taxes and, where possible, with the co-operation of the labour movement, general strikes. But non-payment of taxes must be well organized

# Topics from other Periodicals

### Indian National Congress.

The opening of the 44th Session of the Congress at Lahore marked the climax to the scenes of enthusiasm that characterised the proceedings of the week. Dr Kitchlew, in his welcome address, gave an elaborate history of the economic and political exploitation of India by Britain, and referred to the achievements of the Non-Co-operation movement of 1921. He favoured the independence ideal and put in a strong plea for communal unity.

He said that the Hindu-Muslim differences were only transitory. They were the result of a tremendous reaction and, if left alone, would die their natural death. The All-Parties Conference, he said, had done them no good ; on the contrary, by giving status to rank communalists, they had done immeasurable harm to the political movement. He characterised separate representation on communal lines as thoroughly vicious.

Pledged to independence as the immediate goal, Doctor Kitchlew suggested the following programme for the country :—

(1) The Congress should declare complete Independence ;

(2) Complete boycott of Legislatures ;

(3) Organisation of a National Army of workers with a view to co-ordinate and combine the different workers, and peasants organisations, also youth organisation;

(4) Organisation, of a permanent body of full time national workers, paid as well as honorary;

(5) And organisation of mass Civil Disobedience as well as individual Civil Disobedience in selected areas under the direction of a compact and small central committee of action.

Dr. Kitchlew concluded with the following stirring call for action :—

To-day we are again on the eve of a period of dynamic action. I appeal to the Mahatma : Pray come and lead us. We are ready.

# Our Laugh Mixture.

## (A Laugh a day keeps the Doctor Away)

**Was certainly Older.**

"Aren't you the boy who applied for this position a week ago?"

"Yes, Sir." "And didn't I say I wanted an older boy?"

"Yes Sir. That's why I'm here now."

---

**Behind with the cash.**

Ashe—"And you say you lost control of your motor-bike?"

Beeche—"Yes, I couldn't keep up with the instalments."

---

**Exterminated Them.**

"I say, Stalker, you told me you had hunted tigers in West Africa? Well, Captain Smith tells me there are no tigers there."

"Quite right. Quite right. I killed them all."

---

**His Busy part.**

May—"What part is young Snobley taking in the Amateur theatricals?"

Ethel—"The Tickets at the door."

---

**Faced the other way.**

"Why are you late, Tom?"

"Please, teacher, the road was slippery with the ice that every step I took I slipped back two."

"Then how did you get here at all?"

"I—er—I started to walk back home."

---

Little Girl (Offering her skipping rope to Captain of ship): "Please, sir, father says you're a fine skipper. Would you mind letting me see you do it?"

---

Rent Collector—"You're sure your mother's out?"

Polly—"Oh, yes, sir, she said she was going to wait over at Mrs. Jone's until you'd gone by."

---

Willie—"It says he was a wizard. What's a wizard, Dad?" Long suffering Father—"My boy, a wizard is a man who can read his paper with kids of your age in the same room!"

---

Little Tommy—"Oh, mother, doesn't that monkey look just like Uncle James?"

Mother—"Behave yourself, Tommy. You mustn't say things like that."

Little Tommy—"But, mother, the monkey can't understand."

If one can keep an airplane in his bedroom in 1930, will it not be possible to keep one's flying machine folded up under his bed, in 1980?

### Electrical Heart.

The fact that cats have been alive for hours with their hearts removed and rubber hearts substituted is hailed at Montreal as a great development in Medical Science.

It is announced that Dr. O S. Gibbs, Professor of Pharmacology at Delhousie University, has accomplished this fact by means of a rubber "heart."

His associates say, that it is the first time full action has been maintained throughout the body artificially for a period of several hours.

the advantage of protecting against vibration and diminishing noise. It wears well and the wearing out is uniform and regular over its whole surface, thus diminishing the menace of nuts and holes which are so common in ordinary pavements.

Its price seem high at first but taking its long life into consideration it is not so in the long run. The rubber pavement, being slightly flexible, yields a little under the weight of tyres, thus keeping the traffic safe in rainy season when skidding is so common and dangerous on ordinary pavements.

### A Mechanical Pilot.

A new device has been invented, the aeroplane stabilizer, which can guide an aeroplane more accurately than a man can. It is a mechanical pilot. When tested in Dayton, Ohio, it guided a three engined transport aeroplane for a total distance of 350 miles. The pilot adjusted the controls after the take off, and then returned to the passengers' cabin, where he stayed until the plane was thirty miles from its destination, Washington, D. C. Then he took the controls again and guided the aeroplane to the earth. This robot, or stabilizer, proved itself a reliable pilot in fifty hours of severe tests flying in all weathers. It guided the plane more steadily than a human pilot could have done. It is based on an instrument similar to the gyroscope, which for some years has been used to guide the rudders of ships. It consists of two wheels rotating, one vertically, the other horizontally. A wind driven electric motor gives them energy. If the aeroplane tilts up, down or sideways, it moves around the stabilizer When it does so, it makes electrical contacts which act through electromagnets to return the machine to level keel and original direction by mechanically activating the ailerons, rudder and elevator, all together or separately. After this test-performance, the United States Secretary of War declared, " The automatic pilot has arrived."

---

### Pocket Airplanes.

" The smallest aircraft," the Statesman, declares " is the Peto, a two seater reconnaissance airplane, specially built to be carried on board submarines. It folds up into a space of 22 ½ feet long by 8 feet wide by 8 feet 11 inches high." This miniature craft has been built by the German navy.

# Science and Invention

**Making Negroes white.**

A Japanese biologist believes he has found out the secret of making coloured people white. He claims that by his process it would be possible for a Negro, Red Indian or a Madrasi to have as white a skin as a European.

Dr. Noguchi's beliefs are based on experiments on the effects of electrical nutrition and glandular control. Not only, he says, he would be able to alter skin colour but he also hopes to do away with racial characteristics.

His electrical nutrition theories include the beautification of children who seem to grow ugly in their infancy. He also claims that mentally deficient children can be made normal.

**Dead Eye as a Camera.**

How a remarkable clue to a murder of a woman was found recently comes from Warsaw, Poland. A faint but clearly noticeabl image of a human head was found on the retina of her eyes. The eye was photographed, and the enlarged photograph bore the face of one who afterward confessed to having committed the murder.

**Cooking by Sunlight.**

Dr. Abbot, on the top of mountain Wilson, California, has been able to cook the meals for himself and his follow scientists by connecting ovens with sun-ray receivers. This solar cooker was invented several years ago but at first it operated only when the sun was shining. Now that he has provided it with a sort of vacuum jacket to keep the heat stored, he can produce hot bread and coffee at any time.

**Rubber Streets.**

A stretch of half a mile of street has recently been paved with rubber in England, It has

George Simpson, a student of Ohio University, has beat the previous record by running 100 yards in 9.2/5 seconds.

---

Mr. Calvin Coolidge, who was President of the United States until last year, has already earned £20,000 for literary work. This is one third more than his presidential salary.

---

The newspaper repository of the British Museum at Colindale is to be considerably enlarged, with new facilities for students who wish to search the files. Mr. Charles Shawcroft, the Superintendent of the Department, claims that the catalogues enable his staff to find any of 250,000,000 newspapers in five minutes.

---

# Here and There.

**Matriculating at 54.**

The following interesting news comes from Calcutta.

D. B. Sarkar, an inhabitant of Serajgunj sub-division, came out successful at the age of 54 and was placed in the Third division.

The extraordinary but curious incident was explained by the fact that his sons were averse to study and in order to set an example he prepared for the examination and appeared last year—but failed.

Nothing daunted the old man, who kept his energy, persevered and with astounding results.

**A Modern Jail.**

The Trivandrum central jail is making an earnest approach to some of those modern ways with criminals, which are doing so much for young members of society in other Lands. The report of its administration for Malabar year 1103 (1927-28) affords reassuring reading. In this year the Durbar spent Rs. 48 for food and Rs. 13 for medical attention for every prisoner. There was a considerable increase in the body weight of 70 per cent prisoners.

The criminal elements in the state are mostly found in illetrate sections of the people, and the authorities of the central jail spare no effort to render its inmates fit for society. They are taught to read and write and carefully trained in some handicraft which would help them to lead honest lives after doing their time.

The maximum strength of the class intended for casual prisoners in the year under review was 75, while that of the other intended for "habituals" was 19. It is stated that most of these 'pupils' proved zealous learners and that they were able to pick up elementary literacy and Arithmetic in a few months. Weaving was given first place among the handicrafts taught in the jail.

In the end, I offer my sincere thanks to the Principal for his kindness and sympathy ; the President of the Dramatic Society, and the members of the society for their zeal and earnest efforts for the success of the performances and the actors for their self-sacrifice in making the activities of the society a complete success.

**Reading Room.**

Mr. Alibhai A. Desai, Hon. Secretary of the Literary Societies Reading Room, writes : –

The year closes with an excellent result for the Reading Room of our College. In all we have forty periodicals besides some College Magazines which we receive in exchange of ours. A good number of magazines could be preserved this year, a fact which goes to the credit of our college students.

Yet there are complaints.

(1) There should be a special peon for the Reading Room because papers are often scattered here and there and some gentlemen with a peculiarly artistic bent of mind even take the opportunity of tearing away the pictures and coupons from the various Magazines.

(2) The tables in the Reading Room must have bars to keep the papers in order.

(3 Lastly, the Reading Room should not be a lobby for chit-chatting in vacant periods.

Syed Moinul Haq and Abdul Shakoor who were in co-operation with the President. The society was hung up for want of a suitable actor for part of the mysterious Lady in the Man of Destiny. Mr. Zahir Babar Kureishi was chosen with much ado but proved very successful. As all the professors were busy with the coaching of the Man of Destiny the coaching of the second drama "Pampat" was under taken a few days before it was staged by Mr. Ahmad Abbas who directed it ably to success. It consisted of the younger students of the institution, who did well at the time of the performance and laid the foundation of their dramatic development for future.

Both the dramas were performed on the occasion of the Annual Prize Distribution of the College in the Intermediate College Union Hall. Dr. Syed Ross Masud, our Vice-Chancellor presided over the function.

The hall was tastefully decorated under the supervision of Mr. Abrar Husain Qadri, and was packed to the utmost capacity owing to the presence of a large number of guests, the members of the staff of the University and its allied institutions and students of the Intermediate College.

The function turned over to be a unique success owing to the frank and detailed report of the Principal, the learned and impressive speech of the Vice-Chancellor and last but not least, the marvellous staging of the Dramas.

Gold and silver medals were given away to the 3 best actors in each drama by the Dramatic Society and two gold medals were awarded to the two best actors in the respective dramas by the President of the Dramatic Society. One gold medal was awarded by the Vice-Chancellor to Mr. Abbas Said for his brilliant acting. The following were acclaimed prize winners by the judges in the respective dramas :—

*Man of Destiny*

1. Mr. Abbas Said XII. (Lieutenant)
2. Mr. Sulaiman Bokhari IX. (Napoleon)
3. Mr. M. A. Khan. (Inn-keeper)

*Panipat.*

1. Mr. Abdul Wahid Kureishy IX. (Prince Akbar)
2. Azizur Rahman IX (Behram Khan)
3. Mr. Ahmad Haji Wali IX. (General Sarwar Beg)

# Our Societies.

### Geographical Society

Mr. Sheikh Abdul Rehman, Secretary, Geographical Society writes :—

I beg to submit to you the Annual Report of the Geographical Society for the year 1929-30.

I took charge of the Society on the 30th October, 1929. This year we could hold only one meeting as I was given charge at a late date, and also for the shortness of the session.

Mr. Kazi Jalaluddin, F. R. G. S. Lecturer in Geography, was kind enough to deliver a lecture full of interest and information on "The Downs of Australia and their Economic importance." We heartily thank him for the trouble he took in coming and giving a well-informed lecture. Mr. A. M. Kureishy, the Principal, has kindly consented to give a lecture in this month.

When I took over the charge the articles and specimens of the Geographical Museum were in a disorderly condition. Soon after I had all the broken articles repaired, the cupboards polished and everything put in proper order.

Mr. Abrar Husain Kadri, the President, tried his level best to take the members on an excursion but unfortunately on account of the shortage of funds coupled with other incoveniences, we were baffled in our proposals.

We also propose to hold our usual competition in this month.

---

### Dramatic Society.

Mr. Sheikh Abdur Rehman, Secretary of the Dramatic Society writes :—

I have great pleasure in sending you the Annual Report of the Dramatic Society for the year 1929-30.

Unlike the previous years the Dramatic Society staged two dramas this year, the Man of Destiny by Bernard Shaw and "Panipat" by Mr. Zahir Babar Kureishi, a student of XI Class of our College and an enthusiastic member of the Dramatic Society.

The coaching of the actors for "Man of Destiny", was taken in hand about the middle of November by Messrs. Sh. Abdur Rashid,

of German: the others different Swiss dialects.

After having been vassals of France from 1798-1813, all these different tribes joined, first they formed a confederacy, then, since 1848 a Federal State—the Swiss Confederation.

I guess I'd better close here, but I shall tell you more in my next letter, for I still have material for several other letters.

Yours affectionately,
WILFRED BAUMANN.

supposed to be relatives of the peoples of Scandinavia, especially of Sweden.

In another part we find that part of Attila's Huns (conquered by Theodorich) who after their defeat in Gaul came through this country and settled here.

After the old Celtic tribes had been conquered by Julius Cesar (58 B. C., near Bibracte the Romans came and cultivated the land; they built large towns and places-of-arms all over the country like Turicum (now Zurich), (Winterthur), Genava (Geneva) Basilia (Basle) Vindonissa (Windisch) etc. Under their reign good long roads of stone were made throughout the country—some of them are still preserved, they also built fine bridges— one of them I have seen in St. Maurice in the valley of the Rhone, and still the whole traffic that goes through this valley, passes over the bridge which spans the foaming Rhone in a majestic arch.

From 250 A. D. till 460 A. D. German tribes conquered the Romans on the Northern side of the Alps. Then they founded their settlements in our country—destroying nearly everything the Romans had built. We call these tribes the Alamans.

Well then these tribes were conquered in 506 A. D. by Chlodwig, king of the Franks. In 920 the Franks and Germans joined, so that Switzerland now belonged to the Germans till the Swiss Confederates released themselves in 1499 in the Swabian War—the Swiss war of independence.

But I seem to have wandered from the subject, so I'll go on where I have stopped —All these different fragments of nations with different languages, manners and habits etc., lived in the hundreds of valleys for a long time without communicating with each other in any way. They all spoke their own languages and their own dialects—even nowadays these very dialects are spoken in Switzerland without having changed much in all this time.

Of the 22 *cantons (former states) which Switzerland consists of, four (Geneva, Naud, Neuchtel and Fribourg) speak French or French dialects; two (Valais, Berne) partly speak French and German ; one (Tessin) speaks Italian ; another (Graubunden or Grisons) speak German or rather a *kind*

Traffic in Switzerland has increased greatly, and fine roads, numerous railway lines, cog-railways, mountain-defiles, mule tracks are to be found in all parts of the mountains.

Not only the Swiss and the inhabitants of the surrounding countries take such great interest in the superb mountains, but also the people of foreign countries. Nowadays the aim of every educated friend of nature is a journey through Switzerland. It is not only the fact, that they find here a different kind of nature than in the other parts of Europe, that attracts inquirers and scholars as well as travellers for pleasure and artists. I suppose it is more the alternating magnificence of wild and gentle sceneries, the ancient and modern manners and customs of the population, the feeling of liberty in this free republic that produces this graceful charm which attracts people again and again to the charming valleys, brown chalets, green meadows, blue lakes and rivers, the loud-pouring torrents and white snowclad peaks, as if there the happiness of the world were to be found.

Switzerland owes its popularity among tourists not only to its natural beauties but also to the character of its people especially in the Alpine districts and to the fact that every thing is done to ensure the travellers' safety and to provide for their comfort while travelling. And over the highest chains of mountains there are good roads and even at a height where plants flourish no longer, you find hotels where you can find a comfortable room and good meals at moderate prices.

The population of Switzerland is composed of fragments of numerous nations that have perished long since. We know that in the oldest times a Celtic tribe was living in the valleys of the Alps, the Helvetians.

About the year 500 B. C, Latin inhabitants of Latium, the district round the river Tiber, where Rome was built later escaped from the pursuing Gauls and Carthaginians into the Alps. Their language still exists in the Rhaetic mountain-valleys in Graubunden or the Grisons, and it is called Romansh.

In other parts of the Alps we find descendents of the Cimbri and Teutons who were conquered by the Roman consul Marius, who are

# OUR SWISS LETTER

*Switzerland.*

By

**Wilfred Baumann.**

Dear Ahmad,

In your last letter you asked me to tell you something about Switzerland, my native land, and so this time I shall write about that.

**Switzerland, the country and inhabitants.**

Switzerland is said to be the most beautiful country of the world—everybody knows that nowadays. Quite undoubtedly her beauty existed long before any strangers came into this country, but in spite of this it was quite unknown in days gone by, even in the countries that lie nearest to us. It is remarkable that people only learnt to understand and appreciate the beauty of nature in modern times.

Mountaineering was only very rarely done in past centuries. For one thing people din't know the aesthetic delight that we feel for nature, but the main thing is that the glaciers and alpine regions were thought of as residences of demons, goblins, dragons and evil ghosts, so naturally they were anxiously avoided by every body.

The "Pilatus", which is situated not far from Lucerne (about 6500 ft. above sea-level)—now we can get there by cograilway—was the first peak to be ascended by inhabitants of the surrounding places. Already in the 15th century it was known as a view-point. Later on the "Rigi" (also near the Lake of Lucerne) was ascended, then (in 1536) "Stockhorn" near Thun. Some menials of the monastery of Engelbarg went up the "Tiths", Balmat and Saussure reached (1786-87) the summit of "Mont-blanc", some daring alpinists ascended in 1811 the "Jungfrau" near Interlaken and in 1812 and 1828 the "Finsteraarhorn" one of the most beautiful peaks of the Bernese Alps. Since then the ascensions of Swiss peaks have increased in number from year to year.

Nowadays Alpinism has become a sport of everybody, numerous Alpine Clubs have been founded—I suppose in all the Swiss Alps there is not one peak that hasn't been ascended yet.

The more the ways to the mountains were opened out, the more the enthusiasts crowded—especially when the railway lines not only brought the visitors to the foot of the peaks, but also ascended them.

as a candid observer, and one whom certainly no one could accuse of lack of friendship, that what Muslim India mostly needs to-day, and what moreover she insistingly demands to-day, is leadership. Whether the problems which she has to solve are political or intellectual, that need is obvious beyond all doubts. Your traditions in history, your connexions in Central and Middle East, make you peculiarly fitted to be the interpreters of the East to the West, and the West to the East. Your social and religious solidarity, almost unique in itself, gives you a definite force denied to many other communities. But have you to-day the great leaders who can at once justify and utilize these advantages? With all respect, I suggest they are not likely to be found among the Ulema; and again with all respect I doubt if they will come from those whose only experience lies in the common traffic of politics. Once again I return to Sir Syed Ahmad and the ideals he held for Aligarh. There were, he said, some who thought that advancement could be achieved merely by the spread of mass education. He did not oppose that ideal, but his own was different. "I wish," he said, "to see my community rise as high as the firmament which we see at night. When I look at the sky at night, I do not gaze on that part of it which is dark and dreadful, but I wish to concentrate attention on those stars which shine with brilliance and which spread a wondrous beauty over the dark-faced sky. Can we raise our community and make it honourable in the eyes of other people without men who will, shine like the stars in heaven?" It was his firm hope that Aligarh would produce leaders in Islamic India; that was the high mission which he set before it, and, if your University is to justify his devotion and his foresight, it is to that perfection that it must set itself to-day. There can be no Muslim whose heart will not go out to you in that effect; and no man can be a real friend of Muslims who does not pray that Providence may grant us to see its fruition.

us to the fact that there are even graver issues beyond. I suppose that there has been no time in history when those elements which give a distinctive character to the social life and culture of different communities have come so strongly under the influence of new forces ; certainly there can be no period in the history of Asia which has seen its current civilization subjected to so striking an impact. It is one of the difficulties of those who study India to-day that it seems to be thinking and acting in two planes of thought, the eastern and the western ; it is a common experience in private life to find one's friends possessed of what may almost be said to be a dual personality, and in many affairs of moment to be torn between two conflicting ideals. That in itself is only a symptom of the wide changes that are coming over the Eastern world, and which will increase in intensity in the coming years. Great as may be the importance to Muslims of attempting a satisfactory solution of their political ambitions, even greater is the necessity of adjusting themselves to meet the changes which the new forces among which we now move are likely to have on Muslim life and civilization. Your religious life is the soul of your culture ; that is a truth more profound in your case than in that of many others of the world's peoples, for there are some with whom religion is rather an expression of their physical or material circumstances than a creative influence productive of distinctive and recognizable characteristics. What will be the reaction of those new and rapidly intensifying forces on your religion? How will it affect the social institutions which are so intimately connected with religion itself? You have a philosophy and literature of your own, which is part of the life of your community and which many feel to be the essence of that life; it is bound to take fresh shape and colour from its environment; but will this so affect it as to deprive it of its distinctive character? Now these are not mere abstract speculations, of the class which modern parlance is wont to describe as of purely astronomical interest ; they are matters which very clearly affect your future as a community. I do not seek to enlarge on them further, because I wish rather to place one practical consideration before you. Let me put it to you

their own future; it was, as has more than once been said, the spearhead of the Muslim reform movement. I will not ask whether the Muslims of to-day desire to maintain that ideal: it is one which every friend of Aligarh must cherish and evey Muslim must make an effort to attain

I have sought to confine myself to the one salient topic which I know must be of chief concern to you. But though one may seek to keep it in the forefront, yet Aligarh itself is only part of that larger picture which presents itself to those who consider the position of Islam in India to-day. If the appeal you make is to carry conviction and be fruitful of result, then those to whom that appeal is made must be convinced that Aligarh is a vital and essential feature in the life of Islamic India. At the moment men's thoughts are largely centred on the political changes which the immediate future may bring, and their effect on the Muslim community. There are many whose eyes are fixed, almost to the exclusion of other considerations, on one critical feature of their problems, the question of Muslim representation in our legislative and local bodies; there are others who take a wider range, and are concerned with the adequacy of the statutory protection which can be secured in a more democratic scheme of things for the institutions and the distinctive culture of a minority community. There is much which one might wish to say regarding the place of Islam in the development of Indian nationalism and on the vexed question of the adjustment of the relations of communities in the sphere of politics. I know of no better platform for the reasoned discussion of such matters than that of a Convocation Hall; but the present moment is not perhaps the most propitious for the purpose. Feeling is running high and somewhat obscures the distant vision; and for myself I appreciate the disadvantage of a time when public men seem to be impelled to say more than they really mean, and the servants of Government are constrained to say far less than they would perhaps like. But in any case, for the moment I am on a different issue. Your concern cannot and must not be limited to immediate political solutions; they present problems which in all truth are sufficiently grave and perplexing; but their consideration ought not to blind

inclination." The problem of securing and maintaining teachers of the right kind is not entirely financial; enthusiasm and devotion are essential and will do much; but eventually you will find that if you desire to see your teacher maintain the detachment of spirit, the absorption in his calling which alone will give him real influence over his pupils, it is necessary to secure him at least a reasonable freedom from material anxiety and a sufficient guarantee for the security of his own future.

Then, again, the whole scheme of character building at which the founder aimed was in great measure dependent on the condition of residence at the University. But at least one-third of the students are now non-residential; and additional hostels are therefore urgently required. These are two essential requirements; but over and above these, there are heavy calls for new laboratories and class rooms, staff quarters and library, and schemes for drainage and electric light. You have a conditional promise from the Government of India of an increase in its recurring grant from 1½ to 3 lakhs, besides a non-recurring grant of 15 lakhs, spread over a number of years. The local Government does not desire to take its stand too rigidly on the ground that your University is an all-India institution; but it does actually at present contribute in various ways over 1¼ lakhs annually to the University and over Rs. 3,000 to its allied institutions. Deeply interested as it is in Aligarh and keenly desirous of promoting its welfare, yet you are not of course the only competitor for financial assistance to academic work in the province; we already, I think, give large assistance to our universities than any province in India. It is inevitable, therefore, that if you are to attain the full fruition of your hopes, it must be achieved mainly by the liberality and self-sacrifice of your own community. As your Treasurer pointed out in 1927, all your activities in raising funds have been in abeyance for some ten or twelve years; others similarly placed have not in the meanwhile ceased from the most strenuous campaign in search of assistance. I remember well the days when no one thought of Aligarh merely as an educational institution; it was the visible sign of Muslim solidarity and of the faith of Muslims in their own culture and

part which your Chancellor has played in it, nor in their appreciation of the action taken by the Court, and of the patriotic labours of your Acting Vice-Chancellor, Sir Shah Mohammad Sulaiman, carried out in critical and very difficult circumstances. No less, I know, will the Aligarh of the future have cause to congratulate itself that it has been able to attract to its service your present Vice-Chancellor, Dr. Syed Ross Masood with all his wide experience and his knowledge of men and things, and all that his name means to those who revere the memory of his great ancestor; and that associated with him is one with the reputation and capacity of your Pro-Vice-Chancellor, Mr. Horne. With such men at the helm, strengthened—as I know they will be—by the loyal and unwavering support of staff and students, the omens are all in your favour, and you may with all confidence promise yourself a fair course for the future.

One would be glad if one could close here, on a note of determination and of hope. But in this difficult and exacting world of every day affairs, something more is needed than the will to action; it will go far, but organisation and equipment is needed for complete success. Let me take briefly what appear to be your outstanding needs to-day. All reforms seem to point oneway back to the ideals of the founder His vision of the University was that of the close and intimate association of a band of scholars working in a spirit of service to their community, with a body of selected students who should be equipped and trained to hold worthily positions of trust and responsbility. You will not, I think, attain this unless you can place the existing Departments of study on a sound and permanent footing; the essence of success of a teaching university lies in ensuring that the tutorial system is really adequate. The great need is for teachers of character and academic learning who, in the words of the Sadler Commission "will exert on their pupils that kind of guidance which cannot be mathematically defined, not because the ideas on which it rests are vague, but because they lie too deep for words: because such guidance implies a sense of rightness of conduct directed, as occasion arises, to the multiple and varied circumstances of students of different temperaments, upbringing and natural

it as a Muslim University, unfortunate controversies arose regarding details of the proposal, which threatened indefinitely to postpone the long cherished hopes of a higher status and a wider scope for the future. Though the friends of Aligarh rallied to its support, it was not till 1920, that the new position could be attained. But at the very moment when it was beginning its new life it had to stand the shock of an insidious attack made under the painful influence of the Non-co-operation movement, which sought to ruin the result of the united labours of the Muslim community for more than half a century to establish this great educational centre. Once again it was fortunate in the loyalty of its friends; and, in the Viceroy's words, it withstood the storm and emerged from it invigorated by the perils through which it had passed. That was hardly a decade ago; yet in the short years that have passed since then, events have occurred which have gravely troubled the life of the University and undoubtedly caused deep anxiety to its friends. I could wish to approach with all due reserve the chapter in its history which ended with the issue of the report of the Enquiry Committee. Those who have read that report, and the statement published by the University authorities showing the steps taken to give effect to its recommendations, will, I believe, feel as I do on the subject. There will be a natural sense of regret that the inquiry was necessary; but that is a passing feeling only. There will be a strong and abiding sense of satisfaction and even of pride that those responsible for the guidance of the University had the courage and determination to realize the necessity for action and to apply the remedy. Take what sphere of life you will, examine any field of human activity that you may choose. At times standdards will be relaxed, policy may lose direction, abuses may creep in. But success lies not so much with those who avoid mistakes as with those who can recognize them and who possess the moral fibre necessary for their correction. Let us look on this chapter as closed. It is enough for us that once more the loyalty of Aligarh has stood the strain and that its spirit burns again as brightly as of old. Let me only add here, that I know that they who in the future look back on this chapter, will not fail in their gratitude to the

# CONVOCATION ADDRESS

DELIVERED BY

## HIS EXCELLENCY SIR MALCOLM HAILEY,

G. C. I. E., K. C. S. I., I. C. S.,

*Governor of the United Provinces of Agra and Oudh, and Rector of the University*

At the Annual Convocation of the Muslim University, Aligarh, held on Saturday, January 25, 1930.

Mr. Vice-Chancellor, Members of the University, Ladies and Gentlemen:

It would not be possible to speak to you to-day without first expressing my own sympathy with Muslims throughout the province and more especially with you here at Aligarh in the loss sustained by the death of Sahebzada Aftab Ahmad. He was to me an old and greatly respected friend, and none of his friends could fail to recognize that, keenly as he felt for the cause of Muslim advance, his real life's devotion was to Aligarh. He has found rest at last from the trials of a long and painful illness, endured with patience and true courage; may his soul have peace!

To one who is honoured with an invitation to address the Convocation of a University there is open a wide range of subjects; there awaits him the whole field of History and Philosophy, the Sciences and the Arts. But I think I can serve you best to-day if I avoid topics so wide in favour of matters which are of closer and more domestic concern to you; and in truth I can imagine no topic which is so engrossing as that of your own immediate future. When Lord Reading addressed you in 1925 he dwelt on the many critical periods which had occurred in the life of Aligarh. He recalled how the early days of the College, in spite of the great enthusiasm and indefatigable exertions of the founder, were clouded by an atmosphere of misapprehension in the minds of those chiefly destined to derive benefit from it. It required all the strong personality of Sir Syed and the exercise of his great magnetism upon others to bring it successfully through this difficult period. Lord Reading showed again how in 1911, when a movement was set on foot to constitute

Sologan thanked his lucky stars to escape so lightly. He packed up a few, large trunks and left his old home in a manner, that would have melted the heart of a criminal who knows no mercy. He had spent many a happy years in company of his beloved wife and now he was compelled to abandon it for ever. With a sob and a lump in his throat, he boarded the waiting taxi and made for the station, where he purchased a ticket for Peshawar, from where he would go to Afghanistan. Next day Mr. Imdad went to the Police station and reported his discovery to Mr. Wadood, the Commissioner of Police, whose spirits rose at the idea of bringing the murderer to book.

In half an hour a dozen officers of the law headed by the Commissioner himself, drove up to the residence of Mr. Sologan Mohammad but they were cruelly disappointed for they drew a blank as the bird had already flown, and it was for the first time that Mr. Imdad, the private detective, had deliberately allowed—nay—helped a murderer to escape through his fingures and the reach of the law.

denly he was rudely interrupted by a knock. He rose stiffly and answered the knocking at the street door. On opening the door he was confronted by Mr. Imdad, the eminent criminologist.

" Good afternoon," greeted Mr. Imdad kindly.

"Good afternoon,old sport, what chance wind blows you here "

" Oh, " replied Mr. Imdad gravely. "I have come to talk about something private and serious, which concerns your safety.

Young Sologan led the way into the sitting room and bade his grave-faced friend to take a seat and offered him a cigarette. Mr. Imdad lighted the cigarette and went straight to the subject as beating about the bush did not appeal to him at this critical moment.

"Well," he remarked, "you seem to be in a tight fix. You know last night's affair. You have made a pretty mess of things. The evidence, the only clue which I have in my possession, but which is enough to hang you, yet before I go on further I would like to hear what you have got to say." Young Sologan was drawn in the face, but he managed to find his voice.

"Imdad," he faltered, if you were in my place you would have done a deal more than the killing which I admit I did, yet if you know the reasons you would agree with me " With this Sologan related his adventure of last night and the story in connection with his wife and his promise, which he had fulfilled this day, omitting nothing.

In the end Mr. Imdad's pity went out to young Sologan. Mr. Imdad pondered for some time and then said, "Sologan, I do not wish to end your young life. I am going to help your escape from the unpleasantness, which is to befall you. I know you are honest and, I can trust you, therefore, I strongly request you to leave the locality and go away to a safer place. I shall report my discovery in the morning to the Commissioner so you have ample time to catch the Peshawar Mail, of course, secretly." So saying he rose to go but young Sologan gripped his hands and there were tears in his eyes. He thanked his friend in broken words for aiding him to fly. Mr. Imdad soothed him and departed after a sorrowful parting wishing him the best of luck and a fond farewell, also reminding him to make haste.

face grew serious, and he proceeded with his investigations by scrutinising the safe, which was ajar, with a powerful pocket magnifying glass for possible fingure prints, but none were found as the murderer had worn gloves After an hour's strenuous search his gaze fell on a white object ; which he suddenly picked up and examined. It was a man's handkerchief and on one corner there were the initials S. M. and bore a trace of a faint but, expensive perfume. Imdad's eyes glistened at the find, but immediately he grew pale as he saw that the handkerchief was the property of his dear friend Mr. Sologan Mohammad, and this immediate discovery was due to the fact that it was a present he had sent to Sologan Mohammad last I'd. That day he returned however very dejected nevertheless keeping the find to himself.

---

In a small bungalow, at the corner of Mughal Street, a young man. immaculately dressed in evening suit, lay comfortably, but with a vague foreboding of evil, in an armchair, enjoying a cigarette. He gazed at the thin rings of smoke he blew out and smiled. He had waited patiently for a long time and last night he saw his opportunity and had taken it. He had secured the papers, which he had been requested by his deceased wife to obtain by any means and destroy, from the premises of Messrs. Zera & Co., Ltd. and had also shot Mr. Zera for this scoundrelly Jeweller had been the cause of his wife's death. Mrs. Zohra Sologan Mohammad, his young and lovely wife had a weekness of taking a deadly drug secretly without his knowledge and Mr Zera had come to know about this and he had cunningly obtained a written confession about her drug taking practice and armed with this he had been blackmailing her on the pretext of revealing the truth to her friends, and she, unable to stand it any longer, had committed suicide, after writing on a sheet of paper a note to her husband confessing all that she had done and begging him to get the written confession and destroy it, not forgetting to get even with the nefarious Mr. Zera.

Her husband had taken a vow to settle accounts with the jeweller, who had robbed him of his happiness, and now, he reclined easily in the cosy armchair, content at having fulfilled his promise. Sud-

slight movement in the passage and he at once flattened himself against the wall and became alert and all attention, his right hand automatically slipped to his hip-pocket, where reposed a formidable revolver, fitted with a modern German silencer, the cold touch of which comforted him.

Suddenly a beam of light entered the room as a secret panel moved out to reveal a short, but strong man standing at the entrance with a lantern in his hand. Without waiting, the burglar raised his revolver and fired and the man dropped to the floor in a crumpled heap.

The lithe figure, with a last look round, made his way towards the window and quickly, but silently descended to the ground and disappeared into the night.

---

In the morning Local newspapers were full with the news of the daring murder committed in Prince Street in flaring headliness.

There was a lot of confusion at the police station. Mr. Wadood, the Commissioner of Police, was at a loss as to what he should do, so he'phoned up Mr. Imdad Khan, the world-famous criminologist, requesting him to come to his aid and investigate into the matter on his behalf.

Within fifteen minutes Mr. Imdad Khan reached the police station and was cordially greeted by the greatly agitated Mr. Wadood. He was handed a newspaper, which vividly outlined the event of the previous night.

He carefully went through the report and looked up thoughtfully at the Commissioner, "Well," he remarked, "this is something rather very daring and requires a great vigilance on the part of the police ; have men posted about the premises, where the murder was committed and allow none to enter or leave and in the meantime I shall make a thorough examination of the room and may perhaps discover something of a clue, which your subordinates may have overlooked. So long you have nothing to grumble at." He shook hands and left the police station, hailed a taxi and was driver to the firm of jewellers.

The constable on duty at the entrance recognising him saluted and he entered through the street door. With quick steps he mounted the staircase and was greeted by a Police Inspector in charge of the room. Once inside the room his

# THE CLUE OF THE HANDKERCHIEF.

by

S M Gangat Class XI C.

It was a dark night, the rain was pouring in sheets, the wind howled horribly and the street was deserted; no human being moved about on such a chilly night, yet if one were more careful he would have spied a slim figure of a man slouching against the wall of a tall building which served as the offices of Messrs. Zera & Co., Ltd., an important firm of Delhi jewellers, situated in Shaukat Street, in the east end of this mighty city.

The figure was powerfully built and was covered from head to foot in a raincoat with a cap pulled well over his eyes. He moved with stealthy steps until he reached a water pipe below a window, by which he had planned to make his entry. Finding everything quiet about him he started scaling the water-pipe with the agility of a monkey and in a few minutes he had reached the window ledge. The opening of the window was a child's play to him for by a few gentle thrusts, with the blade of a keen-edged pen-knife the catch slipped back, and he cautiously flung open the window and alighted in a darkened room. He brought his torch into play after first dimming the light by wrapping a handkerchief round it, for he took no chances. He could make out the dim outline of a Hodge safe, built in the wall, at the farthest corner of the room, and towards this he proceeded. After making sure that none was disturbed, he bolted the door leading to the adjoining room from the inside. Next he pulled out a leather case from his pocket, which contained various kinds of steel instruments, which are the companions of a safe breaker. He manipulated skilfully for an hour with a long flexible piece of steel and his efforts were rewarded by a faint click and he pulled open the massive steel doors. He was staggered at the contents but he was not interested in what the safe held, except in a blue envelope which was heavily sealed.

He drew a long sigh at the sight of the package and muttered to himself, "Thank God, I am in time to outwit the scoundrel!"

He put the package in an inner pocket and rose to go, but his sharp ears caught a

Hindus and Mussalmans were equally in danger. The Mongols were the sworn enemies of the Mussalmans and had destroyed all centres of Muslim civilisation. But they were no friends of the Hindus either. Their language was unintelligible; their habits were revolting. Wherever they went, they captured all women, high and low, and subjected them to a fate worse than torture or death They slew children without compunction; they delighted in bloodshed and massacre. For two generations a dark and threatening cloud had covered the sky. The man, or body of men, who stopped the Mongol inroads would have an undeniable right to the gratitude of the Indian people. Secondly, the democratic organisation of the village communities had gone to pieces in the centuries preceding Shahabuddin's. Law and custom had given place to force and in an era of universal disorder, the headmen or *muqaddams* had succeeded in establishing their autocratic power over the villages Finding no strong power over their heads, the *muqaddams* proceeded to oppress and tax the poorer peasant (rayiyat) to their heart's content. Only the establishment of a strong and centralised authority could save the peasants from the clutches of the headmen.

That it was the Mussalmans and not the Hindus who drove oft the Mongols and reorganised the revenue administration of the country, so that peace came to reign where lawlessness had been rampant, was the result partly of accident, partly of the situation of the two communities. At almost any time before the accession of Ala-uddin Khilji, a stout Hindu attack would have brought the rickety empire of Delhi to the ground. Muslim statesmen certainly showed a greater foresight and tact than their rivals, their bitter lessons of the past fitted them to make a desperate and successful struggle against the Mongol hordes, while their comparative freedom from the trammels of custom and tradition enabled them to plan and execute the administrative and revenue reforms which the country needed. The leadership of the Hindus had fallen to the Rajputs, who were too disunited and too fond of internecine warfare, to combine either for internal adminstration or external defence; nor was it in the desert of Rajestan that the empire of India could be established or overthrown.

the philosophy of the Shaikh included the infidels also in its tolerant fold. 'Every people,' he explained, 'has its (legitimate) Path, its Religion and its Temples.'* This, Indeed, was the basis of our religious compromise in the middle ages, a compromise sanctioned by the greatest thinkers, scholars and statesmen of India. Uderlying all our disagreement was an agreement to differ. For each of us own creed was the most legitimate and the best; the Hindu was welcome to be a good Hindu and the Mussalman to be good Mussalman. Islam was just another system of thought in a country already tolerating many opposed philosophies; in a society divided into caste and sub-castes, the Mussalmans were but one caste the more. The new faith was included in the comprehensive fold of Indian nationality and it became possible for a Mussalman to lead his countrymen in politics. The new religion rapidly fell into the grooves of the old. The mass of the Mussalmans, being converts from Hinduism forsook the temple for the mosque but never thought of their traditional customs: the prevalance of the ancient customs of Aryavarta among the Indian Mussalmans today is a notorious and undeniable fact. There was nothing peculiar in a section of the Indian people governing the rest; the Mussalmans stepped almost exactly into the position formerly occupied by the Rajputs. If a Muslim emperor could, by his administrative and his organising capacity, prove that he was useful and indispensable, there would be no insuperable objection to the acknowledgment of his authority on religious or national grounds.

The further causes made the establishment of a centralised Indian Government both inevitable and desirable—the rise of the Mongols and the disoraganisation of the Indian village-communities. For about sixty years before the rise of the Khiljis, the Mongols had been hanging like a terror over the Indian frontier. They had sacked all the flourishing cities of Mawaraun-Nahr, † Persia and Afghanistan and had overrun the Panjab up to Lahore.

* *Har quam rast rahi, dinay wa qibla-gahay*; to which Amir Khusrau, who was present added, '*Man qibal rast kardam bar simiti Kaj Kolahy.*' The incident is described in Jahangir's Memoirs.

† Iran Oxonia, or the land between the Oxus and Jaxartes, the land beyond the Jaxartes being Turkistan

all time to come. If this great work had not been previously performed, the work of Alauddin and Akbar would have been devoid of all moral solidity and their empires as ephemeral as the empire of Alexander.

The Indo-Muslim mystics, without perhaps consciously knowing it, followed the footsteps of their great Hindu predecessors. It is a grave injustice to the Mussalmans of India to judge them by the character of their kings, for whom they were in no way responsible, while their religious leaders, their artists and poets, who exercised an immeasurably greater influence over them, are ignored. The majority of the Mussalmans, then as now, belonged to the lower middle class. Even a cursory study of the *mulfuzats* of the mystics will assure any one who cares to inquire, that far from being conscious of any 'high destiny as rulers of India ; their daily life was passed in conditions of appalling poverty, a roof over the head was not always to be had and a full meal was a rare delight. Such limited success as Islam achieved in India, was due not to its kings and politicians but to its saints. With a new faith every thing depends upon the method of its presentation ; and had Islam in this land worn no other aspect except conquering hordes of Ghaznin, it would not have been accepted even by a minority of the people. But Islam had nobler and better representatives, who far from the atmosphere of courts and camps lived the humble life of a humble people according to the *sunnat* of the Prophet to whom 'his poverty was his pride.' And Hinduism in its cosmopolitan outlook enrolled the Muslim mystics among its *rishis*, and neighbouring feelings soon developed a common calendar of saints. So it was in the thirteenth century and so it remains to-day.

A newer and higher philosophy displaced the sterile fanaticism of the Turks. On climbing to the roof of his *khanqah** one morning Shaikh Nizamuddin Aulia, the greatest of our medieval mystics, saw a number of Hindus worshipping their idols. It was strange, for a Mussalman, to see a rational creature worshipping the image his own hands had carved out of stone. But

* The *Khanqah* is the private house of a mystic or a number of mystics. It is like a monastery devoted to religious meditation and prayer but women are admitted and may live there.

for which they were prepared to make so many sacrifices. When Mahmud of Ghaznin invaded India he found a number of *rais*, presumptuous and disunited; only the memory of a past empire remained to console the Indians in the hour of their trial. Why then did the Emperor-Sultans of Delhi succeed in unifying the country when the task had proved too great for their Hindu predecessors? The verdict of Destiny reveals itself through human hands, consciously or sub-consciously there must have been present in the minds of men some reasons for preferring the Emperors to their opponents. Far from being a 'slavish crew,' the Indians were an insubordinate and noisy people and there were plenty of adventures ready to take advantage of the first opportunity. It was not tyranny but anarchy which thoughtful men in those days were most afraid of.

It must be premised, first of all, that the Empire really came into existence with the Khilji Revolution, the government of the Slave kings was a pretension and a show, a superstructure without foundations, which often began at the Ghaznin gate and ended at the Badaun Gate of Delhi. The unification of India was the work of the fiery and ferocious Alauddin Khilji, and never since then has the conceptions of national unity been absent from the people's mind. There have been riots and revolutions and civil wars, we have fought and killed; but neither in peace nor in war have we forgotten that we are inmates of the same house and ought whatever its nature to have the same government. Nature meant the land south of the Himalayas to be the country of a single people and the work of nature had been perfected by religion and art. Centuries before the first Massalman stepped across the mountain passes of the north-west into the the fertile plains of Hindustan, the indestructible foundations of our culture and racial unity had been laid. It was the comprehensive work of comprehensive minds. In the Hindu institutions of pilgrimages and temples, in the rites and ceremonies of the Vedas and the folk-tales of the Ramayana and Mahabharata, in the tolerant philosophy of Mahayana Buddhism and the no less tolerant code of Manu, we see the potent influence that made the sacred land of Aryavarta one and indivisible for

the towns and villages of Persia. War is not a child's play. 'Surely, princes ruin a town when they conquer it and degrade the noblest of its citizens, this is what they have always done.' The very sentiment, which sanctioned tolerance of the subjects of the same king, when they differed in faith, also sanctioned oppression of foreigners, even if they happened to be co-religionists. Very often the Indian, in his extraordinary loyalty to his salt, proved untrue to every other principle of moral life. The armies of the Turkish and Khilji Emperors were composed of Hindus as well as Mussalmans; in the destruction of temples in southern India, the Hindus had a part.

The real motive of the plundering expeditions of those days was greed for treasurers and gold. The iconoclastic pretensions were meant only for the applaud of the gallery. For the Emperor a campaign against the Hindus outside the empire was purely a business-venture, and the economic conditions of the day made it, in the hands of an efficient board of directors, the most paying of all fianancial investments. From time immemorial the balance of trade had been in favour of India; the precious metals had slowly accumulated in the country, and, thanks to the devotion of innumerable believers, ultimately found their way to the great temples. In an agricultural country like India nothing but hard knocks could be expected in plundering the villagers, and neither Hindus nor Mussalmans essayed the dangerous experiment. In almost all campaigns of the middle ages, the ordinary villager and citizen was left in peace. The real object was the temple and its fabulous wealth and the principal motive was not religious bigotry but economic greed. If the Hindu temple had been as plain and as severe as the Muslim mosque, Mahmud of Ghaznin would not have invaded Hindustan nor Alauddin Khilji despatched his conquering armies to the Deccan.

But why did an armed and turbulent people like the Indians of the middle ages support, or at least tolerate, a centralised monarchy when it could appeal neither to prescriptive right nor to the letter of religious law? After all men worked, fought and died for the Empire and they must have been inspired by some hope, some ideal, some moral consciousness of the desirability of the institution

fought even more frequently with other Muslim kings, and similarly for one Rajput who may have fallen in a war with the Sultan of Delhi, about a hundred Rajputs were slaughtered in the tribal feuds of Rajhestan. Hinduism, in any case, was armed to the teeth; and the government of medieval India was a comradeship between two energetic and militant communities. The Emperor was a Mussalman because, with Hinduism divided into castes and sub-castes, the Mussalmans were the strongest and the most united minority, and out-numbered the Kashattriyas as well as the Brahmans. If Hinduism had been inspired by the spirit of equality and social democracy, which was the finest feature of Islam in the middle ages, matters would have been certainly different.

But the tolerance of the Emperor-Sultans was strictly confined to the Hindus within their dominion. Once they or their armies crossed the imperial frontier, all tolerance, good sense and even humanity was cast aside; and the fanatical feelings, forcibly kept under control at home, exploded with revolutionary violence abroad. The vandalism of Sultan Mahmud in Hindustan was equalled, if not surpassed, by Malik Kafur in the Deccan. It is no use denying obvious facts. There is not a single Muslim historian of the middle ages who fails to record the destruction of temples, idols and monuments of inimitable art which followed in the wake of the conquering armies of Delhi. They prided themselves over these deplorable achievements and made no efforts to conceal them. True enough, the destruction of temples and places of worship is contrary to every principle of the Muslim faith, and Islam, as a religion, is not to be judged by the politicians who so mendaciously misrepresented it in early middle ages. Nor must it be forgotten that customs differ with age, and according to the accepted traditions of those days plundering an enemy's house of worship was considered a legitimate act of war. When the Mongol hordes invaded the Muslim lands of Central Asia, Persia and Afghanistan, they regarded the destruction of mosques and libraries as an integral part of their scheme of conquest. Shahabuddin Ghori's conquest of Hindustan and Kafur's invasion of the Deccan compare, if any thing, favourably with the havoc wrought by the Saljuqs, Ghazz and Tartars, in

from them by way of charity."* It was the last whim of an important and helpless fanaticism. Jalaluddin, whose common-sense was superior to his theology, returned to Delhi but dared take no steps against the Hindus. The days of Mahmud of Ghaznin had gone never to return. The Sultan-Emperors of Delhi, whether they liked it or not, had to ascend their throne under conditions which were acceptable to the Hindus. The intolerance preached but not practised by Jalaluddin Khilji is, of course, no part of Islam: Mussalmans who considered intolerance a duty found themselves utterly helpless, persecution became a sort of ideal for bigots, which practical man threw into the lumber-room of useless speculations.

A foreign despot like Sultan Mahmud, with the force of an organised nation at his back, could come and plunder peaceful cities and go back loaded with spoils. But for the Emperor-Sultans of Delhi, who depended for the larger part of their taxes, their army and their material strength on their Hindu subjects, such a policy was impossible. For them communal conflict would have meant unavailable ruin. The supposed cases of persecution in medieval India can be counted on the fingers of one hand and will, on close examination, turn out to be cases of individual injustice, not of communal oppression; contemporaries, at least did not regard them as such. It is curious that neither the political nor the sacred literature of the middle ages gives us the slightest indication of a Hindu national reaction against the Mussalmans; it was not that Hindus were unwilling or unable to protest; they were notorious, if any thing, for their warlike propensities. But in none of the too many battles of medieval India, do we find the armies divided on religious lines. A phalanx of Afghan warriors fought under Rai Pithaura at the battle of Tarain; Muslim artillery-men supported the Mahrattas at the third battle of Panipat. A real Hindu-Muslim battle has yet to be fought. If we would understand the history of medieval India aright, we must once and for all reject the stupid and impossible picture of a body of foreign conquerors governing and misgoverning a peaceful and harmless population. There is not a scrap of evidence in the original documents to support such a view. Of course, Muslim kings fought with Hindu Rajas though they

* Ziauddin Barni, Tarikh-i Firoz Shahi, p. 216 of the Persian Text.

a moment wish to suggest that the toleration granted to Hinduism within the Empire was the result of the Emperor's free will or that it was liked by the more fanatical part of his Muslim subjects. It was very much a matter of confusion, of dire political necessity. Medieval Hinduism was armed and organised, it was tolerated because it had to be tolerated. There was no other alternative.

In 1291 A. D. Sultan Jalaluddin Khilji attempted to besiege Rantambhor, but finding it impregnable ordered a retreat. His nephew, Malik Ahmad Habib, strongly protested against the order when it was discussed by the Royal Council. "If the Emperor returns without conquerring Rantambhor", he complained, "people's respect for him will decrease. Why does not Your Majesty follow in the footsteps of Sultan Mahmud and Sultan Sanjar, those pillars of the Muslim faith who conquerred the world? You cannot turn away your eyes from (the example of) their exploits and conquests". The Sultan laughed. "My lad" he replied, "the armour-bearers and footmen of Mahmud and Sanjar were a thousand times better and more honourable than me. How can I, who have but the nearest pretence of temporary kingship, dream of doing that those great rulers and conquerors have accomplished. What am I—what is the dignity and power of my kingdom—that I should strive for what Mahmud and Sanjar have achieved? Fool: Do you not see that *the Hindus pass every day by my palace blowing their conches and beating their drums on their way to worship their idols by the bank of the Jumna*? They follow the laws of their infidelity before my eyes, *despising me and my royal authority. If I were a true Muslim king* would I let them eat their betles, wear their clean clothes and *flaunt themselves among the Mussalmans with a fearless heart*? Shame on me and my kingdom! My name is read in every Friday sermon. Lying preachers style me 'the Defender of the Faith'. And yet the enemies of my faith—in my capital and before my eyes—live in luxury and splendour and arrogantly pride themselves above the Mussalmans on account of their prosperity and wealth. Openly, with beating of drums, they worship their idols and follow their infidel customs. Shame on me: I leave them in their luxury and pride and content myself with a few *tankas* that I get

# THE EARLY MOHAMEDAN EMPIRE IN INDIA.

BY

Prof. Mohamed Habib, B. A. (Oxon).

III. Our medieval kingship was an essentially secular institution. Royal power was based on Persian tradition, not on Islamic law. The Emperor-Sultans of Delhi, as a rule, carefully distinguished their public duties from their private faith. They refused to enforce the *shariat* so far as public law was concerned, and behaved as kings of all their subjects and not as kings of the Mussalmans only. The point deserves a careful consideration. It illustrates the curious national feeling of the middle ages; on one side, the complete secularisation of politics and, on the other, the extension of a real tolerance to all the subjects of the Empire of Delhi and to them only. Between the Emperor-Sultans and the Hindus within their dominions the unifying bond was not a bond of faith. It was that of sovereign and subject, a tie quite well-understood on both sides. The Emperor did not feel morally concerned for the spiritual salvation of his Hindu subjects; that was not a question for him to decide. So long as they yielded him the obedience due, he was quite content. And the Hindus, while ready to support the Emperor's power in political matters, would tolerate no meddling with their creed. As soon as the tide of Turkish invasion stopped in its conquerring career, toleration for all the subjects of the Emperor being within his dominion was recognised to be the only possible policy for the state. Throughout the extensive empire of Delhi, Hindu temples were left in unmolested peace. The three or four cases of attempted oppression to which our historians refer prove, rather than disapprove, the general law. As for the Hindus not being allowed to ride horses, shoot arrows and so forth, the general prohibitions against Hindu processions, ablutions and worship—these fables have arisen from a false reading of the original documents. A Hindu General, Malik Naik, commanded the right wing of Alauddin's army and the Rana of Chittor led his vanguard with five thousand men. There are any number of such examples. Could members of a community not allowed to ride horses and wear arms have occupied these positions? I do not for

devout worshipper I was sitting before her, not even once venturing to lift my eyes to meet her. We spoke not a word. She kept gazing at me all the time. Of course, I appeared a gentleman from my dress and talk but for my undesirable and indecent conduct.

My resentment and confession of my own folly seemed to have moved her to pity. She assumed a gentler countenance. She seemed to me all gentleness, kindness and goodness. Yet not a word came out of our lips. But her batteries were levelled against me. All those considerations of my indifference to beauty, prudence and honour, which I had placed as guards over the avenues of my heart, now gave way and the god of love marched in, triumphant. My citadel was taken by surprise. I was silent, yet what the lips concealed, my eyes and involuntary actions revealed.

I can never be sorry for any action of mine in my whole life again than I was that night. O, how I long to enjoy that sweet remorse at least once again! How short-lived it was!

Only about ten minutes after the train stopped at a station, and, fearing lest I should be detected sitting in a "Ladies' compartment" by either a relative of the lady or some Railway servant, I got down, and went into another compartment near it. While getting down I cast a longing lingering look behind, full of an appeal to let me sit there for a few moment more, which were met by another, which did not look severe and seemed to express "there was no harm in it." But I could do nothing except to bow and quit the compartment. Pratabgarh was the next station, where I had to change my train for Allahabad. I remained standing on the platform, looking at her through a window which she had kindly opened, till at last the train started, carrying its precious load I know not where.

As the train disappeared in mist and darkness, I began to feel a very tender sensation, very delicious.

But now that I am sitting at my table in my room I feel that the very passion has become a scorpion in my bosom. A smothering fire seems to consume me day by day. How often I have conflicted with my own self at loving one, whom it is quite impossible to see, what to say of possessing. But still there is the scorpion stinging, and the fire consuming.

And I wonder how will I be able to argue with my friend now when we will meet again.

up to him but courage again failed me. Yes, there he was lying at full length, on the berth, wrapped in a beautiful shawl from head to foot. The shawl, however, could not hide the delicate and slim figure which though invisible could not fail to appear to my eyes as such.

"How can such a beautiful frame be owned by an inhabitant unworthy of it?", I naturally thought, and growing confident that he would not be angry with me at this disturbance, I at last roused him from sleep by touching his feet

A shriek expressive of both fear and surprise! and lo! I saw none other than the delicate form of a beautiful lady standing before me, who asked me in an imperative tone as to what I wanted and who I was.

Oh, how to describe that paragon of beauty! I remembered the words of my friend, "I am afraid, you have seen no real beauty. Wait till you see it......" Those prophetic words! Were they to come out true so soon? I was dumb-founded with the power of beauty—real beauty. There was more of the lily than of the rose in her complexion, but at present partly through fear and partly through surprise it had turned pale. I felt at the very first sight that the highest beauties I could ever conceive of were outdone. The most arresting feature in her face was her eyes, which were darting fire and rage against me. Perhaps no one has seen beauty in its highest lustre who has not seen it indignant or surprised. Like a lioness she stood to defy the mightiest power in the world. I was so much overpowered by her charms that I forgot myself and remained standing, silent, in a trance, as it were. How long I would have remained in that state, had she not threatened to pull the alarm signal, I know not.

I attempted to speak but failed. Summing up all my power with great difficulty I spoke, at last, some broken words, begging her pardon for my conduct and expressing my grief and regret at disturbing her, and also cursing myself for having got into a "Ladies" compartment by mistake. She refrained from stopping the train or doing some desperate act.

She composed her spirits and smiling, perhaps at my folly and confusion, sat down covering her self in her shawl again. Like a

look out. The lights of the station passed away one by one. It was all dark outside. and I kept on staring outside the window for about half an hour, thinking all the while of the unfinished discussion. I thought I could have convinced my friend had I been spared only fifteen minutes more. Who could have contradicted a truth? A piece of coal driven into my eyes now interrupted me. I shut the window, for the biting gusts of January wind were making it difficult to feel comfortable and warm without closing it. I rubbed my eyes and on opening them saw another fellow traveller fast asleep on the remote corner of the compartment. To me it was a discovery. I again rubbed my eyes with astonishment, for on first entering the compartment, I thought it to be quite vacant. Those who travel regularly will realise how necessary an agreeable companion is for a pleasant journey. At least I always search for one to talk with and, thank God, I always get one. This time I was full of my ideas of the non-existence of Unselfish Love that thought it necessary to give expression to them before some one. But since there was only one passenger in the compartment and that too unaware of my presence, I mean asleep, how could I talk to him?

"God knows what sort of a man he is," I thought, and whether he will get angry at my disturbing his peaceful sleep or not." I could not dare to wake him up. At last the only way to get rid of the awfully miserable condition was to betake myself to the dreamlands of sleep and forget myself, the fellow traveller, the discussion and the desire to speak to him.

I lay down on the berth, but sleep would not oblige me. It would not come, as it is wont to go, when desired. I pressed my eye-lids hard to force sleep into them but to no purpose. I kept on rocking from one side to another, and, at last, tired of this restlessness, I sat up in a half-reclining posture with my head resting on the closed window. My fellow-traveller was again before me.

"How very fortunate is this man," thought I, "who is enjoying such a perfect and calm sleep. Why does not sleep come to me? Why does not he share that comfortable thing, called sleep with me!' I now thought myself justified in waking him up. I went

# An Unfinished Discussion.

BY

**Mr. Mazher Aziz.**

I am very fond of discussion and like a chess-player at the board once I have begun it, I cannot do anything else till it has reached an end. The object of my discussion is investigation after truth and therefore I never meet with those unpleasant consequences all discussions generally lead to. I become so much engrossed in a dicussion that some times I forget even to take my meals.................

Such a dicussion I had with my dearest friend the day I was to leave my home for Allahabad after the Xmas holidays. Our topic was the most perverted word 'Love', which my friend held as something divine, sincere and unselfish. I denied the possiblity of the existence of any such thing on earth.

"Is it not a physical passion and does it not vanish the moment you get the object of your love? Can a man ever continue loving and dying for a thing which he finds impossible to get? I have seen so many exquisite beauties, but I assure you, honestly, I could never fall into thát divine, sincere and unselfish thing with them, which you call "Love"; I shouted in the heat of discussion.

"I am afraid you have seen no real beauty. Wait till you see it...," was the cool reply of my friend. He would have continued had not my servant interrupted us to remind me for the third time that the tonga was ready, waiting outside to carry me to the Railway station, and that there was hardly enough time to reach there in time. "Let us postpone it till we meet again," said I hastily, and bidding my friend good-by hurried towards the tonga.

The train was about to leave when I reached the station. I jumped out of the tonga and with all haste ran towards the train, the coolie with my luggage came behind me. Fourtunately I had not to purchase the ticket for I had a return half of one. Not a moment was lost and I got into the first Inter-Class compartment that I could find. The coolie threw my luggage inside and I threw his wages out, for the train got into motion just after. I sat down on the corner of a berth and began to

visitors with a welcome smile. He accompanies them to the dark chamber where rest the king and queen, wedded to eternal sleep. My head of itself bowed low in reverence for the last remains of the mighty creator of the Taj. Their graves look so lovely and grand placed side by side. One thinks that they sleep and love, so that the others too may learn to love and sleep. But before one finds time enough to think and feel, the old man begins picturing to him, in living letters the panorama of the days gone by. Hearing the description given by him I was reminded of the two famous lines of Tagore : –

> "Let there remain tear-drop
> clear and bright,
> There on the dimpled cheeks
> of time·········· this Taj."

After coming out of the *chambers of peace* the minarets on the sides of the Taj attract the attention. They look like the soft white hands of a woman raised up in prayer. Beyond the Minarets, the waters of the river Jumna become visible, as she proceeds dancing and gurgling on her way to the sea. Under the full moon and the transparent light that it sheds, the Jumna resembles a sheet of white paper, whereupon falls the reflected image of the Taj. One might try to look deep into the dim dark waters of the river, to discover if the image of the Taj lay deep rooted in the depth of the river or it came with the heaven born angels of the moonlight rays. Looking with a fixed gaze one might suddenly be startled up. He might see a path of cloud edging the skirts of the moon and so making the image dim and consequently startling up the person. To him it might mean nothing now but then·········· oh ! he might not know what it meant, but true it is that what little he might come to know afterwards would be that the scene had been faithful to the precincts of love and its Taj. The memory of that event might linger on in his mind, to make him speak with Goethe in some opportune hour,

> 'The past, the past alone is
> true to me.'

And then the message might dawn upon him as to why 'Time writes no wrinkle' on the 'azure brow' of the Taj. He might think that we come and go ; that hope is not everlasting, it must sleep and wake; that the sun rises and sets; that the flowers bloom and fade; that birds chirp and stop, but the beauty of the Taj never melts. Why ?

> But let him ask the winds of
> love its why ;
> They'll, if they will, cease
> to blow for reply.

how Taj ..... .............. only an emblem of love and not love itself ..............has borne the Message through the length of centuries. while the plant of his love has been nipped in the bud. But he must know that,

> "All thoughts, all passions, all delights,
> Whatever stirs this mortal frame,
> All are but ministers of love,
> And feed His sacred flame."

and not the flame that burns in every human heart : that whatever on earth is divine, pure as the white of the Marble, that make the Taj, are eternal and not transient.

I had been listening to his music with a rapture that is unexplainable when the music ceased. A couple of minutes had not passed when with a certain thrill I looked up and beheld in front of me the Taj..............that dream of love to whose music I had been listening to with such an attention. A silent deep murmur rose from within my soul, and my lips parted murmuring, "Is this the Dream In Marble? the abode of eternal love". I stood there as if spell bound. I looked in blank amazement. I could neither think nor speak. The burden of beauty lay too heavy on me rendering me a speechless admirer. I could overhear the tourists talking between themselves. A female voice, I heard saying, "Can't we too love Arnold, like the immortal lovers, that sleep there beneath that cupola"? Can we leave the burden of our love to such a messenger as this, the only temporal glory of love ?" The person addressed answered as if waking from a dream, "Oh! we can, and yet we cannot! for we can love only in life and not in death."

I was startled by the words he spoke and felt that excitement which is attendant on knowledge. The truth that this pronouncement fetched me, enhanced my appreciation for the Taj a hundredfold. I had not known before the accidental pronouncement, why the name of the marble mausoleum was a world echo. People know it not and those who know it are few. Unless some one tells them the secret they would not be able to look into the mysteries of the Taj.

After crossing the second gate, fountains and reservoirs, the greenery of the hedge appears. And further when the entrance gate is reached, a man, old, bearded, and fakir-type greets the

# The Dream In Marble.

By

P. K. Bhattacharia

"The years count not the age of love,
For the years mean the mortal age ;
To age love is it to reprove ·······
It is a Taj on Times' each page."

Reader,

Have you ever come across such an object on this earth, that has pictured before you the days of the past. Have you ever experienced the living presence of events dead and gone ; of shadows of history that haunt the lives of the men and women of today ; of long vanished dreams and memories peeping out of the Past. If you have, reader, then excellent and good. But let me describe, my gentle reader, one of such objects. It is the Taj Mahal at Agra. From without it looks a huge mass of marble, but it is not only this—it contains something more precious, more valuable and significant which has secured its mortal creator an immortal name. It is the strength of Shah Jahan's sincere love that clings still to each atom and molecule of the building, and has helped its autocracy to weather the centuries, outlive creeds, survive reformations as well as revolutions. It is a work of Man, the work of Art, that is honourable, venerable and beautiful ; it enshrines Love, in the Past, in the Present, and in the Future; as it was in the beginning it is now and ever shall be.

It was on the 29th of October 1923 that I was on the very spot, that I do describe now. My visit there had chanced upon a full moon night. I had about me a couple of American tourists, who so much frequent the historical monuments. On the other side of the river Jumna some one was playing on the flute. I think he was some youth jilted in love, and had come upon the river bank like a disappointed lover to play out the last tunes of love that had escaped the ravage of it. The Taj was infront of him, reminding him of his former love, and the current of the river informing him of the speed of Time. He must have been thinking (for so I conjecture) as to

## CONTENTS

# The Intermediate College Magazine

MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH

FEBRUARY & MARCH
1930

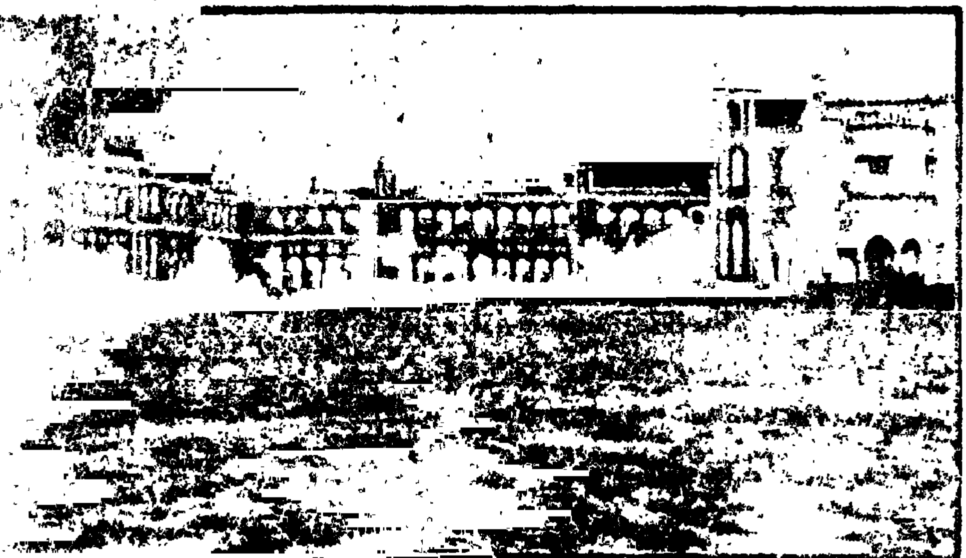
# The Intermediate College Magazine



Vol. 2

FEB. & MARCH, 1930

No. 2 & 3



مسلم یونیورسٹی انٹرمیڈیٹ کالج علی گڑھ

# انٹرمیڈیٹ کالج میگزین

## علی گڑھ

جلد (۲) | اگست ۱۹۳۰ء | شمارہ (۸)

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مطبع مسلم یونیورسٹی علیگڈھ ۱۳۴۹ھ ۱۹۳۰ء طبع ہوا

# فہرست مضامین

نگراں - جناب عبدالعزیز صاحب پوری
ایم اے، ایل - ایل - بی

مدیر - حکیم ماجد حامدی
نائب مدیر - ظفر احمد صدیقی

# خون کا پیالہ

(۱)

نویں صدی ہجری میں صوبۂ دارالامان ملتان پر ایسی تباہی آئی کہ غالباً اس سے پیشتر کبھی نہ آئی۔ امن و امان بالکل مفقود تھا۔ دن دہاڑے قافلے لوٹے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ قندھار۔ غزنی۔ کابل کے افغان اس پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

اس ہولناک خطرہ کو پیش نظر رکھ کر شہر کے امراء و رؤسا نے ایک مجلس شوریٰ منعقد کی اور ایک حاکم کے انتخاب کو رعایا کی بہبودی اور ملک کی حفاظت کے لئے لازمی قرار دیا۔ سب نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور مختلف اشخاص کے حق میں رائے دی۔ بالآخر کثرت رائے سے شیخ محمد یوسف قریشی مجاور روضۂ حضرت شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ اس منصب اعلیٰ کے لئے منتخب کر لئے گئے۔ دوسرے روز انھوں نے نہایت شان و شوکت سے تختِ سلطنت پر جلوس کیا اور اپنے احباب و اقارب کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا۔

(۲)

کجا مقبرہ کی مجاورت اور کجا تخت سلطنت۔ اہل ملتان نے شیخ یوسف کو محض اپنی محبت و عقیدت کی بنا پر تبرکاً سلطنت کے واسطے منتخب کر لیا تھا ورنہ در اصل شیخ مذکور امورِ مملکت و آئینِ حکومت سے قطعاً بے بہرہ تھا ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند — نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند
نہ ہر کہ طرفِ کلہ کج نہاد و تند نشست — کلاہ داری و آئینِ سروری داند

رائے سنتھرہ لنگاہ افغان حاکم علاقہ سوئی ملتان کی سلطنت کا امیدوار تھا اور شیخ یوسف کے مقابلہ میں اپنے آپ کو زیادہ حق دار سمجھتا تھا۔ وہ امرائے ملتان کے غیر منصفانہ انتخاب پر بہت ناراض ہوا اور شیخ موصوف کے خلاف سازشیں کرنے لگا۔

(۳)

رائے سنتھرہ نے اپنی رنجش کی کوئی علامت نہیں ظاہر کی۔ شیخ یوسف کے جلوس کے بعد اُس نے اس کو مبارک باد کا دوستانہ خط لکھا کہ میں جناب کے انتخاب کی خبر سُن کر از حد خوش ہوا اور فی الواقعہ اس قلم رو میں جناب سے زیادہ کوئی شخص حکومت کا اہل نہیں نظر آتا۔ جس طرح آپ کا تقدس مسلّم ہے۔ اسی طرح آپ کی سیاست دانی میں کسی کو شبہ نہیں ہے۔ میں آپ کا قدیم ہوا خواہ ہوں۔ سر دست بندہ زادی کو جناب کے عقد میں پیش کرتا ہوں۔

(۴)

رائے سنتھرہ تحفے لے کر شیخ یوسف کے دربار میں آتا تھا اور اس کی ملکہ سے جس کو وہ اپنی لڑکی کہتا تھا ملاقات کرنے کے لئے محل میں بھی جاتا تھا۔ مہینہ میں کئی مرتبہ ملتان میں اس کا گذر ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر شیخ نے اس سے کہا کہ تم کو یہاں آنے میں بہت دقت ہوتی ہے بہتر ہو اگر تم یہیں سکونت اختیار کرو اور جب چاہو مجھ سے مل سکو۔ رائے نے اس کی عنایت کا شکریہ ادا کیا اور ملتان میں رہنے لگا۔

شیخ نے اپنے ملازموں کو حکم دے دیا کہ رائے کو کسی وقت محل میں آنے سے نہ روکو۔ اس طرح رائے کو محل شاہی میں پورا رسوخ حاصل ہو گیا۔

(۵)

ایک روز رائے سنتھرہ نے شیخ سے عرض کیا "میں یہاں تنہا ہوں۔ میرے تمام دوست اور رشتہ دار قصبہ سوئی میں ہیں۔ اگر اُن کو بھی یہاں بلا لیا جائے تو مجھ کو اُن کی جدائی نہیں برداشت کرنی پڑے گی۔ دوسرے وہ جناب کی خدمت سے بھی مشرف ہوں گے۔ چوں کہ ملتان بیرونی دشمنوں میں گھرا ہوا ہے ایک طرف بہلول لودی نے دہلی پر قبضہ کر لیا ہے اور دوسری جانب پٹھان بر سر اقتدار ہیں اور ملتان پر تسلط کرنا چاہتے ہیں اس لئے اگر میری قوم شاہی لشکر میں شامل ہو جائے تو آپ کو بھی بہت فائدہ پہونچے گا۔"

شیخ یوسف جو زمانہ کے نشیب و فراز اور فطرتِ انسانی سے ناواقف تھا یہ سُن کر بہت محظوظ ہوا اور رائے کی درخواست کو منظور کر لیا۔ چنانچہ لنگاہوں کی ایک بڑی جماعت شہر ملتان کے گرد و نواح میں آباد ہو گئی لیکن اُن میں سے کسی کو محل میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔

( ۶ )

ایک روز رائے سنتھرہ حسب معمول ایک خدمت گار کے ہمراہ محل میں آیا۔ اس کے اشارہ کے بموجب خدمت گار نے ایک بکری کے بچہ کو چپکے سے محل کے گوشہ میں ذبح کیا اور اس کا گرم گرم خون ایک پیالہ میں بھر کر رائے کے پاس لایا۔ رائے نے وہ خون پی لیا۔ اس کے بعد درد شکم کا بہانہ کیا اور زور زور سے کراہنے لگا۔ کراہنے کی آواز سُن کر شیخ یوسف کے ملازم اور دربان دوڑے ہوئے آئے اور حال پوچھنے لگے۔ رائے نے جواب دیا کہ میرے پیٹ میں سخت تکلیف ہے۔ نوکروں نے دوائیں پلائیں مگر اس کو افاقہ نہیں ہوا۔ اور بدستور ہائے ہائے کرتا رہا۔ اس طرح آدھی رات گذر گئی۔ اُس وقت رائے سنتھرہ نے سب کے سامنے خون کی قے کی۔ وہ یہ دیکھ کر ڈر گئے اور سمجھے کہ اب اس کا اخیر وقت ہے۔ ایک شخص نے اس سے دریافت کیا "آپ کی آخری آرزو کیا ہے؟ بیان کیجئے ابھی پوری کی جائے"۔ رائے نے مریضوں کی سی آواز بنا کر جواب دیا۔ اب دنیا میں میری آرزو بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ اپنے اہل برادری کو ایک نظر دیکھ لوں اور وصیت بھی کردوں"۔

نوکروں نے اس پر تامل کیا اور کہا کہ بادشاہ سلامت نے لنگاہوں کو کبھی محل میں نہیں آنے دیا۔ اُن کی اجازت کے بغیر ہم ایسا نہیں کرسکتے۔ ایک نوکر بادشاہ سے اجازت حاصل کرنے کے لئے گیا۔ لیکن آدھی رات کا وقت تھا اور وہ سو رہا تھا پاسبان نے اس کو بیدار کرکے رائے سنتھرہ کی حالت سے مطلع کیا۔ شیخ یوسف نے یہ سن کر بہت افسوس کیا اور فوراً لنگاہوں کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد پھر آرام سے سو گیا۔

( ۷ )

جب لنگاہ محل میں آ گئے تو رائے سنتھرہ بستر سے اُٹھا اور محل کے ہر دروازہ پر ایک ایک آدمی کو متعین کیا۔ اور نہایت سختی سے حکم دیا کہ کسی کو محل سے باہر نہ جانے دیا جائے۔ یہ حال دیکھ کر شیخ یوسف کے آدمی بہت سراسیمہ اور پریشان ہوئے اور اِدھر اُدھر بھاگنے لگے مگر لنگاہوں نے سب کو قید کرلیا اور جس نے مقابلہ کرنے کی کوشش کی اس کو قتل کردیا۔ تلواروں کی جھنکار اور شور و غل سُن کر شیخ یوسف خواب غفلت سے بیدار ہوا اور سمجھا کہ غنیم شہر پر چڑھ آیا ہے۔ یہ خیال کرکے وہ بھاگنے لگا مگر دروازوں پر چوکیداروں نے اس کو روکا اور گرفتار کرلیا۔ صبح کو سارے شہر میں یہ خبر مشہور ہوگئی۔ رائے سنتھرہ نے شیخ یوسف کو معزول کیا اور خود سلطان قطب الدین کے لقب سے خطبہ اور سکہ رائج کیا۔

احمد (سہاوہ) از میرٹھ

# غزل

قفس میں شکوۂ گلچیں نہ کچھ رنجِ خزاں ہوگا
چمن ہی تک ملالِ جورِ برقِ بے اماں ہوگا

کمالِ ضبطِ غم سے جس گھڑی آنسو رواں ہوگا
چھپانے پر بھی رازِ دل نگاہوں سے عیاں ہوگا

چمن کے ہیں یہ تنکے فصلِ گل میں رنگ لائیں گے
قفس کی تیلیوں سے پھر وجودِ آشیاں ہوگا

جہانِ آب و گل سے چھوٹ کر پھر کش مکش کیوں ہو
زمیں زیرِ قدم ہوگی نہ سر پر آسماں ہوگا

اسی باعث جفائیں ان کی ہم سہتے رہے مضطر
کہ غم اُن کی محبت کا سکونِ جاوداں ہوگا

عمر علی صدیقی مضطر
متعلم فرسٹ ایر کلاس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

# مطالعۂ شاعری

یہ سوال تو الگ بحث کا محتاج ہو کہ ہماری موجودہ اُردو شاعری غیر زبانوں کی شاعری کے سامنے کچھ وقعت بھی رکھتی ہو یا نہیں ؟ مگر چوں کہ یہاں شاعری سے بحث کرنا ہو اس لئے اس سے قطع نظر کر کے ہم اجمالاً شاعری کو لیتے ہیں ۔

شاعری کی ابتدا بنی نوع انسان کی تخلیق کے ساتھ ساتھ ہوئی ' جیسے جیسے یہ وحشی انسان متمدّن ہوتا گیا ساتھ ہی ساتھ اس کی شاعری بھی ترقی کرتی گئی ۔ یہ ایک فطرتی بات ہو کہ انسان جب دن بھر کی جفاکشی کے بعد گھر کو لوٹتا ہے تو وہ کچھ لمحہ کے لئے دماغی سکون اور آرام کا متلاشی ہوتا ہو اس کے کان میٹھی آواز کے منتظر رہتے ہیں یہی وہ دور ہو جس کے زیر اثر شاعری بھی نغمہ کی آغوش میں پرورش پاتی رہتی ہو ۔ دل لگی اور بے فکری کے لئے وہ موسیقی توانین سے دور ہٹ کر جس سُر میں چاہتا ہو الاپتا ہو ۔ وہ اکثر کسی اونچے ٹیلہ پر بیٹھ کر ایک راگ چھیڑ دیتا ہو یا بانسری لے کر دل کش آواز کے ساتھ ساتھ جھومتا رہتا ہو ۔ جس سے آس پاس کے لوگ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے اور پھر رفتہ رفتہ یہی پُرجوش یا میٹھی آوازیں کسی خاص واقعہ یا ذکر کے ساتھ ساتھ شاعری میں منتقل ہوگئیں یہ بھی ایک عجیب دلچسپ معمّہ ہو کہ ہر ملک اور ہر قوم کی شاعری زمانۂ جاہلیت میں بامِ ترقی پر پہنچی ۔ مثال کے طور پر شیکسپیر اور امراالقیس کو دیکھو ۔ مشاہدہ سے ایسا معلوم ہوتا ہو کہ یہ فطرتی عکس جو سادہ مزاج لوگوں پر پڑا ' انسانی ہاتھوں کی نقاشی سے یا یہ کہو کہ بناوٹ سے دھندلا ہوتا گیا ۔ اصلی شاعری وہ ہو جس کو سُن کر رنج و غم ' افسوس ' غصّہ یا وقتی مسرت پیدا ہو جائے ۔ یہی وہ اثر ہیں جنھوں نے شاعری کے تحت میں سینکڑوں حیرت انگیز واقعات دنیا کو کر دکھائے

مولانا حالی اپنی کتاب مقدمۂ "شعر و شاعری" میں لکھتے ہیں کہ "یہ بات تسلیم کی گئی ہو کہ شاعری اکتساب سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ جس میں شاعری کا مادّہ ہوتا ہو وہی شاعر بنتا ہو ۔ شاعری کی سب سے پہلی علامت موزونیِ طبع سمجھی جاتی ہو اکثر دیکھا گیا ہو کہ جو اشعار بعضے فاضلوں سے موزوں نہیں پڑھے جاتے اُن کو بعض اَن پڑھ اور صغیر سن بچے بلا تکلف موزوں پڑھ دیتے ہیں" ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہو کہ شاعری ایک قدرتی تحفہ ہو اس میں شک

نہیں کہ بعض لوگ ادھر اُدھر سے کچھ خیالات جمع کرکے اشعار میں ظاہر کرتے ہیں مگر اس کی مثال اس چشمہ کی طرح ہے جس کا شفاف پانی اوپر سے کسی زمین پر گرتے ہی گدلا بن جاتا ہے۔ اس کو تم پانی ضرور کہو گے مگر دیکھتے ہی طبیعت پھر جائے گی۔

اس کے بعد تم شاعری کا دوسرا رخ بھی دیکھو۔ اس میں قوت اور فن لطیف کے عناصر بھی موجود ہیں۔ اول الذکر کی مثال انگلستان کی شاعری اور موخرالذکر کے شاہد یونان اور روما ہیں۔ شاعری کی قوت والٹر اسکاٹ اور ہوگو (Hugo) فرانسیسی سے پوچھو۔ یہ دونوں اشخاص خیالات میں ایک ہیجان پیدا کردیتے ہیں اور خیالات کو جنگی ترانوں سے پُر کردیتے ہیں۔ پڑھتے ہی ایک ہمت اور جواں مردی کی لہر سارے جسم میں دوڑ جاتی ہے مینائیل انجلو بیانا اور بت تراش بھی شاعری کی مدد کے بغیر ایک لکیر نہ کھینچ سکا۔ قدیم یونانی علم الاصنام بھی شاعری کے زیر نگیں ہے۔ فردوسی ایرانی داستان شاعری کی زبان میں سناتا ہے اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ایرانی قوم کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔

شاعری کیا ہے؟ ارسطو کے نزدیک "فطرتی رموز کی نقاشی ہے" اور افلاطون کے خیال میں "انسانی خوابوں کی تصویر کھینچنا ہے" ورڈس ورتھ اس سے زیادہ سہل اور عام فہم انداز میں کہتا ہے کہ "شاعری وہ ہے جو ایک دل سے نکلے اور دوسرے دل میں جاکر ٹھہرے" اس کے علاوہ بعض علما نے اس کی تشریح یوں کی ہے:-

(۱) انسان تمام تفکرات سے آزاد ہو کر کچھ لمحہ کے لئے بچہ بن جائے۔

(۲) شاعری کی قوت ظاہر کرنے کے لئے جانباز اکیلیز (Achilles) اور ذریعۂ معاش کی تلاش میں شکسپیر یا درباری لباس میں چوسر (Chauser) نظر آئے۔

(۳) ہمدردی اور آہ کے فرشتے خواب کی دنیا میں لے جاکر سیر کرائیں اور وہاں سچی مسرت اور آزادی قدم قدم پر لبیک پکار اٹھیں۔

جس طرح تم بادل کے رنگ، خوشبو اور لہروں کے ناچ نہیں پکڑ سکتے اسی طرح تم میں جب تک جذبات اور روح کے اثرات قبول کرنے کی کیفیت نہیں شاعر نہیں بن سکتے۔ بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ جس طرح تم کسی انسان سے محبت قصداً نہیں کرتے وہ ہو جاتی ہے اسی طرح تم قدرتاً شاعر ہو سکتے ہو اکتساب سے بالکل ناممکن ہے۔

شکسپیر کے ڈرامے جن سے اہل انگلستان سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی تعلیم حاصل کر چکے اور کر رہے ہیں۔

شاعری کا ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ میموں بن قیس جو اعشیٰ کے نام سے مشہور عربی شاعر گذرا ہے۔ اس کا کمال یہ تھا کہ جس کی مدح یا ہجو کرتا ہے عوام پر ویسا ہی اثر پڑتا ہے۔ ایک مرتبہ کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ ایک عورت اُس کے پاس آئی اور کہا کہ اے اعشیٰ میری کئی لڑکیاں ہیں مگر افسوس کہ اُن کو بر نہیں ملتا۔ کیا ہی بہتر ہو اگر تو اُن کی تعریف میں کچھ اشعار لکھ دے جن میں اُن کے اچھے خصائل اور حُسن کا ذکر ہو۔ اعشیٰ نے دوسرے دن کچھ اشعار لکھ دئے نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد ان لڑکیوں کی شہرت سارے عرب میں پھیل گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اُن کی شادیاں بھی ہو گئیں۔ زیورات بھی خوب ملے اور مانگی مراد بر آئی۔ لڑکیوں کی ماں نے اعشیٰ کے پاس شکریہ کے طور پر کئی اونٹ بھیجدئے اس کے علاوہ اور بھی سینکڑوں واقعات شاعری کے اثر کو روشن کئے ہوئے ہیں۔

شاعری نے اخلاقیات کا جامہ پہن کر کم عرصہ میں ایسی ایسی تعلیم دی ہے جو ایک صدی کی چیخ پکار میں بھی ناممکن تھی۔ اس رنگ میں سعدی اور تلسی داس خاص طور پر مشہور ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ شاعری روپ بدل بدل کر زندگی کے ہر شعبہ میں آئی اور اپنی اداؤں سے ہر سنگدل کو موم بناتی گئی پھر جونسا کام چاہا لے لیا۔ اس کو دیکھ کر سانچہ کا مفہوم بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے۔ بائرن کی نظم موسوم بہ "چائلڈ ہیرلڈ پلگریمیج" کے رنگ میں آئی جس میں یونان کو ترکوں کی اطاعت کے خلاف برانگیختہ کیا اور کہا کہ تمہارے علم و فن سے فرانس اور انگلستان کے خزانے آباد ہیں مگر تم کو کیا اجرت ملی؟ اور ادھر روس سے یہ کہا کہ "گریک چرچ کا تم تو بھرتے ہو مگر یونان کے لئے کیا ایثار کیا؟ اس کا اثر یہ ہوا کہ جب یونانیوں نے ترکوں کے خلاف سر اٹھایا تو فرانس انگلستان اور روس وقت پر اپنی اپنی قوت لے کر پہنچ گئے۔ بالآخر ۱۸۲۷ء میں ترکوں کو شکست ہوئی۔ اور اس کے بعد یونانی پارلیمنٹ قائم ہوئی۔ تم اگر کچھ لمحہ کے لئے نہایت اطمینان سے شاعری کے کارناموں کا مطالعہ کرو گے تو تم کو رنگ برنگ کے جلوے نظر آئیں گے کسی نے سچ کہا ہے:۔

گلشنِ شاعر بہارستانِ حُسنِ پردہ پوش
منظرِ خونی جہاں کا لالہ زارِ شاعری

(راقم سید اختر امام جماعت یازدہم انٹرمیجیٹ کالج علی گڑھ)

# سوگوارِ حُسن

تیری میت پہ کھڑا روتا ہے مغموم تجھے — یاد کرتا ہے کوئی طفلکِ معصوم تجھے
اشک بہتے ہیں نگاہوں سے عیاں جوشِ الم — پھوٹی آنکھوں سے ٹپک پڑتی ہے کیفیتِ غم
بال بکھرے پڑے پیشانی پہ لہراتے ہیں — مجھ کو بیتاب کئے دیتے ہیں تڑپاتے ہیں
گورے گورے سے عذاروں کو بھگونے کے لئے — اشک پر اشک چلے آتے ہیں دھونے کے لئے
ہچکی رکتی نہیں بے کل ہوا جاتا ہے کوئی — لمحے لمحے میں نیا رنگ دکھاتا ہے کوئی
زرد ہو جاتے ہیں عارض کبھی ذوقِ غم سے — سُرخ ہو جاتے ہیں رخسار کبھی ماتم سے
کس قدر جوش میں بے تاب ہوا جاتا ہے — پھول سے گالوں پہ اک رنگ سا آجاتا ہے
تاب آجاتی ہے رخسار پہ غم جھیلنے سے — حُسن بڑھ جاتا ہے احساس کے بڑھ جانے سے
عین راحت ہے یہ ہنگامۂ آلام اُسے — کسی پہلو نہیں آنے کا اب آرام اُسے

چاک دامن ہے نہیں ہوش کچھ اپنا اُس کو
آج موہوم نظر آتی ہے دُنیا اُس کو

حُسن اور سختیٔ فطرت کے اُٹھانے کے لئے — کاش آنکھیں ہی نہ ہوتیں یہ دکھانے کے لئے
کاش پیدا ہی نہ ہوتی نگہِ ہوش کہ آج — دیکھتا میں کسی معصوم کو افسردہ مزاج
کاش دے دیتیں نگاہیں مری دھوکا مجھ کو — کاش آتا نہ نظر اُف یہ نظارا مجھ کو
پہلے ہی دیکھنے سے کاش کہ مرجاتا میں — ہائے اس عالمِ پُرغم سے گذر جاتا میں
کاش پیدا نہ ہوا ہوتا میں اس دن کے لئے — دیکھتا کاش نہ آلام میں اس سن کے لئے
ایسا کرنے کا اگر وجہ و سبب اور ہی تھا — کس کو تفویض کیا جاتا یہ غم دنیا کا

٩

چھانٹ رکھا تھا مجھے حق نے رلانے کے لئے
میری تخلیق ہی تھی رنج اٹھانے کے لئے

آہ تڑپائے گا اک عمر یہ رونا تیرا
یاد آئے گا مجھے جان کو کھونا تیرا

بجلیاں توڑ چکیں میری نگاہیں تجھ پر
کوہِ غم توڑے گی اب میرے تصور کی نظر

زرد صورت تری جب قلب کو یاد آئے گی
روح اک کیفِ غم آلود میں کھو جائے گی

میں بھی لوٹ اٹھوں گا تیرے دلِ بے تاب کے ساتھ
آہ چاندی بھی تڑپ اٹھے گی سیماب کے ساتھ

بزمِ احباب ہو یا گوشۂ تنہائی ہو
شغلِ عزلت کا ہو یا انجمن آرائی ہو

کوہ ہو دشت ہو صحرا ہو کہ ہو صحنِ چمن
شامِ غربت ہو کہ ہو صبحِ دل افروزِ وطن

تیری حسرت سے نہیں میری رہائی ممکن
تیری صورت سے نہیں میری جدائی ممکن

کھینچ دیتی ہیں نگاہیں مری اب بھی وہ سماں
ہائے وہ میتِ بر دوش پہ غم کا طوفاں

نور کے تار میں اشکوں کا پرونا تیرا
ہائے وہ تربتِ خاموش پہ رونا تیرا

میری آنکھوں میں ہے وہ حسن وہ جلوہ تیرا
ہائے کملایا ہوا پھول سا چہرہ تیرا

تیری تصویر کے نزدیک میں جھک جاتا ہوں
دیکھتے دیکھتے یکبارگی رک جاتا ہوں

جوڑ کر ہاتھ ترے سامنے رو دیتا ہوں
گریۂ غم سے فضا ساری بھگو دیتا ہوں

پھونک دیتا ہوں جہاں اک نگہِ سوز کے ساتھ
چیر دیتا ہوں فلک آہِ فلک دوز کے ساتھ

حکیم ماجد حامدی

# چیونٹی

کیسا غریب بے زبان جانور ہو۔ سارے دن اپنی روزی کی جستجو میں اپنا سینہ زمین پر رگڑتی ہو صبر و تحمل عزم و استقلال، عجز و انکسار اس پر ختم ہیں۔ اگر میں اس پر اپنا پیر رکھ دوں تو جان دینا پسند کرے گی مگر اُف نہیں کرے گی۔ روزانہ ہزارہا چیونٹیاں آدمی کی بے دردی اور بے پروائی کی نذر ہو جاتی ہیں لیکن ان کی طرف سے صدائے احتجاج نہیں بلند ہوتی۔

انسان کیسا خود پسند اور ناتواں بیں واقع ہوا ہو کہ اپنے آپ کو اشرف المخلوقات خیال کرتا ہو اور اپنی عقل و حکمت کے مقابلہ میں دیگر مخلوقات کے کمالات کی قدر نہیں کرتا اور اُن کو حقیر سمجھتا ہے حالانکہ اُن میں سے اکثر بعض حیثیت سے اس سے برتر ہیں۔ اگر وہ صرف اس ذلیل چیونٹی ہی پر غور کرے تو اس کو معلوم ہو جائے گا کہ اپنی نسبت یہ رائے قائم کرنے میں اُس نے تعصب خود ستائی اور ناواقفیت سے کام لیا ہو ورنہ جسمانی قوت ہوشیاری اور تنظیم کے لحاظ سے چیونٹی اس سے افضل ہو۔

چیونٹیوں کی فہم و ادراک، دوربینی و دوراندیشی کے دشمن بھی قائل ہیں۔ وہ بہت فاصلہ سے اپنی خوراک کی بو سونگھ لیتی ہیں اور وہاں پہونچ جاتی ہیں۔ راستہ میں اگر رکاوٹیں پیش آتی ہیں تو بڑی تدبیروں سے اُن کو رفع کرتی ہیں۔ خزاں اور برسات کے لئے موسم گرما کے لئے خوراک کا ذخیرہ جمع کر لیتی ہیں۔ اُن کی یادداشت اور قوت حافظہ ایسی زبردست ہوتی ہو کہ جس راستہ پر ایک مرتبہ چلی ہوں اس کو خواہ وہ کتنا ہی پیچیدہ ہو کبھی نہیں بھولتیں۔

اُن کا نظم و نسق آدمیوں کا سا ہو وہ چار جماعتوں میں منقسم ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ نجار چیونٹیاں۔ کشتکار چیونٹیاں۔ عسلی چیونٹیاں اور خوراکی چیونٹیاں۔ ہر چیونٹی کمال سرگرمی۔ جانفشانی اور ایمانداری سے اپنا فرض ادا کرتی ہو۔ ان میں نر اور مادہ دونوں شامل ہیں۔ مادہ انڈے دیتی ہو اور نر اُن کی حفاظت کرتا ہے معلق چیونٹیاں سپاہی اور مزدور کی خدمات انجام دیتی ہیں۔ انسان کے برخلاف ان میں کاہلی اور غفلت کا مادہ نہیں پایا جاتا۔

سب جانتے ہیں کہ چیونٹی اپنے سے اتنا زیادہ بوجھ اٹھاتی ہو کہ آدمی اس کو کبھی نہیں برداشت کرسکتا ایک ماہر حیوانات نے تخمینہ لگایا ہو کہ ایک معمولی چیونٹی اپنے سے تین ہزار گنا وزن لے جاسکتی ہو گویا اگر آدمی میں بھی اسی نسبت سے طاقت موجود ہو تو وہ تقریباً دو سو چھپتر ٹن اٹھائے جو قطعاً غیر ممکن ہو بعض چیونٹیاں بڑی بڑی چیزوں کو ادھر سے ادھر کردیتی ہیں۔

امریکہ میں ایک ایسی چیونٹی پائی جاتی ہو جو کیڑوں کا شکار کرتی ہو۔ اور پودوں سے بیج جمع کرکے زراعت کرتی ہے۔

چیونٹی کو جو تعمیر میں اس قدر مہارت ہو کہ آدمی اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا بعض اقسام کی چیونٹیاں میں بیس فیٹ کی بلندی پر مکان بناتی ہیں۔ چیونٹی خود ½ انچ لانبی ہوتی ہو گویا وہ اپنے سے دو ہزار گنی بلندی پر بغیر کسی آلہ کی مدد کے عمارت بنا سکتی ہو۔ اور خوراک لے جاسکتی ہے۔ حالاں کہ اہل مصر پانسو فیٹ سے زیادہ اہرام نہیں بنا سکے جو ان کی قامت سے صرف اسی حصہ زیادہ ہیں۔ تاہم وہ عجائبات عالم میں شمار کئے جاتے ہیں

یہ چیونٹی کے بہت مختصر حالات ہیں۔ بڑی بڑی کتابوں سے مفصل کیفیت معلوم کی جاسکتی ہو جو نہایت حیرت انگیز ہے۔ کیا اب بھی یہ امر پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچا کہ آدمی ترقی کے میدان میں بعض نقطۂ نظر میں چیونٹی ہی کبھی پیچھے ہے۔ اس کو چاہیئے کہ چیونٹی کو ذلیل اور فرومایہ خیال کرنے کے بجائے اُس سے کوئی مفید مطلب سبق حاصل کرے ؎

میازار مورے کہ دانہ کش است
کہ جاں دارد و جانِ شیریں خوش است

احمد (دمراوہ) ازمیرٹھ

## غزل حزین اصفهانی

دل گواه ست که در پرده دل آرائے ہست
ہستیِ قطره دلیل ست که دریائے ہست

گر غرورت نه کشد کلفتِ هم صحبتیم
نگہِ عجز مرا عرضِ تمنائے ہست

نبود لایقِ حسن ایں همه بے پروائی
دادِ دل از نتواں داد مدارائے ہست

نم خونے بدلم مانده خمارے بشکن
از شرابِ کہن ایں خانهٔ مینائے ہست

حسن بے پرده زغمازیِ عشق ست حزیں
شورِ مجنوں همه جا گفته که لیلائے ہست

## غزل اظہر علی - آزاد

نقشِ پا نیست دریں راه اگر پائے ہست
انجمن ہست اگر - انجمن آرائے ہست

آرزوہا ست که تا حشر به پایاں نرسند
تا دلِ سوخته ہست - تمنائے ہست

تا کجا دیده ما بندی و لب ہا بندی
تا دریں بزم توئی ، ذوقِ تماشائے ہست

حسن آزاد دلِ سوخته ہر جا محبوب
زاں که غارت گرِ دیں نرگسِ شہلائے ہست

چیست اے ماه بگو داغِ غمت نیست اگر
ہر کجا ہست دلے نقشِ سویدائے ہست

بحر و بر آئینهٔ حسنِ کمالِ یار ست
ہر کجا میروم آں شوخ خود آرائے ہست

پرده بر روئے تو افتاد که از روئے فتاد
ہمچو آزاد دلِ سوخته ہر جائے ہست

فقیر آزاد

# انقلابِ روس

از منشی غفران احمد صاحب (علیگ) سرادہ

انقلاب کیسا خوفناک لفظ ہے! محض اس کے خیال ہی سے تمام بدن میں سنسنی پیدا ہو جاتی ہے سینکڑوں آدمی اس کے نتائج کو دیکھ کر اس کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں مگر کیسی عجیب بات ہے کہ "انقلاب پسندوں" میں سب سے پیش پیش وہی رہتے ہیں۔ انگلستان پر کیا گذری؟ لوئی شانزدہم کو کس نے تختۂ دار پر لٹکایا؟ نکولس ثانی زارِ روس سے کس نے تخت و تاج چھڑوایا؟ سلطان عبدالحمید کو کس نے ملک بدر کرایا؟ قیصر ولیم کو کس نے دربدر پھرایا؟ اسی انقلاب نے! کجکلاہِ ایران نے فرانس میں کیوں خاک چھانی؟ خاقانِ چین نے کیوں چین کو چھوڑا؟ اسی انقلاب کی بدولت۔ تاریخ کے ان خونیں مناظر سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے "انقلاب زندہ باد" کے نعرہ لگانا اور اسی کی آرزو کرنا نادانی نہیں تو اور کیا ہے؟ یقیناً اس لفظ میں کوئی ایسی کشش موجود ہے جو سب کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فطرۃً انسان "تبدیلی پسند" واقع ہوا ہے اور ایک حالت پر قائم رہنا اس کی طبیعت کے خلاف ہے۔ تاریخِ عالم اس بات کی شاہد ہے کہ ہر قوم اور ملک کو اپنی زندگی میں ترقی کی شاہراہ "انقلاب" جیسی دشوار گزار اور کٹھن منزل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس تباہی یا ترقی کا سبب انسان کی "انقلاب پسندی" ہے۔ اور بس۔

انقلاب فرانس کی طرح انقلاب روس بھی نہایت اہم اور معنی خیز نتائج کا حامل ہے۔ جیسے انقلاب فرانس نے ۱۷۸۹ء میں تمام مہذب ممالک میں ہلچل ڈالدی تھی اسی طرح انقلابِ روس بھی سوا سو سال کے بعد ۱۹۱۷ء میں دنیا کے لئے ایک نیا پیام لایا۔ اس مضمون میں انقلاب روس کے اسباب یا نتائج سے بحث نہیں کرونگا بلکہ زمانۂ انقلاب کے واقعات کو قلمبند کرونگا مگر اسی ضمن میں یہ بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ تمام انقلابی تحریکات کی ذمہ داری پطرس اعظم اور سکندرِ ثانی پر عاید ہوتی ہے جن کی انتظامی اصلاحات نے جو جمہوری رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں روسیوں میں سیاسی اور معاشرتی ترقی اور مذہبی فلاح کی امید پیدا کر دی اور یہی آیندہ بہبودی کا احساس ہمیشہ انقلاب کا باعث ہوتا ہے۔

سکندرِ ثانی کی اصلاحات کے نفاذ کیوقت ہی دوربین مدبرانِ سلطنت نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ آیندہ کیا پیش آنیوالا ہے۔ اگر سکندر سوئم اپنے ماسبق کی روش پر چلتا تو یورپ کے سیاست دانوں کے متفقہ خیال کے مطابق روس اس دشوار گزار

منزل سے نہایت امن اور چین کیساتھ گزر جاتا مگر جو انگلستان پر گذر چکا تھا جس خونیں منظر کا نظارہ فرانس بخوبی کر چکا تھا اسی مصیبت سے روس کو بھی دوچار ہونا پڑا۔

اپنے قتل سے دس روز پیشتر سکندر ثانی نے ۳ مارچ ۱۸۶۱ء کو ایک اہم اعلان شائع کیا جس کی رو سے غریب مصیبت زدہ کاشتکاروں کو طوقِ غلامی سے کسی حد تک نجات ملی۔ اس وقت تک وہ زمیندار کی ملکیت تھے اور زمین کے ساتھ منتقل ہوتے رہتے تھے اور کوئی چیز ان کی "اپنی" نہ تھی۔ اب تمام عمر میں پہلی مرتبہ انھوں نے آزاد ہوا میں سانس لی اور پہلی مرتبہ یہ محسوس کیا کہ واقعی ان کے لئے بھی دنیا میں کوئی جگہ ہے اور ان کی بھی کوئی "اپنی" جدا ہستی ہے۔ ۱۸۵۹ء میں جب سکندر ثانی سریر آرائے سلطنت تھا حکومت زار نے مقامی حکومت (Local Government) کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کا اعلان کیا مگر اس کی بنیاد ۱۸۶۴ء میں سکندر سوئم کے ہاتھوں پڑی۔ اس قانون کے ماتحت مملکت روس کے ہر ضلع اور ہر صوبہ میں جمہور کی ایک نمائندہ کونسل اور ایک مرکزی کونسل قائم ہوئی۔ زراعت۔ سڑکوں۔ شفاخانوں اور اسکولوں کی نگرانی ان کونسلوں یا زمسٹوں (Zemstvos) کے سپرد تھی تعلیم کو قبولِ عام کرنے کے لئے ابتدائی اور ثانوی درجوں کی تعلیم ختم کرلینے والوں کو جبریہ فوجی تعلیم سے مستثنیٰ قرار دیا۔ حکومت کی ان چند اصلاحات نے قدامت پسند کسانوں اور تعلیم یافتہ طبقہ میں ایک زبردست ہیجان پیدا کر دیا۔ ان شاہی "مراعات" کی پیدا کردہ انقلابی تحریکات ۱۹۰۵ء کے انقلاب کی صورت میں نمودار ہوئیں جو ۱۹۱۷ء کے فیصلہ کن انقلاب کا پیش خیمہ تھا۔ زمسٹوں کے منتخب شدہ اراکین میں اکثریت آزادی خواہوں اور انقلاب کے حامیوں کی تھی جس سے حکومت کی مطلق العنانی کو صدمہ پہنچا اور زار روس کو محسوس ہوا کہ اس کے اختیارات محدود ہو گئے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ حکومت کی "اصلاحات کے خلاف حکمت عملی" کی صورت میں ظاہر ہوا۔ زمسٹوں کے اختیارات بہت کچھ کم کر دیئے گئے اور اضلاع کے افسروں اور صوبوں کے گورنروں کو ان کا محتسب مقرر کیا گیا۔ ۱۸۸۰ء میں فرانس کے ضابطۂ گلڈ کی طرح روس میں بھی ایک قانون نافذ ہوا جس کی رو سے باورچی۔ دھوبی۔ معمولی دکاندار اور دوسرے شاگرد پیشہ لوگوں کے بچے اپنے بزرگوں کے پیشہ کو کسی حالت میں نہیں چھوڑ سکتے تھے بلکہ قدیم ہندو ذاتوں کی طرح اپنے آبائی پیشہ پر قناعت کرنے پر مجبور تھے۔ غرض جب اہل روس ہر طرف سے مجبور ہو گئے اور ان کی ہر قسم کی آزادی سلب کرلی گئی تو ان میں انقلابی تحریکات نے زور پکڑا جاپان کے مقابلہ میں روس کی شکست نے آگ پر تیل کا کام دیا۔ رعایا حکومت سے بدظن ہوگئی اور ۱۹۰۵ء میں دفعتاً تمام ملک میں

حکومت کے خلاف شورش کی آگ بھڑک اٹھی۔ سنہ ۱۹۰۳ء بالشویکوں کے قائد اعظم اور بالشویزم کے روح رواں لینن نے ایک خفیہ انجمن "بالشویک کانگریس" کی بنیاد ڈالی جس کا پہلا تاریخی جلسہ "مجلس حزب العمال روس" کے نام سے پیٹرو گریڈ میں سنہ ۱۹۰۵ء میں منعقد ہوا۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں بالشویک جماعت نے "انجمن آزادی" قائم کی جس کا نصب العین روس کو موجودہ شخصی حکومت سے نجات دلا کر جمہوری سلطنت قائم کرنا تھا۔ چونکہ اس وقت بالشویک جماعت برسرِ اقتدار تھی اس لئے اس انجمن کی شاخیں جلد ہی تمام اطراف میں پھیل گئیں۔ انکا کام ملک کو آنیوالے انقلاب کیلئے منظم کرنا تھا۔

جون سنہ ۱۹۰۴ء سے سیاسی قتل۔ اسٹرائک اور انقلابی جلوس کا زبردست سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۵ جون سنہ ۱۹۰۴ء کو فن لینڈ کا گورنر جنرل باب ریکو۔ گولی سے مار دیا گیا۔ ۲۹ جولائی سنہ ۱۹۰۴ء ماسکو یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے وزیر داخلہ وان پلیہو کو بم سے اڑا دیا۔ درحقیقت یہ قتل حکومت کی ۲۰۰ طالبعلموں کو گرفتار کرنیکی دھمکی کا جواب تھا۔ نومبر سنہ ۱۹۰۴ء میں باوجود حکومت کے امتناعی احکام کے ایک زبردست زمسٹو کانفرنس ہوئی جس میں حکومت کی حکمت عملی سے بیزاری اور نفرت کا اظہار کیا گیا۔ اسی کانفرنس کی طرف سے ۲۲ نومبر سنہ ۱۹۰۴ء کو ایک اہم اعلان شائع ہوا جسمیں حکومت سے آزادی زمسٹو اور تمام روس میں خود مختار مقامی حکومتیں قائم کرنیکا مطالبہ کیا گیا۔ حکومت نے بہت سی باتوں کو منظور کر لیا مگر دو روز بعد ۲۵ دسمبر سنہ ۱۹۰۴ء کو ایک شاہی اعلان شائع ہوا جسمیں تمام مطالبات کو مفسدانہ اور ممبران زمسٹو کو ملک اور قوم کا مجرم گردانا گیا۔ سیاسی جلسوں کو ممنوع اور تمام غیر سرکاری انجمنوں کو خلاف قانون قرار دیا گیا۔ اوائلِ ماہ جنوری سنہ ۱۹۰۵ء میں مزدوروں نے کارخانہ داروں سے کم کام۔ زیادہ اُجرت اور بہتر برتاؤ کا مطالبہ کیا مگر قبول نہونے پر تیرہ ہزار مزدوروں نے اسٹرائک کر دیا اور ایک نہایت پُرامن جلوس کی شکل میں ۲۲ جنوری سنہ ۱۹۰۵ء کو بادشاہ کے حضور میں عرض معروض کرنے چلے۔ شاہی فوج نے بغیر کسی خطا کے غریب بیکس مزدور مرد اور عورتوں پر آزادانہ گولی چلائی۔ پانچسو خانماں برباد لاچار و مظلوم مرد۔ عورتیں۔ اور معصوم بچے زار روس کے ظلم اور بہیمیت کے بھینٹ چڑھے۔ سینکڑوں بے گناہ شیر خوار بچوں نے اپنی تڑپتی ہوئی ماؤں کی گودیوں میں سسک سسک کر جان دی۔ ان معصوموں کا خون رنگ لائے بغیر نہ رہا۔ جن لوگوں نے ان شہیدوں کا لہو پیٹرو گریڈ کی سڑکوں پر بہتا دیکھا تھا انہی نے روس کے شاہی خاندان کی تباہی اور بربادی کا حسرتناک منظر بھی دیکھا۔ اس خوفناک انسانیت سوز قتل عام نے تمام ملک میں ایک آگ لگا دی۔ مسلح بغاوت کے آثار نمایاں ہونے لگے اور سینکڑوں پولس افسر

برانگیختہ عوام کے جذبۂ انتقام کی نذر ہوئے۔ گرانڈ ڈیوک سرجیس گورنر جنرل ماسکو کو کریملن (روسی پارلیمنٹ ہاؤس) میں بم سے اڑا دیا گیا۔ تمام ملک میں بغاوت کی آگ پھیل گئی ہر جگہ قتل و غارت کی وارداتیں شروع ہو گئیں۔ اسٹرائک کا سلسلہ پھر جاری ہو گیا یہاں تک کہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو تمام روس میں ہر قسم کے کاروبار قطعی طور پر بند تھے۔ تلغراف۔ ڈاک ٹیلیفون کا سلسلہ بالکل منقطع ہو گیا، ریل گاڑیاں بند ہو گئیں مزدوروں نے کارخانوں میں کام کرنے سے انکار کر دیا، تمام پیشہ وروں نے اپنے اپنے پیشہ ترک کر دئیے، اخبارات بند ہو گئے یہاں تک کہ تمام بڑے شہروں میں پانی کی نہایت قلت تھی رات کے وقت بالکل اندھیرا رہتا تھا۔ بالآخر حکومت کو جمہور کی متفقہ آواز کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا اور ۳۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو ایک سرکاری اعلان شائع ہوا جس کی رو سے ایک پارلیمنٹ (ڈیوما) قائم ہوئی جس کو اختیارات قانون سازی تفویض کئے گئے اور یہ پارلیمنٹ جمہور کے منتخب شدہ ممبران پر مشتمل تھی۔ زمستوں کے مطالبات خود انتظامی منظور کئے گئے اس طرح ۱۹۰۵ء کے انقلاب کا خاتمہ ہوا۔ ہر روسی نہایت ہی مسرور تھا، گھر گھر خوشیاں منائی جا رہی تھیں اور ہر شخص کو یہی امید تھی کہ آرام و چین کا زمانہ شروع ہونے والا ہے۔ مگر بدقسمت روس کو ابھی ایک اور کٹھن منزل طے کرنی تھی یعنی

## انقلاب ۱۹۱۷ء

یہ انقلاب کیوں پیش آیا؟ کیونکہ حکومت نے پھر وہی قوت حاصل کر لی جو اس کو ۱۹۰۲ء میں حاصل تھی انقلابی جماعتوں کا شیرازہ منتشر ہو گیا، بالشویک اور مالشویک ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو گئے اور ان قومی رہنماؤں کے آپس کے تنازعات کو دیکھ کر ملک کو ان پر اعتبار نہ رہا دوسرے جمہور میں حکومت کے خلاف دوسری شورش پیدا کرنیکی قوت نہیں رہی۔ دوسری "کوشش" کو کامیاب بنانے کے لئے یہ نہایت ضروری تھا کہ ملک میں محض ایک جماعت ہی قوم کی رہنمائی کرے مگر اس بات کے لئے روس کو بارہ سال کی طویل مدت گزارنی پڑی جس کے بعد بالشویک جماعت ۱۹۱۷ء میں حکومت وقت کو شکست دینے میں کامیاب ہوئی۔ اس انقلاب کے فوراً بعد ہی حکومت نے تشدد کو اپنی حکمت عملی قرار دیا اور کھوئے ہوئے اقتدار کو واپس لینا اپنا نصب العین ٹھیرایا۔ طالبعلموں اور نہتے کسانوں سے نہایت پُرغضب انتقام کا آغاز ہوا۔ روس کی تاریخ میں یہ بارہ سال کی مدت نہایت ابتری کا زمانہ ہے، نہ کوئی ضابطہ تھا نہ قانون جس کسی پر انقلاب پسند ہونیکا شبہ بھی ہوتا تھا اس کے لئے تین سزاؤں میں سے ایک لازمی تھی، جلاوطنی۔ قید۔ یا سزائے موت۔ حکومت کے انتہائی تشدد اور ظلم کا تھوڑا سا اندازہ شاید اس بات سے

ہوسکے گا کہ چھ مہینے کے قلیل عرصہ میں چھ سو تراسی انسان "انصاف پسند" منصفوں کے حکم سے تختہ دار پر لٹکا دیئے گئے محض اسی جرم عظیم کی پاداش میں کہ وہ آزادی کے خواہاں تھے۔ پولینڈ فن لینڈ اور دوسرے صوبوں میں فوجی قانون (مارشل لا) نافذ ہوگیا جس پر شبہ ہوا جیل میں ٹھونس دیا گیا، جس پر "انقلاب پسند" ہونیکا گمان ہوا جلاوطن کر دیا گیا۔ پھر بھی کوئی اسٹرائک نہیں ہوا! کوئی بغاوت نہیں ہوئی! زمستوں اور ڈیوما کے اختیارات واپس لے لئے گئے اور یہی "جمہوری پارلیمنٹ" نہایت بے دردی کے ساتھ وزیر اعظم کے رحم پر چھوڑ دی گئی۔ ڈیوما نے اپنے پہلے اجلاس میں پورے اختیارات کو کام میں لانا چاہا مگر وزیر اعظم نے ۱۲ جولائی ۱۹۰۶ء میں اسے موقوف کر دیا۔ دوبارہ انتخابات ہوئے مگر باوجود حکومت کی کوشش اور احتیاط سے ڈیوما میں اکثریت گورنمنٹ کے مخالفوں ہی کی رہی لہٰذا وزیر اعظم اسٹولی پن نے ۱۰ جون ۱۹۰۸ء کو اسے بھی موقوف کر دیا۔ تیسرے ڈیوما کا بھی یہی حشر ہوا یہانتک کہ چوتھے ڈیوما کے انتخابات ۱۹۱۲ء میں ہوئے۔ بالشویک جماعت نے مردہ قوم میں دوبارہ جان ڈالدی اور اہل روس میں پھر از سر نو سیاسی جوش و خروش پیدا ہوا۔ ڈیوما نے حکومت کی نہایت پرزور مخالفت کی اور ملک کے لئے اصلاحات کا مطالبہ کیا مئی ۱۹۱۳ء میں وزیر داخلہ کے معاندانہ رویہ پر پارلیمنٹ نے قرار داد ملامت و نفریں پاس کی اور وزیر مستعفی ہوگیا۔ اسٹرائک کا سلسلہ پھر شروع ہوگیا جو جولائی کے اخیر تک جاری رہا۔ اس وقت تمام سیاسی انقلاب پسند جماعتوں میں عارضی طور پر ایک سمجھوتہ ہوگیا، سب نے "آزادی" کو اپنا نصب العین ٹھیرایا اور اپنا مقصد حاصل کرنیکے لئے جان توڑ کوشش شروع کر دی۔ اگر اسوقت حکومت اپنے مخالفانہ رویہ کو پس پشت ڈالدیتی تو ممکن تھا کہ انقلاب کی یہ دوسری رَو کچھ عرصہ کے لئے رک جاتی مگر اس کے بجائے تشدد اور سخت گیری نے مخالفوں کو دوسری کوشش کا موقعہ دیدیا۔ جنگ عظیم میں روس کی پے درپے شکستوں نے قوم کی نظروں میں حکومت کا رہا سہا وقار بھی کھودیا۔ اسوقت کے صدر ڈیوما نے اپنی مشہور تاریخی تقریر میں وزارت خارجہ کی بدنظمیوں اور وزیر خارجہ کے جرمنی سے در پردہ سازباز کا تار و پود بکھیر ڈالا۔ وزیر خارجہ اسٹرمر (Sturmer) استعفا دینے پر مجبور ہوگیا۔ روسی افواج کے لئے دیدہ و دانستہ کافی خوراک مہیا نہ کرنا، اصلاح کی کمی اور دیگر بدانتظامیوں نے عوام کو حکومت کی طرف سے بدگمان کر دیا۔

۸ مارچ ۱۹۱۷ء سے انقلاب پسندوں کے جلوس ہاتھوں میں سرخ جھنڈیاں اور علم لئے ہوئے نکلنے شروع ہوئے دوسرے دن پیرو گریڈ کی فوجی قوت میں اضافہ کر دیا گیا، شہر میں چاروں طرف مشین گنیں لگادی گئیں اور

"انقلابیوں" کو جلوس نکالنے اور جلسے منعقد کرنے سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی مگر بے سود۔ روڈزی آنکو صدر ڈیوما نے زار روس کو جو اس وقت دارالسلطنت سے فاصلہ پر ماگیلیو میں مقیم تھا حسب ذیل تار دیا "حالت نہایت نازک ہے۔ دارالسلطنت میں بدامنی پھیلی ہوئی ہے اور حکام بے بس ہیں۔ خوراک کا انتظام بالکل خراب ہے اور ناراضگی عام ہے۔ سڑکوں پر بے فائدہ گولی چلائی جاتی ہے۔ فوراً جمہور کے لیڈر کو وزارت مرتب کرنیکا حکم دیا جائے" مگر اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔ ۱۲ مارچ ۱۹۱۷ء کو صدر ڈیوما نے پھر دوسرا تار دیا کہ "حالت بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے فوراً کوئی انتظام کرنا چاہیے ورنہ کل وقت ہاتھ سے نکل جائیگا آخری وقت آگیا ہے ملک اور آپ کے خاندان کی قسمت کا فیصلہ ہونیوالا ہے" مگر اس کا بھی کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ فوجوں نے "انقلابیوں" سے ملنا شروع کر دیا اور شہر کی تمام رجمنٹیں ایک ایک کرکے انکے ساتھ ہوگئیں۔ ۱۴ مارچ ۱۹۱۷ء کو روس کی شخصی حکومت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔ ڈیوما کے نمائندوں نے سرکاری دفاتر پر قبضہ کر لیا۔ بالشویک جماعت نے روس کے مشہور قومی لیڈر کی سرکردگی میں حکومت زار کا تختہ الٹ دیا۔ خاندان رومانوف کا چراغ آخر کار تین سو سال کے بعد گل ہوگیا۔

ہیں زیر زمیں صاحب تخت و علم و تاج — جو صاحب نوبت تھے نشاں انکے نہیں آج
جو شاہ کہ شاہوں سے سدا لیتے رہے باج — وہ بعد فنا آپ کفن کے رہے محتاج
درویش و غنی اس کے ہمیشہ رہے شاکی
بتلاؤ کہ دنیا نے کسی سے بھی وفا کی — انیس

# میرا دوست

(از سید تنویر حسین صاحب زیدی)

ہاں مجھے یاد ہے۔ جبکہ میں بہت چھوٹا سا تھا۔ تو نے میری امداد کی۔ تو نے ہمیشہ مجھ سے محبت کی۔ تیرا اور میرا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ جب میں چلتے چلتے لڑکھڑا کر گر جاتا تھا۔ تو۔ تو نہایت پیاری اور دلکش آواز سے مجھکو دوبارہ اُٹھنے کی تلقین کرتا تھا۔ میں اُٹھ جاتا تھا۔ اور پھر چلنا شروع کرتا تھا۔

جب یہ زمانہ گذر گیا اور میں ذرا بڑا ہو گیا تھا۔ تو والدین نے مجھے ایک اسکول میں داخل کرا دیا۔ اسوقت بھی تو میرے ساتھ تھا۔ میں پڑھنے لکھنے کی پابندیوں سے گھبراتا تھا۔ اپنی آزادی کو جو مجھ سے چھین لی گئی تھی پھر حاصل کرنیکی بے سود کوشش کرتا تھا۔ مگر نہ معلوم کن کن طریقوں سے تو مجھکو تعلیم کی طرف راغب کر دیتا تھا۔ غرض تیری جانفشانی و خلوص کے سبب میں نے تحصیلِ علم کے منازل جلد جلد طے کرنے شروع کر دیئے۔ دن گزرتے رہے۔ یہانتک کہ اب وہ وقت آگیا تھا۔ کہ میں معقول تعلیم پا لینے کے بعد دنیا میں داخل ہوں۔ اِسوقت میرے دل و دماغ کی عجیب کیفیت تھی میں ترقی کے خوش کُن خواب دیکھا کرتا تھا۔ اور نہایت خوش تھا۔ پیمانہ دل آرزوؤں و تمناؤں سے لبریز تھا۔ اور کام شروع کرنیکے لئے طبیعت بیقرار تھی۔

---

چند سال گذر گئے۔ میری زندگی کا اب نیا دور شروع ہو چکا تھا۔ میری شادی ہو گئی تھی۔ دو بچے بھی تھے۔ مگر افسوس! والدین کا سایہ سر سے اُٹھ چکا تھا۔ میری مالی حالت اچھی نہ تھی میں پریشان تھا طبیعت دنیا کی طرف سے اُکتا گئی تھی مجھ پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ رنج و الم کی گھٹائیں سر پر منڈلا رہی تھیں۔ بیوی بچوں کی افسردہ حالت دیکھکر دل بیٹھ جاتا تھا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ مگر مجبور تھا۔ کیا کر سکتا تھا۔ قریب تھا کہ دامنِ صبر ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ اور میں ناکامی و پریشانی کے ہاتھوں تنگ آکر خودکشی پر آمادہ ہو جاؤں........ مگر ایک آواز نے۔ ہاں ایک آواز جس سے میں آشنا تھا۔ مجھ کو خوابِ غفلت سے چونکا دیا اور میری ڈھارس باندھ دی میں نے چاروں طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ وہاں کوئی موجود نہ تھا میرے دل و دماغ اُس آواز کو محسوس کر رہے تھے۔ مگر میری آنکھیں اس کو دیکھنے سے قاصر تھیں مجھکو میرا ہمدرد دوست

دکھائی نہ دیتا تھا۔

وہ میرے قریب تھا۔ اوس نے میری کمر ٹھونکی تسلی دی۔ پیار کیا۔ اور کچھ ایسے دل آویز الفاظ میں مجھکو دعوتِ عمل دی کہ میں مجبور ہوگیا۔

---

میں نے نہایت صبر و استقلال سے اپنی کمر کو کسا اور اپنے دوست کے ساتھ ہولیا۔ میرے دوست نے مجھکو ایک پہاڑ کے دامن کے نیچے لے جاکر کھڑا کر دیا۔ اور مجھسے کہا کہ اوپر کی طرف دیکھو۔ میں نے نظر اٹھائی پہاڑ کی چوٹی دکھائی دی۔ کچھ عورتوں۔ بچوں اور مردوں کی آوازیں بھی آرہی تھیں میں نے بغور سُنا تو وہ میٹھے میٹھے راگ جن میں ایک قسم کی کشش تھی الاپ رہے تھے۔ پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں آرہی تھیں ہرطرف خوشی و اطمینان کے آثار نمایاں تھے۔

میرے دوست نے مجھسے کہا۔ یہی منزل مقصود ہے۔ اللہ کا نام لیکر چوٹی پر چڑھنا شروع کرو۔ میں ڈرا اور کہا! یہ تو بہت اونچی ہے مگر میرے دوست نے میرا ہاتھ پکڑا اور نہایت میٹھے الفاظ میں کہا کہ گھبراؤ مت میں تمھارے ساتھ ہوں۔ مجھے کچھ ڈھارس ہوئی۔ میں نے چڑھنا شروع کیا۔ مگر جلدی تھک گیا۔ مگر میرے دوست نے مجھکو سمجھایا تو میں چلنے پر آمادہ ہوگیا۔ اب پہاڑ کی چوٹی مجھکو نزدیک معلوم ہوتی تھی۔ پژمردگی دل سے حرفِ غلط کی طرح مٹتی جارہی تھی۔ میرے پیروں میں نہ معلوم اتنی قوت کہاں سے آگئی تھی کہ میں جلدی جلدی چل رہا تھا۔ میرا دوست بہت خوش تھا۔ جوں جوں ہم چوٹی کے نزدیک پہنچتے جاتے تھے۔ ہماری خوشی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

اب ہم چوٹی پر پہنچ چکے تھے۔ اور اطمینان کے سانس لے رہے تھے۔ ہر چیز تبسم ریز تھی۔ وہاں کے رہنے والے خوش خوش نظر آتے تھے میں بھی یہ تماشہ دیکھ رہا تھا کہ میرے دوست نے باصرار مجھسے اجازت طلب کی میں نے اجازت دیدی

---

اس وقت میں بادِ مخالف کے جھونکوں سے محفوظ تھا مصیبت کے پہاڑ ٹل چکے تھے۔ رنج و الم کی گھٹائیں معدوم ہوچکی تھیں۔ میرا دل خوشی کیوجہ سے بانسوں اوچھل رہا تھا۔ ہاں مجھے صرف اپنے دوست کے جس نے کہ مجھے اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچایا تھا۔ چلے جانے کا افسوس تھا۔ میں اس کی مہربانیوں اور عنایتوں کو یاد کر رہا تھا۔ میں نے اب یہ عہد کیا تھا کہ اپنے دوست کی تلاش کروں۔ اپنی آنکھوں سے اوس کی زیارت کروں۔ اور اوس کو ان عنایتوں کا صلہ دوں لیکن آہ

میرا یہ خیال پورا نہ ہوسکا جونہی میں نے ان خیالات سے فرصت پاکر نگاہ اٹھائی۔ کیا دیکھتا ہوں۔ کہ میرے بیوی بچے نہایت خوش خوش مجھکو مبارکباد دیتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ میں نے اونکا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ اور محوگفتگو ہورہا اور اپنے دیرینہ دوست کو بالکل بھول گیا۔ میں اور میرے بیوی بچے نہایت آرام سے زندگی کے دن گذار رہے تھے۔ اور مجھے ہرطرح راحت و آرام حاصل تھا۔

---

یہ میری زندگی کا عجب دور تھا۔ میں خوش ضرور تھا۔ مگر شباب مجھ سے رخصت ہوچکا تھا۔ میں ضعیف و لاغر تھا۔ لکڑی کے سہارے چلتا تھا۔ بینائی میں فرق آگیا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ بھی تھا۔

ایک دن میں بیمار ہوگیا۔ بیماری نے بہت طول کھینچا۔ ڈاکٹروں اور حکیموں نے میرے مرض کو لاعلاج بتایا میں نے سُنا۔ اور نہایت صبر کیساتھ سُنا۔ میں خوش تھا۔ کیونکہ میں اپنا فرض پورا کرنے کے بعد دنیا کو خیرباد کہہ رہا تھا۔ اور دنیا میری مرہونِ منت تھی۔ اُس وقت میرے دل میں ایک خیال تھا۔ جو بار بار چٹکیاں لیتا تھا۔ وہ اپنے بچھڑے ہوئے دوست کی یاد تھی میں نے اوس کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ دیکھنے کی آرزو تھی۔ میں بے چین تھا۔ اور ماہئی بے آب کی طرح بسترِ مرگ پر لوٹ رہا تھا۔

ہاں۔ اوسی وقت ایک آواز آئی۔ میرے چہرے پر خوشی کے آثار ہویدا ہوگئے۔ مگر یہ محسوس کرکے کہ آواز پہلے کی نسبت بہت دھیمی اور افسردہ ہے۔ تعجب ہوا۔ میں نے حالت اضطراب میں چلّا کر کہا!

اے دوست مجھے معاف کرنا۔ میں نے تم کو بالکل بُھلا دیا۔ میں نے تمکو کبھی یاد نہیں کیا۔ تمہاری تلاش نہیں کی۔ تمہاری عنایتوں کا کچھ بھی بدلہ نہ دلیسکا۔ میں سخت شرمندہ ہوں۔

میرے دوست نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ بس روتے ہوئے اتنا پوچھا کہ اب کیا چاہتے ہو۔ میں نے ....... میں نے ....... اپنے دل کو تھامتے ہوئے کہا کہ صرف ایک آرزو ہے۔ اور وہ یہ کہ میں تمکو دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہاری صورت۔ و سیرت کا جو کہ فرشتوں سے بھی بالاتر ہے۔ زیارت کرنی چاہتا ہوں۔

میرے دوست نے ایک سرد آہ کھینچی۔ اور کہا کہ اچھا اگر تمہاری مرضی یہی ہے۔ تو میں اسکو بھی پورا کرنیکو طیار ہوں۔

---

میرے سینہ میں سخت سوزش پیدا ہوگئی۔ اور دھواں سا اٹھا۔ اور اس میں ایک انسانی شکل جو کہ بالکل مجھسے ملتی جلتی اور میرا ہی جیسا لباس پہنے ہوئے تھی۔ منودار ہوگئی۔ میری زبان سے رُکتے رُکتے لفظ دوست نکل گیا۔ اُوسنے کہا۔ کہو۔ میں تعجب سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اوس کی طرف دیکھنے لگا۔ اور یہ کہتا ہوا کہ

"افسوس مجھے آجتک یہ معلوم نہ ہوا کہ میں خود اپنا دوست تھا" خاموش ہوگیا۔

مجسّمہ میرا ! جو اس وقت میرے سامنے موجود تھا۔ آہستہ آہستہ معدوم ہونیلگا۔ اسکے ساتھ میری قوت بھی گھٹنے لگی۔ اور سینہ میں دم رُک گیا۔

-: اوس کے بعد۔ مجھے معلوم نہیں میں کہاں تھا :-

# غزل

(از محترمہ کنیز فاطمہ صاحبہ فرحت)

تو روحِ تمنا ہے تو ہی جانِ تمنا
آباد ترے دم سے ہے ایوانِ تمنا

سو جان سے میں کیوں نہوں قربانِ تمنا
ہے دل میں کھٹکتا مرے پیکانِ تمنا

کیا کیا نہ تری یاد میں تڑپا دلِ محزوں
کچھ تجھکو بھی معلوم ہے اے جانِ تمنا

یارب نہ مرے دل سے مٹے داغِ محبت
اس شمع سے روشن رہے ایوانِ تمنا

اب چشمِ تمنا میں سماتا نہیں کوئی
اے جانِ تمنا یہ بڑی شانِ تمنا

اس رنگ سے اُسنے مرے دلکو دئے تنو داغ
داغوں نے بھرا پھولوں سے دامانِ تمنا

اے جانِ جہاں تم جسے سمجھے ہوئے دل ہو
پہلو میں مرے ہے وہی ایوانِ تمنا

گو یاس نے جھٹکے دئے ہر طرح ہزاروں
چھوٹا نہ مرے ہاتھ سے دامانِ تمنا

دل میں جو مرے یہ نہو تو کچھ نہیں فرحت
دل پر مرے ہر وقت ہے احسانِ تمنا

# لطیفے

(۱)

ایک روز شاہجہاں نے ایرانی سفیر کو اپنے دسترخوان پر دعوت دی کئی قسم کے کھانے موجود تھے۔ بادشاہ کو پلاؤ مرغوب تھا۔ لیکن ایرانی سفیر گوشت کو زیادہ پسند کرتا تھا جس وقت وہ رکابی میں سے ہڈیاں چبانے میں مشغول تھا۔ بادشاہ نے کہا "سفیر صاحب کتے کیا کھائیں گے؟"

سفیر نے فوراً جواب دیا "پلاؤ" (برنیر)

(۲)

ایک ایرانی سفیر ایسا گستاخ اور صاف گو واقع ہوا تھا کہ بالآخر شاہجہاں نے اس سے تنگ آکر کہا "بدبخت کیا شاہ عباس کے دربار میں کوئی شریف آدمی نہیں ہے جو ایسے احمق کو میرے پاس بھیجدیتا ہے۔"

سفیر بولا "بے شک شاہ ایران کے دربار میں مجھ سے زیادہ شریف اور خلیق آدمیوں کی کثرت ہے مگر وہ بادشاہوں کے پاس بھیجے جاتے ہیں۔" (برنیر)

(۳)

شاہجہاں نے ایرانی سیاحوں سے دریافت کیا کہ ہماری نئی دہلی تمہارے اصفہان کے مقابلہ میں کیسی ہے؟ انھوں نے جواب دیا "واللہ! باللہ!! اصفہان کا آپ کی دہلی کی گرد سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔"

بادشاہ یہ سنکر بہت خوش ہوا۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ ایرانیوں کا مطلب یہ تھا کہ اصفہان ایک عظیم الشان شہر ہے اور دہلی میں گرد و غبار کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس لئے دونوں کا مقابلہ کیسا۔ یہ خیال کر کے بادشاہ شرمندہ ہوا (برنیر)

(۴)

ایرانی اہلِ زبان اور اسلامی تہذیب و تمدن کا سرچشمہ ہونے کے زعم میں اس قدر مغرور اور سرکش تھے کہ شاہجہاں اور اورنگ زیب عالمگیر جیسے بادشاہوں کے احترام کو بھی ملحوظ نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک ایرانی سفیر ہندوستانی طریقہ کے مطابق کورنش و تسلیم کئے بغیر شاہجہاں کے سامنے بے تکلف بیٹھ جاتا تھا۔ بادشاہ کو اس پر سخت غصہ

آتا تھا لیکن دم بخود تھا کیونکہ ایرانی حملہ کی ایک افواہ اس کو لرزہ براندام کرنے کے لئے کافی تھی۔

بالآخر مجبور ہو کر شاہجہاں نے یہ تدبیر کی کہ دیوان خاص کے بڑے پھاٹک کو بند کرا دیا اور اس میں صرف ایک کھڑکی کھلی رہنے دی۔ یہ کھڑکی اتنی نیچی تھی کہ کوئی شخص سر جھکائے بغیر اس میں سے نہیں گذر سکتا تھا۔ بادشاہ کا خیال تھا کہ اس طرح ایرانی سفیر کو میرے حضور میں آنے سے قبل درباری معمول سے بھی زیادہ جھکنا پڑیگا اور میری عظمت میں فرق نہیں آئیگا۔

مگر ایرانی سفیر اس کا مطلب سمجھ گیا۔ اور بادشاہ کی طرف پشت کر کے کھڑکی میں داخل ہوا۔ یہ دیکھکر بادشاہ بہت مغلوب الغضب ہوا اور بولا "بدبخت! کیا تو سمجھتا ہے کہ تو اپنے جیسے گدھوں کے اصطبل میں داخل ہو رہا ہے؟"
سفیر نے جواب دیا "بے شک میں یہی سمجھا۔ کوئی شخص ایسے دروازہ سے گذر کر گدھوں کے سوا کس کے پاس جانیکا خیال کر سکتا ہے؟"

(برنیر صفحہ ۱۵۲)

## (۵)

جاندار شاہ (۱۷۱۲-۱۳ء) کی بیوی لال کنور ایک ادنیٰ ذات کی ڈومنی تھی۔ شہنشاہ نے اس کو امتیاز محل کا لقب دیا اور اس کے رشتہ داروں کو اعلیٰ عہدوں پر مقرر کیا۔ اس کے بھائی خوشحال کو ہفت ہزاری بنا کر آگرہ کی صوبہ داری مرحمت کی ؎

چو بادِ خزانی در آید بباغ
زمانہ دہد جائے بلبل بزاغ

ذوالفقار خاں وزیر نے اس شاہی فرمان کی تیاری میں عمداً بے پروائی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خوشحالی کا تقرر عمل میں نہیں آسکا۔ آخر کئی روز انتظار کرنے کے بعد خوشحالی نے لال کنور کی معرفت بادشاہ سے اس لیت ولعل کی شکایت کی۔ بادشاہ نے وزیر سے جواب طلب کیا۔ وزیر نے عرض کیا "جہاں پناہ! ہم اہل دربار رشوت ستانی میں مبتلا ہو گئے ہیں اور اس کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے۔"

بادشاہ نے دریافت کیا "امتیاز محل اور خوشحال سے تم کیا رشوت چاہتے ہو؟" وزیر نے جواب دیا "ایک ہزار ڈھول۔ باجے۔ تاشے۔ نفیری۔ سارنگی۔ دف۔ طنبور۔ خنجری۔ وغیرہ وغیرہ۔" بادشاہ نے متعجب ہو کر پوچھا۔

"تم کو ان چیزوں سے کیا واسطہ ؟" وزیر نے کہا "جہاں پناہ! حضور نے تمام منصب اور عہدے جو ہم لوگوں کے لائق تھے ان ڈوموں۔ نقالوں۔ بھانڈوں۔ گویوں پھکیو اور مسخروں کو بخش دیے۔ اس لئے ہم درباریوں کو بجز اس کے کیا چارۂ کار ہے کہ ان لوگوں کا ہنر سیکھ کر روزی حاصل کریں" ؎

ہمائے گو مفگن سایۂ شرف ہرگز

براں دیار کہ طوطی کم از زغن باشد (خافی خاں جلد ۲ صفحہ ۲۲۳)

(۶)

ہمایوں نے جب اپنی کھوئی ہوئی سلطنت فتح کرنے کا خیال ظاہر کیا تو امراکی دو جماعتیں ہوگئیں۔ ایک کہتی تھی کہ کابل پر قناعت کرنی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ ہندوستان کی تسخیر کرنے کی کوشش میں کابل بھی ہاتھ سے نکل جائے دوسری جماعت اس کی مخالفت کرتی تھی۔ بالآخر ایک سردار نے یہ مشورہ دیا کہ قسمت آزمائی سے پہلے شگون لینا مناسب ہے۔ اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تین اشخاص تین جانب روانہ کئے جائیں اور ان میں سے ہر ایک اس شخص کا نام معلوم کرے جو اس کو سب سے پہلے ملے۔ ان ناموں سے شگون کے نیک و بد ہونے کا فیصلہ ہوگا ہمایوں نے اس کو پسند کیا اور تین سواروں کو دوڑایا۔ تھوڑی دیر بعد تینوں واپس آئے۔ پہلے نے کہا "مجکو ایک آدمی ملا جس کا نام سعادت خاں تھا" دوسرے نے کہا "مجکو ایک آدمی ملا جس کا نام مراد خاں تھا" تیسرے نے کہا "مجکو ایک آدمی ملا جس کا نام دولت خاں تھا" اس پر ہمایوں کو اپنی کامیابی کا یقین ہوگیا۔ (تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۴۵۶) لیکن روانہ ہونے سے پیشتر اس نے دیوان حافظؒ سے فال لی۔ یہ شعر برآمد ہوا ؎

دولت از مرغ ہمایوں طلب و سایۂ او

زانکہ با زاغ و زغن شہپرِ ہمت نبود

(خلاصۃ التواریخ قلمی صفحہ ۲۳۱)

(۷)

اکبر نے جب سکندر سور کی سرکوبی کا ارادہ کیا تو دیوانِ حافظؒ سے فال نکالی۔ یہ بیت برآمد ہوا ؎

سکندر را نمی بخشند آبے
بزور و زر میسر نیست ایں کار

(سیر المتاخرین جلد ۲ صفحہ ۲۷)

(۸)

فرخ سیر نے تخت نشین ہونے کے بعد اپنے سکہ پر یہ شعر کندہ کرایا:۔

سکہ زد از فضلِ حق بر سیم و زر
بادشاہِ بحر و بر فرخ سیر

اس سال دہلی میں خشک سالی کے آثار نمودار ہوئے اور غلہ بہت گراں ہو گیا۔ اس مناسبت سے بعض ظریفوں نے مندرجۂ بالا بیت کو اس طرح مشہور کیا۔

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر
بادشاہِ دانہ کش فرخ سیر

(لیٹر مغلز از ولیم اروِن جلد اوّل صفحہ ۲۹۹)

(۹)

اورنگ زیب عالمگیر نے جب تیغ بہادر (سکھ گرو) کو قتل کرنے کے لئے اپنے دربار میں بلایا تو بعض اہل دربار نے گرو سے کہا کہ اگر تم خدا کی طرف سے ہادی مقرر کئے گئے ہو تو کوئی کرامت دکھاؤ۔ گرو نے جواب دیا "بندہ کا کام فقط خدا سے دعا کرنا ہے۔ تاہم کرامت دکھانے کے لئے تیار رہوں۔ میں ایسا منتر جانتا ہوں کہ اس کی برکت سے تلوار کا وار خالی جاتا ہے۔" یہ کہکر اُس نے کاغذ کے ایک پرزہ پر چند الفاظ لکھکر اپنی گردن سے چپکا لئے اور جلاد کے سامنے سر جھکا دیا۔ اہلِ دربار کا خیال تھا کہ تلوار اس کا سر نہیں کاٹ سکے گی لیکن یہ دیکھکر ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی کہ جلاد کی تلوار کی ایک ہی ضرب نے اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ انھوں نے کاغذ کے پرزہ کو پڑھا تو اس میں لکھا ہوا تھا۔

"سر دیا سر نہ دیا"

غور کرنے سے معلوم ہوا کہ تیغ بہادر نے تجنیس خطی کی آڑ لیکر نہایت عقلمندی سے اپنے آپ کو دروغ گوئی کے الزام سے بچا لیا۔ اس فقرہ میں لفظ "سر" دو جگہ آیا ہے۔ اس پر اعراب لگانے سے گرو کا مطلب واضح ہوجاتا ہے جو یہ ہے

"سِر دیا سَر نہ دیا"

پہلے "سر" کے معنی "سَر" کے ہیں جس کو اہل ہند "سِر" بھی بولتے ہیں۔ دوسرے "سر" کے معنی "بھید" کے ہیں۔ تیغ بہادر کا مدعا یہ تھا کہ گو تلوار سے میرا سر قلم ہوجائے مگر میرا راز قائم رہے گا یعنی میں نے جو جذبہ اپنی قوم میں پیدا کردیا ہے وہ کسی تلوار سے زائل نہیں ہوسکتا۔

(ہسٹری آف دی سکھس از کننگھم صفحہ ۹۶)

(۱۰)

ہمایوں نے بہادر شاہ والئی گجرات و مالوہ کی سرکوبی کا بیڑہ اٹھایا۔ لیکن سارنگپور کے نزدیک پہونچکر معلوم ہوا کہ بہادر شاہ قلعۂ چتور کے فتح کرنے میں مشغول ہے۔ اگر ہمایوں عقلمند اور سیاست داں ہوتا تو اس وقت آسانی سے بہادر شاہ پر غلبہ پاسکتا تھا مگر اس نے بہادر شاہ کے خلاف راجپوتوں کی مدد کرنیکی بجائے یہ انتظار کیا کہ جب بہادر شاہ چتور پر قبضہ کرلے اُس وقت میں اس پر حملہ کروں اسی اثنا میں اس نے ذیل کا قطعہ تصنیف کرکے بہادر شاہ کے پاس بھیجا ؎

اے کہ ہستی غنیم شہر چتور — کافراں را چطور میگیری
بادشاہے رسید بر سر تو — تو نشستہ چتور میگیری

بہادر شاہ بھی نہایت سخن سنج تھا۔ اس نے ترکی بہ ترکی یہ جواب ارسال کیا ؎

من کہ ہستم غنیم شہر چتور — کافراں را بجور میگیرم
ہر کہ بکند حمایتِ چتور — تو ببیں کش چطور میگیرم

(تاریخ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۹۹)

قطعاتِ بالا میں "چتور" اور "چطور" کی صنعت قابلِ داد ہے۔

# کفّارہ

از قلم احمد (سراوہ) از میرٹھ

أَغَيْرَ اللَّهِ أَبْغِي رَبًّا وَهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ۚ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ج (القرآن۔ سورۃ الانعام۔ رکوع ۲۰۔ آیت ۱۶۵)

ترجمہ۔ کیا میں اللہ کے سوا کسی دوسرے کو رب بناؤں۔ اور وہی تمام چیزوں کا پالنے والا ہے۔ اور کوئی نفس برائی نہیں کرتا مگر اپنے لئے اور کوئی بوجھ اُٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائیگا۔

اس آیت میں قرآن مجید نے مسیحی عقیدہ خون کے کفّارہ کی تردید کی ہے۔ ہر شخص خود اپنا بوجھ اٹھانے والا ہے اس پر ابتدا ہی سے چند اہم ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ یہی اس کا بوجھ ہیں۔ وہ کسی دوسرے کی ذمہ داریوں کا جواب دہ نہیں ہو سکتا۔

مسیحیت کے حامی کفّارہ کے مسئلہ کے ثبوت میں بعض اوقات یہ صوفیانہ دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ ایک نیک آدمی اپنے قرضدار کا قرض معاف کر سکتا ہے۔ لیکن آدمی خدا اور مسیحؑ کا باہمی تعلق ایک قرضدار۔ قرضخواہ اور نیک شافع کے آپس کے تعلق کی مانند نہیں ہے۔ کیونکہ مسیحیت کی رو سے حضرت مسیحؑ خود خدا تھے۔ اس لئے مذکورہ دلیل غیر مناسب ہے۔

بخلاف اس کے مسیحؑ اور بنی آدم میں طبیب اور مریض جیسی نسبت ہے۔ ایک شخص کو کوئی اندرونی بیماری ہو گئی اور طبیب نے اُس کو تندرست کرنے کے لئے خود دوا کھائی۔

اسی طرح آدمی نے گناہ کیا اور اس کو گناہ سے آزاد کرنے کی غرض سے خدا (مسیحؑ) خود سولی پر چڑھ کر ہلاک ہو گیا۔

خون کے کفارہ کا عقیدہ عام گمراہی یا فطری گنہگاری کے اصول پر مبنی ہے۔ اور یہ دونوں مسیحیت کے بنیادی اُصول ہیں۔

خلقی گناہ ہر شخص کو فطری قصور اور خطا کو کہتے ہیں۔ اس لئے جو کوئی اس دنیا میں پیدا ہوا خدا کے عتاب اور عذاب کا مستحق ہے تقدس کے سرچشمہ یعنی خدا کی اس سے زیادہ کیا توہین کی جا سکتی ہے کہ اس نے تمام انسانوں کو فطرتاً گنہگار پیدا کیا۔ یہ خدا پر بہتان ہے۔ اس میں اس سے زیادہ کمزوری اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

انسان جو خدا کی صنعت کا بہترین نمونہ اور دنیا میں اس کا خلیفہ ہے مسیحیت کے نزدیک تمام مخلوقات سے

زیادہ ذلیل ہے خدا کی کل عمدہ مخلوق آدمی ہی کی وجہ سے خراب۔ ناپاک۔ رسوا۔ ملعون۔ اور راندہ درگاہ ہوئی۔ زمین بھی اس سے محفوظ نہیں رہی اور آدم کے باعث مردود ہوئی۔ آدمی کی نافرمانی کی بدولت اس میں گھاس اور کانٹے پیدا ہونے لگے۔ رنج و غم، مصیبت و اذیت صرف اسی کے سبب سے ظہور میں آئیں۔ آہ! کیسی شیطانی چیز ہے مگر جب ایک شخص ان اوراق کو الٹتا ہے جن میں انسان کی ایسی تنفر انگیز تصویر بنی ہوئی ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ ایسی مخلوق کا خالق خود بھی مکمل نہیں ہے۔ ایک کاریگر اپنی کاریگری سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کی بنائی ہوئی تصویر خود اس کی سیرت کو ظاہر کرتی ہے۔

"خدا نے آدمی کو اپنا ہمشکل بنایا"

(توریت۔ کتاب اول پیدائش)

"خدا اس برائی پر پچھتایا جو وہ لوگوں کے ساتھ کرنا چاہتا تھا"

(توریت۔ کتاب ثانی خروج)

کیا اس کلمہ کفر سے خدا پچھتانے والا نہیں ٹھہرتا۔ اگر آپ ہم سے اپنے خدا کی عبادت کرانا چاہتے ہیں تو اس کو اس سے بہتر بنائیے۔

پال کہتا ہے "وہ (مسیح) دنیا میں اس لئے ظاہر ہوا کہ اپنے آپ کو قربان کر کے گناہوں کو دور کرے"۔ گناہ کے لئے کفارہ کا اصول نہایت دیرینہ عقیدہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مسیحیت سے پیشتر دنیا میں خدا کے بہت سے مجسم (اوتار) ہوئے جنہوں نے انسان کے گناہوں کا کفارہ کرنے کی خاطر اپنی جانیں دیں۔ ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:۔ متھرا (ایران کا خدا) ایڈونیس (شام کا خدا)۔ اتیس (فریگیا کا خدا)۔ کوئٹزالکوٹالا (میکسیکو کا نجات دہندہ)۔ ان کے علاوہ بھی اور بہت ہوئے۔ جیسا کہ جسٹن مارٹر کہتا ہے "خدا کے تمام فرزندوں کے لئے مصیبت مشترک تھی" اور اسی وجہ سے ان کو "مقتول" "نجات دہندہ" اور "رہانندہ" کہا جاتا ہے۔ لارڈ بیکن بھی مخلوق کی نجات کے واسطے مارا گیا اور اسی سبب سے گناہ دور کرنے والا اور خلاصی دینے والا کہلایا۔

مقتول معبودوں کی فہرست میں ایک فرضی ہستی ——— جیسا کہ حضرت مسیح کے عہد نامہ جدید کی ان تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے جو ان کے متعلق ہیں ——— مسیحیوں کا خدا ہے جس کی بابت یقین کیا جاتا ہے کہ اس نے

اپنے خون سے انسان کو گناہ کی زنجیروں سے آزاد کیا۔ ہر شخص کو اپنے عقیدہ کا اختیار ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مسیح کے خون سے کفارہ کے باوجود "ازلی لعنت" میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ آدمی اب بھی محنت سے روزی پیدا کرتا ہے اور مصائب و تکالیف میں مبتلا ہے۔ بچے اب بھی گنہگار پیدا ہوتے ہیں۔ اور زمین سے کانٹے بھی بدستور اُگتے ہیں۔ ابن اللہ کی قربانی کا کچھ بھی اثر نہیں ہوا۔ اور جو حالات پہلے تھے وہی اب ہیں۔ حضرت مسیح خود تکلیف۔ رنج۔ غم۔ اور موت کا شکار ہوئے لہذا۔ رومن کیتھولک عقیدہ کے مطابق گناہ ان کی فطرت میں بھی داخل تھا۔ کیونکہ بائبل میں لکھا ہے کہ گناہ ان سب کا باعث ہوتا ہے۔ پس جو شخص خود گنہگار ہو وہ دوسروں کے لئے کیا خاک کفارہ ہو سکتا ہے۔ مزید برآں بائبل کی تعلیم یہ بھی ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا ذمّہ دار ہے اور ان کی جزا و سزا صرف اسی کو ملے گی۔ غیروں کو نہیں کیونکہ ہر شخص اپنا اپنا بوجھ آپ اٹھائیگا۔

عہدنامہ جدید کی یہ آیت کفارہ کے مسئلہ کی تکذیب کرتی ہے اور قرآن شریف کی اس آیت کی تصدیق کرتی ہے یعنی کسی کے افعال دوسرے کے کام نہیں آسکتے۔ موسیٰ علیہ السلام بھی اپنے قانون میں اس اصول پر مہر تائید ثبت کرتے ہیں کہ ہر شخص اپنے ہی جرم کی پاداش میں قتل کیا جائیگا۔

پس ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم اور جدید عہدنامے خون کے کفارہ کو جھٹلاتے ہیں۔ واقعات سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ غیر ملکوں سے لیکر مسیح کی سہل اور سادہ تعلیم میں داخل کر دیا گیا۔ "اگر تم ابدی زندگی چاہتے ہو تو قانون کے پابند رہو" (انجیل متی ۱۹: ۱۷) اور یہ ایسے شخص کا قول ہے جو قانون کو لعنت کے نام سے تعبیر کرتا ہے (متی ۳ : ۱۳) اور کہتا ہے کہ خدا کی نظر میں کوئی شخص قانون کی بدولت حق بجانب نہیں ہو سکتا۔ (۳ : ۹) مگر ساتھ ہی مسیح نے یہ اعلان کیا کہ "میں قانون کو منسوخ کرنے کے لئے نہیں آیا" اور "ہر وہ شخص جو مجھکو 'خدا خدا' کہتا ہے آسمانی بادشاہت میں نہیں داخل ہو سکتا بلکہ وہ داخل ہوگا جو میرے باپ کی اطاعت کریگا جو آسمان میں ہے" (متی ۷ : ۲۱)

اسی سلسلہ میں اس شخص کی دیانت پر ایک نظر ڈالنی مناسب ہے جس نے مسیح کی عمدہ تعلیم میں خون کے کفارہ کا مسئلہ شامل کر دیا۔ وہ شخص پال تھا۔ وہ اس جگہ خود اقرار کرتا ہے "یہودی ہو گیا۔ تاکہ یہودیوں کو اپنے ساتھ ملا سکوں اور جو لوگ قانون کے پیرو ہیں اُن میں میں قانون کا پیرو ہو گیا تاکہ قانون کی پیروی کرنے والوں کو اپنا حامی بنا سکوں اور جو لوگ قانون سے آزاد ہیں اُن میں میں بھی قانون سے آزاد ہو گیا تاکہ آزاد لوگوں کو اپنا ہمخیال بنا سکوں

(۱۔ قرنتیہ۔ ۹: ۶ و ۷)

اس بیان سے پال کی مردم شناسی پہ کافی روشنی پڑتی ہے بخشی سے یا زمی سے۔ فریب سے یا ایمانداری سے۔ دغابازی سے یا راستبازی سے۔ غرض جس طرح بھی ممکن ہو مسیحیت کی تبلیغ لازم ہے۔ اس لئے پال کا یہی طرزِ عمل تھا۔

"اور سخاوت کے شوق کو اپنے اندر سب چیزوں پر مقدم رکھو کیونکہ سخاوت گناہوں کے انبار کو پوشیدہ رکھتی ہے"۔

(۱۔ پطرس ۴: ۸)

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَلَنَجْزِیَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِیْ كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ٥ (القرآن۔ سورۃ العنکبوت رکوع ۱۔ آیت ۷)

ترجمہ۔ اور جو لوگ کہ ایمان لائے اور کام کئے اچھے البتہ دور کرینگے ہم اُن سے برائیاں ان کی اور البتہ بدلا دینگے ہم اُن کو بہتر اس چیز سے کہ وہ کرتے تھے۔

ان ہر دو بیانوں سے واضح ہوتا ہے کہ بُرے کاموں کا حقیقی کفارہ نیک کام کرنا ہے جس سے ثانی الذکر اول الذکر کی جگہ لیکر آدمی کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیتے ہیں پس ثابت ہوا کہ نیکی سے گناہوں کا کفارہ ہی قدرت کا سچا اصول اور جملہ مذاہب کی اصل اور صحیح تعلیم ہے جس سے مسیحیت بھی مستثنیٰ نہیں ہے لیکن خون کا کفارہ قطعاً خلاف قانونِ قدرت اور خلافِ عقل ہے اور یقیناً مسیح کے مذہب میں بعد کی ایجاد ہے۔

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا ؕ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ٥

(سورۂ بنی اسرائیل۔ رکوع ۲۔ آیت ۱۵)

ترجمہ۔ جس نے راہ پائی پس اس کے سوا نہیں کہ راہ پاتا ہے اپنی جان کے واسطے اور جو کوئی گمراہ ہوا پس اس کے سوا نہیں کہ گمراہ ہوتا ہے اوپر اپنے اور نہیں بوجھ اٹھاتا کوئی بوجھ اٹھانے والا بوجھ دوسرے کا اور نہیں ہم عذاب کرنے والے یہانتک کہ بھیجیں رسول۔

# سین پانچواں

## ننھے خاں - جمّن اور ممّن

ننھے خاں اسٹیج پر گاتا ہوا داخل ہوتا ہے
(اس کے ایک ہاتھ میں بوتل ہے) لا - لا - لا
را - را - را -

جمن - کسی کے گانے اور لکڑیاں چیرنے
کی آواز آرہی ہے -

ننھے خاں - لا - لالا - را - لرا - را -
میں نے ایک ہی ہلّے میں کافی کام کرلیا ہے - اب
ذرا سستالوں (ایک چسکی لے کر)

خمسہ

کچھ ڈر نہیں جو کاسۂ گردوں ہے واژگوں
اربابِ ظرف سب مرے آگے ہیں سرنگوں
جامِ جہاں نمائے دل و دیدہ ہیں فزوں
ساقی ترے کرم سے میں جمشیدِ وقت ہوں
شیشے جھکے ہوئے ہیں پیالوں کے سامنے

منیر

آؤ ذرا غم غلط کریں -

جمن - وہی ہے -

ممن - بس ٹھیک - پالیا -

جمن - ذرا قریب چل کر دیکھیں -

ننھے خاں - (ان کو دیکھ کر کبھی ایک کی طرف
دیکھتا ہے کبھی دوسرے کی طرف - پھر دھیمی آواز سے
کہتا ہے) واہ ری میری پیاری بوتل مجھے تجھ سے
کتنی م.....م... محبت ...... ہے
ارے یہ کس واسطے یہاں آئے ہیں

جمن - یقیناً وہی ہے -

ممن - ہو نہ ہو وہی ہے - جو حلیہ اس کا بتایا
گیا تھا بالکل اس کے مطابق ہے - بال برابر فرق نہیں -

ننھے خاں (ایک طرف اپنی بوتل زمین پر
رکھ دیتا ہے - جب جمن جھک کر آداب بجالاتا ہے
تو یہ خیال کرکے کہ وہ اس کی بوتل اٹھانے والا ہے
ننھے خاں اسے دوسری طرف رکھ دیتا ہے - ادھر
ممن سلام کے لئے جھکتا ہے تو وہ اٹھا کر اسے اپنے

سینے سے لگا لیتا ہے اور عجیب دل خوش کن حرکتیں
کرتا ہے۔) نہ معلوم ان مسخروں کی کیا منشا ہے۔ آپس میں
کچھ صلاح ـ مشورے کر رہے ہیں ۔

**جمن** ۔ جناب کیا آپ کا اسمِ گرامی
ننھے خاں ہے ؟

**ننھے خاں** ہیں۔ کیا ؟

**جمن** ۔ میں جناب سے دریافت کر رہا تھا
کہ کیا آپ کا اسمِ گرامی ننھے خاں صاحب ہے ؟

**ننھے خاں** ۔ (پہلے جمن اور پھر ممن
کی طرف دیکھ کر) ہاں اور نہیں ۔ اول کام
بتایئے۔ پھر نام پوچھئے ۔

**جمن** ۔ محض جناب کے سلام کو حاضر ہوئے ہیں۔

**ننھے خاں** ۔ تو پھر میرا نام یہی ہے ۔

**جمن** ۔ جناب سے ملاقات کر کے بے حد
مسرت ہوئی۔ ہمیں جناب کے پاس اپنی حاجت روائی
کے لئے خاص طور پر بھیجا گیا ہے اور ہم آپ سے ایک
معاملہ میں مدد کے خواستگار ہیں ۔

**ننھے خاں** ۔ اگر میں اپنے حقیر پیشے سے آپ
کی کسی طرح مدد کر سکتا ہوں تو بجان و دل تیار ہوں
مجھے عین راحت ہوگی ۔

**جمن** ۔ آپ کی بے حد عنایت ہے ۔ جناب
ذرا اپنی ٹوپی اوڑھ لیں۔ دھوپ بہت تیز ہے کہیں
نقصان نہ پہنچائے ۔

**ممن** ۔ جی ہاں بہتر یہی ہے ۔

**ننھے خاں** (علیحدہ) کس قدر خوش اخلاق
لوگ ہیں ۔

**جمن** ۔ امید ہے کہ جناب کو ہمارے آنے
سے کچھ تعجب نہیں ہوا ہوگا ۔ پیاسا ہمیشہ کنوئیں کے
پاس آتا ہے۔ ماہرانِ فن کی ہر ایک کو تلاش رہتی ہے۔
ہم نے جناب کی بہت تعریف سنی ہے ۔

**ننھے خاں** ۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ میں
دنیا میں لاثانی لکڑہارا ہوں

**جمن** ۔ جناب کیا فرما رہے ہیں ۔

**ننھے خاں** ۔ میں اپنا کام نہایت جانفشانی
سے کرتا ہوں کیا مجال کہ ذرہ بھر نقص رہ جائے ۔

**جمن** ۔ جناب ہم اس غرض سے آپ کے پاس
نہیں آئے ۔

**ننھے خاں** ۔ مگر میں بارہ آنہ من سے ایک
چھدام کم نہیں لیتا ۔

**جمن** ۔ جناب اس مضمون کو چھوڑیئے ۔

**ننھے خاں** ۔ نہیں جناب اس سے میں
ایک کوڑی کم نہیں لوں گا ۔

جمن ۔ جناب ہمیں سب حقیقت معلوم ہے۔
ننھے خاں ۔ اگر معلوم ہے تو پھر تکرار کی
ضرورت ہی کیا ۔ میرا یہی نرخ ہے۔
جمن ۔ آپ تو مذاق کر رہے ہیں اور ....
ننھے خاں ۔ جی نہیں میں ہرگز مذاق نہیں
کر رہا ہوں ۔ میں اس سے کم دام نہیں لوں گا ۔
جمن ۔ اب کچھ اور بات کیجئے ۔
ننھے خاں ۔ ممکن ہے آپ کو کوئی اور شخص
مل جائے جو اپنا مال کم داموں میں دیدے ۔ مگر
لکڑی لکڑی میں فرق ہے ۔ اور میری ......
جمن ۔ اب اس بحث کو جانے دیجئے ۔
ننھے خاں ۔ میں حلفیہ کہتا ہوں کہ میں اس سے
ایک کوڑی کم نہیں لوں گا ۔ مرضی آئے لیجئے ورنہ رخصت
جمن ۔ لاحول ولاقوۃ ۔
ننھے خاں ۔ آپ کو یہی دام دینے پڑیں گے
میں نے صاف صاف کہہ دیا ہے ۔ گراں فروشی سے
مجھے عار ہے ۔
جمن ۔ افسوس ہے کہ آپ جیسا صاحبِ ہنر
شخص ان بیہودہ بہانوں سے اپنے آپ کو ذلیل کرے ۔
یہ کہاں تک جائز ہے کہ آپ جیسا ماہر حکیم اپنے آپ
کو دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رکھے اور محض انکسار
کی وجہ سے اپنی بے نظیر لیاقت کا اظہار نہ کرے ۔
ننھے خاں (علٰحدہ) یہ شخص ضرور دیوانہ ہے ۔
جمن ۔ اب آپ ہم سے چھپنا چھوڑ دیں
ننھے خاں ۔ کیا فرمایا آپ نے ؟
جمن ۔ اس چالبازی سے کام نہیں چلے گا ۔
دائی سے پیٹ چھپانا ۔ ہمیں سب کچھ معلوم ہے ۔
ننھے خاں ۔ کہئے آپ کو کیا معلوم ہے ؟
آپ نے مجھے کیا سمجھا ہے ؟
جمن ۔ یہی کہ آپ ایک شہرۂ آفاق حکیم ہیں ۔
ننھے خاں ۔ حکیم ہوں گے آپ ۔ میں کوئی
حکیم نہیں ہوں ۔ اور نہ کبھی تھا ۔
جمن ۔ (علٰحدہ) اس وقت اسے دورہ ہے ۔
(اونچی آواز سے) جناب مکرنے سے کیا حاصل
ہمیں دست درازی پر مجبور نہ کیجئے ۔
ننھے خاں ۔ آپ کا ان الفاظ سے کیا
مطلب ہے ؟
جمن ۔ یہی کہ حصولِ مدعا کی خاطر کہیں ہمیں
حد سے باہر نہ ہونا پڑے ۔ ہمیں ایسا کرنے سے بہت
قلق ہوگا ۔
ننھے خاں ۔ خوب شد ۔ ارے صاحب
میں کوئی حکیم وکیم نہیں ہوں ۔ معلوم نہیں آپ

کیا رٹ لگا رہے ہیں۔

**جمن** (علیحدہ) معلوم ہوتا ہے کہ ان لاتوں سے تیل نہیں نکلے گا (بلند آواز سے) جناب میں ایک بار پھر آپ کی خدمت میں گزارش کرتا ہوں کہ آپ راہِ راست پہ آجائیں اور جو کچھ کہ فی الحقیقت آپ ہیں۔ اُس کا اقرار کرلیں۔

**ممن** - اس طرح مکرنے سے کچھ فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ بس مان لیجئے کہ آپ حکیم ہیں۔

**ننھے خاں** - ارے صاحب آپ کیوں مجھے پریشان کر رہے ہیں۔

**جمن** - اُس بات کے انکار کرنے سے کیا فائدہ جو ہر ایک کو معلوم ہے۔

**ممن** - اس قدر جھوٹ - نعوذ باللہ - بھلا اس سے آپ کو کیا حاصل ہو رہا ہے۔

**ننھے خاں** - ارے بھائی جیسے ایک مرتبہ کہا ویسے ہزار مرتبہ - یقین مانو کہ میں کوئی حکیم نہیں ہوں۔

**جمن** - کیا آپ حکیم نہیں ہیں؟

**ننھے خاں** - نہیں۔

**ممن** - پھر کہئے - کیا آپ حکیم نہیں ہیں؟

**ننھے خاں** - نہیں بالکل نہیں کہہ تو دیا۔

**جمن** - اچھا - اگر آپ کی منشا یہی ہے تو امر مجبوری ہے - ہم حاضر ہیں - لیجئے - بسم اللہ -

(دونوں اسے زد و کوب کرتے ہیں)

**ننھے خاں** - بھائی - بھائی - بھائی - ارے صاحب میری توبہ - ارے بھائی ذرا تھمو - خدا کے لئے ٹھیرو - تم جو کچھ کہو وہ بننے کے لئے تیار ہوں - بس اب بس کرو -

**جمن** - آپ کیوں اپنی ہٹ دھرمی سے ہمیں ہاتھ اٹھانے کا موقع دیتے ہیں؟

**ممن** - آپ بے فائدہ ہمیں ایسی حرکت پر مجبور کرتے ہیں۔

**جمن** - میں اپنی اس نازیبا حرکت پر بیحد نادم ہوں

**ممن** - اور میں سچ عرض کرتا ہوں کہ میں تو پانی پانی ہوا جا رہا ہوں۔

**ننھے خاں** - صاحبو! آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ خدا کے لئے اتنا تو بتا دیجئے کہ یہ محض مذاق ہے یا آپ کی عقل گھاس کھانے گئی ہے کہ آپ مجھے حکیم سمجھتے ہیں۔

**جمن** - ہیں - پھر وہی بات - کیا ابھی طبیعت سیر نہیں ہوئی - کیا آپ حکیم ہونے سے منکر ہیں؟

**ننھے خاں** - مجھ پر شیطان کی پھٹکار اگر میں حکیم ہوں -

**ممن** - کیا آپ حکیم نہیں ہیں؟

**ننھے خاں** - اگر میں حکیم ہوں تو مجھ پر خدا کی لعنت - مجھے طاعون سمیٹے - (اس پر دونوں پھر اُس کی مرمت شروع کر دیتے ہیں) بھائی - بھائی بھائی - میرے اللہ بچائیے - اوئی میری اماں - ارے صاحبو! خدا کے لئے ذرا ٹھیر جاؤ - اگر آپ یہی چاہتے ہیں تو میں حکیم - میرا باپ حکیم - میرا دادا حکیم - میرا لکڑ دادا سکڑ دادا بلکہ تمام خاندان حکیم جو کچھ آپ کا ارشاد ہو ماننے کو تیار رہوں بجائے اس کے کہ کھال کی دھجیاں اُڑواؤں -

**جمن** - اب آئے آپ راہِ راست پر - شکر ہے خدا کا - آپ نے اب عقل سے کام لینا شروع کیا -

**ممن** - آپ کی یہ باتیں سن کر مجھے حقیقی مسرت حاصل ہوئی ہے -

**جمن** - میں اس گستاخی کے لئے بہ دل سے معافی کا خواستگار ہوں -

**ممن** - امید ہے کہ آپ میری گستاخی کو نظر انداز فرمائیں گے -

**ننھے خاں** (علیحدہ) نعوذ باللہ - یہ دھوکہ ہوا ہے یا میں واقعی بغیر کسی علم کے حکیم بن گیا ہوں -

**جمن** - جناب ہیں اپنا پورا پورا حال بتا کر آپ کو ہرگز ندامت نہ ہونا پڑے گا - آپ کی شان کے مطابق آپ کی خدمت کی جائے گی -

**ننھے خاں** - صاحبو کہیں آپ کو دھوکہ تو نہیں ہوا - کیا میں فی الحقیقت حکیم ہوں؟

**ممن** - بے شک -

**ننھے خاں** - حقیقتاً ؟

**جمن** - یقیناً -

**ننھے خاں** - مجھ پر خدا کی مار اگر اس کا مجھے پہلے ذرہ بھر بھی علم ہو -

**جمن** - جناب آپ کے کمال کا شہرہ تو تمام دنیا میں ہے -

**ننھے خاں** - اچھا ؟

**ممن** - آپ نے کئی لاعلاج مریضوں کو موت کے مُنھ سے نکالا -

**ننھے خاں** - واللہ -

**جمن** - ایک عورت چھ گھنٹہ تک بظاہر مردہ پڑی رہی اسے دفن کرنے لگے تھے کہ نہ معلوم آپ نے کیسی دوا کی صرف ایک بوند اس کے منھ میں

ٹپکائی اور وہ بیٹھا اٹھ کھڑی ہوئی اور کمرے میں ٹہلنے لگی۔

**ننھے خاں** - ماشاءاللہ

**ممن** - ایک بارہ سالہ لڑکا گرجا کے گھنٹہ والے مینار سے گر پڑا اور اس کے سر بازوؤں اور ٹانگوں کی ہڈیاں چکنا چور ہوگئیں - آپ نے اس کے زخموں پر ایک مرہم لگایا جس کے لگتے ہی وہ کود کر کھڑا ہو گیا - اور کبڈی کھیلنے کے لئے بھاگ گیا۔

**ننھے خاں** - سبحان اللہ۔

**جمن** - جناب اگر آپ ہمارے ہمراہ تشریف لے چلیں تو آپ کی خاطر خواہ خدمت کی جائے گی۔ تو منہ مانگی فیس ملے گی -

**ننھے خاں** - کیا مجھے منہ مانگی فیس ملے گی؟

**جمن** - جی ہاں بلا حیل و حجت -

**ننھے خاں** - تو پھر مجھے حکیم بننے میں کچھ عار نہیں - یہ بات میرے ذہن سے اُتر گئی تھی مگر اب یاد آ گئی - معاملہ کیا ہے - کہاں چلنے گا؟

**جمن** - ہم آپ کو لے چلتے ہیں - ایک لڑکی کی طاقتِ گویائی جاتی رہی ہے اسے دیکھنا ہے -

**ننھے خاں** - خوب - مگر مجھے تو نہیں ملی۔

**جمن** - ماشاءاللہ آپ تو خوب باذوق آدمی ہیں - آئیے چلیں -

**ننھے خاں** - کیا حکیم کے جبے کے بغیر ہی چل دوں؟

**جمن** - اس کی فکر نہ کیجئے - ہم لے لیں گے۔

**ننھے خاں** - (اپنی بوتل جمن کو دے کر) اسے لے لو - اس میں میں اپنا شربت روح افزا رکھا کرتا ہوں - (ممن کی طرف مڑ کر اور تھوک کر) تم میرے حکم سے اس پر سے گزرو -

**ممن** - واللہ یہ حکیم صاحب تو بڑے مزے کے آدمی ہیں - خوب رہے گی - میرا خیال ہے کہ یہ کام ضرور چلا لیں گے - کیونکہ بہت ہنسوڑ ہیں۔

# ایکٹ دُوسرا

## سین پہلا

جمن ۔ حضور خوش نصیبی سے ایک شہرۂ آفاق حکیم صاحب مل گئے ہیں ۔ آپ کی انشا اللہ اب ہر طرح سے تسلی ہو جائے گی ۔

ممن ۔ ان آنکھوں کی قسم دوسرے تو ان کی خاکپا پینے کے بھی قابل نہیں ۔ سب کو دھتا بتایئے ۔

جمن ۔ ان کے ہاتھ میں تو واللہ کرامت ہے ۔

ممن ۔ کرامت ! اجی معجزہ کہئے انھوں نے تو مُردے زندہ کر دیئے ہیں ۔

جمن ۔ مگر ایک بات ضرور ہے ۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کچھ سنکی ضرور ہیں بعض اوقات اُن کو دورہ سا ہو جاتا ہے جس سے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ حکیم ہیں ۔

ممن ۔ منسوڑ بھی ہیں ۔ مگر معاف کیجئے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے دماغ کی ایک آدھ چول ڈھیلی ہے ۔

جمن ۔ مگر سچ پوچھئے تو یہ بے پایاں علم و فضل کے لوازمات ہیں ۔ بعض وقت تو وہ شخص ایسی ایسی باتیں کہتا ہے کہ سننے والے کی عقل چکر میں آجاتی ہے ۔

ممن ۔ پس حضور ایک دفعہ کہنی لگایئے تو اس طرح فرفر باتیں کرتا ہے گویا کتاب پڑھ رہا ہے ۔

جمن ۔ اس کی شہرت یہاں بے حد ہو گئی ہے جسے دیکھو اسی کے پاس بھاگا جاتا ہے ۔

خاں صاحب ۔ بھئی تمھاری باتیں سن کر مجھے تو اس سے ملنے کا بے حد اشتیاق ہو گیا ہے ۔ فوراً بلا لاؤ ۔ دیر نہ کرو ۔

جمن ۔ لایا حضور ۔

لطیفن ۔ سرکار میری بات مانئے ۔ یہ حکیم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہوتے ہیں ۔ ایک کو نکالئے اور دوسرے کو چھپایئے ۔ لڑکی کا بہترین علاج یہی ہے کہ اس کی حسب مرضی کسی گبھرو جوان

سے جلد از جلد شادی کر دی جائے۔

**خانصاحب**۔ لاحول ولا قوۃ۔ دایہ تم خواہ مخواہ دخل در معقولات دیتی ہو۔

**ممن**۔ اری تو چپ رہ۔ تجھے ان معاملات سے کیا واسطہ۔

**لطیفن**۔ واسطہ۔ آسطہ کیوں نہیں؟ کہوں گی اور بیچ کھیت کہوں گی۔ اگر ساری دنیا کے حکیم آجائیں تو بھی کام نہیں بنے گا۔ لڑکی کو شادی اور ریشہ خطمی وغیرہ کے بجائے کسی اور ہی چیز کی ضرورت ہے۔ خاوند ایک ایسا پلستر ہوتا ہے جو لڑکیوں کی تمام شکایات کو فی الفور دور کر دیتا ہے۔

**خان صاحب**۔ سوچو تو سہی اس بیماری کی حالت میں اسے کون قبول کرے گا۔ جب میں نے اس کی شادی کی فکر کی تو وہ خود اس کی مزاحم ہوئی۔

**لطیفن**۔ وہ اس لئے کہ بر اس کی حسب مرضی نہ تھا۔ آپ اصغر سے کیوں نہیں اس کی شادی کر دیتے سب بیماریاں کافور ہو جائیں گی۔ اصغر اس سے اس حالت میں شادی کرنے کو تیار ہے۔

**خانصاحب**۔ اصغر جیسے قلاش کو بیٹی کون دے۔

**لطیفن**۔ اصغر کے چچا بہت ہی امیر کبیر ہیں ادھر ان کی آنکھ بند ہوئی اور اصغر کے چین ہیں۔

**خانصاحب**۔ یہ محض خالی خولی توقعات ہیں خدا جانے آئندہ کیا ہو۔ کوّوں کے کوسنوں سے ڈھور نہیں مرا کرتے۔ نوجوان ورثا کی دعاؤں کے لئے موت کے کان عموماً بہرے ہوتے ہیں۔ نو نقد نہ تیرہ ادھار۔ یہ بہترین اصول ہے۔

**لطیفن**۔ میں نے تو دنیا کو ہمیشہ یہی کہتے سنا ہے کہ شادی کے معاملہ میں خوشی کو دولت پر ترجیح دینی چاہیئے۔ والدین کو نہ معلوم کیا خدا کی مار ہوتی ہے کہ ہمیشہ اسی ٹوہ میں رہتے ہیں کہ لڑکے کے پاس کتنی جائداد ہے۔ یا لڑکی کتنا جہیز لائے گی۔ ابھی کل کی بات ہے کہ رحیمو نے اپنی بیٹی اس گھامڑ فضلے کے گلے منڈھ دی۔ محض اس لئے کہ اس کے پاس ایک چھوٹا سا کھیت بنّے سے (جس پر لڑکی فدا تھی) زیادہ تھا۔ اب اس غریب کی حالت دیکھئے کیا ہے۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے غم میں گھل گھل کر ہڈیاں نکل آئی ہیں۔ تین حرف ایسی شادی پر۔ آپ کو اس مثال سے سبق لینا چاہیئے بھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔ دولت چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ آج یہاں کل وہاں۔ میں تو اپنی بیٹی کی شادی اسی شخص سے

کروں گی جیسے وہ چاہے گی۔ بھاڑ میں
جائے دولت۔

**خان صاحب** ۔ خدا کی پناہ۔ دایہ تمھاری
زبان تو کترنی کی طرح چلتی ہے۔ خدا کے لئے
اب اسے لگام دو۔ کیوں خواہ مخواہ پریشان ہو رہی
ہو۔ غصہ سے دودھ خراب ہو جائے گا۔

**ممّن** ۔ (لطیفن کے سینہ پہ ہاتھ مار کر)
کیا ٹراتی ہی رہو گی۔ دماغ چاٹ گئی ہو سرکار کا۔
تم کون ہو دخل دینے والی۔ تم کیا اُن سے بڑھ کر
عقلمند ہو؟۔ انھیں اپنی لڑکی کی بہتری کا خود خیال ہے
جاؤ تم اپنا کام کرو۔ بچے کو دودھ پلاؤ۔

**خان صاحب** ۔ ہائیں ہائیں۔ کیوں گرم ہوتے ہو۔

**ممن** ۔ ابھی حضور میں اس کا مزاج درست کرتا
ہوں۔ بہت بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

**خان صاحب** ۔ بہت اچھا۔ مگر اس گرما گرمی کی
ضرورت نہیں۔ نرمی سے سمجھاؤ۔

# سین دوسرا

## جمن - ممن - لطیفن - خاں صاحب - اور ننھے خاں

جمن - لیجئے حضور - حکیم صاحب آگئے ہیں -

خاں صاحب - جناب سے نیاز حاصل کر کے بہت خوشی ہوئی - آپ کی بہت ضرورت تھی -

ننھے خاں - (حکیموں والا ایک عبا جبہ اور ایک نوکدار ٹوپی پہنے ہوئے) اقرار کرتا ہے کہ . . . ہم دونوں ٹوپیاں پہن لیں -

خاں صاحب - کیا حکیم لقراط نے کہا ؟

ننھے خاں - ہاں

خاں صاحب - کس باب میں ؟

ننھے خاں - ٹوپیوں کے باب میں -

خاں صاحب - ان کا کہنا سر آنکھوں پر ضرور ایسا ہی ہوگا -

ننھے خاں حکیم صاحب آپ کے معجز نما کمالات کا حال سن کر . . .

خاں صاحب - جناب کس کو مخاطب فرما رہے ہیں ؟

ننھے خاں - آپ کو

خاں صاحب - میں تو حکیم نہیں ہوں -

ننھے خاں - کیا آپ حکیم نہیں ہیں ؟

خاں صاحب - نہیں - ہرگز نہیں -

ننھے خاں - (ایک چھڑی اٹھا کر پیٹتا ہے جس طرح خود پٹا تھا) ٹھیک -

خاں صاحب - بھائی - بھائی - بھائی - مر گیا -

ننھے خاں - اب آپ بھی حکیم ہو گئے - میں نے بھی اس کے سوا اور کوئی سند حاصل نہیں کی تھی -

خاں صاحب - ارے تم کس مسخرے کو اپنے ساتھ لے آئے ہو -

جمن - حضور میں نے تو پہلے ہی عرض کیا تھا کہ یہ کچھ خبطی سے ہیں -

خاں صاحب - بھاڑ میں جائیں یہ اور اُن کا خبط - مجھے ان کی ضرورت نہیں -

ممن - سرکار اس بات کا مطلق خیال نہ کیجئے یہ صرف مذاق کر رہے ہیں -

خاں صاحب - میں اس بیہودہ مذاق سے
باز آیا -
ننھے خاں - جناب میں اس گستاخی کی جو
میں نے آپ کی شان میں کی ہے معافی چاہتا ہوں -
خاں صاحب - میں آپ کا خادم ہوں -
ننھے خاں - مجھے نہایت قلق ہے -
خاں صاحب - کچھ مضائقہ نہیں -
ننھے خاں - اس گستاخی کا . . . .
خاں صاحب - کچھ نہیں بگڑا -
ننھے خاں - جس کی مجھے آپ کی شان میں
عزت حاصل ہوئی
خاں صاحب - ارے صاحب! آپ خواہ مخواہ
پریشان ہو رہے ہیں - اس کو بھول جایئے - میری بیٹی
کو ایک عجیب عارضہ لاحق ہو گیا ہے -
ننھے خاں - میرے لئے عین راحت کا باعث
ہے کہ آپ کی بیٹی کو میری ضرورت ہوئی - میری دلی
تمنا ہے کہ آپ کو بھی اور آپ کے باقی اہل و عیال کو
اسی طرح میری ضرورت پڑے تاکہ میرے دل میں
جو آپ کی خدمت کرنے کی تمنا ہے بر آئے -
خاں صاحب - میں جناب کے ان ہمدردانہ
خیالات کا تہ دل سے ممنون ہوں -

ننھے خاں - یقین کیجئے کہ میں نہایت خلوص
نیت سے عرض کر رہا ہوں -
خاں صاحب - آپ کی عین ذرہ نوازی ہے -
ننھے خاں - آپ کی بیٹی کا کیا نام ہے
خاں صاحب - صفیہ
ننھے خاں - صفیہ - علاج کے لئے کیا اچھا
نام ہے؟ صفیہ
خاں صاحب - اجازت ہو تو میں ذرا دیکھ آؤں
کہ وہ کیا کر رہی ہے -
ننھے خاں - یہ لم تڑنگ عورت کون ہے؟
خاں صاحب - یہ میرے ننھے بچے کی دایہ ہے -
ننھے خاں - آنکھوں کی قسم - یہ تو زینتِ کاشانہ
بننے کے قابل ہے - اری دایہ - من موہنی دایہ
میری تمام حکمت تیری ادنی کنیز ہے - کاش کہ میں وہ
خوش نصیب طفل شیر خوار ہوتا جو تجھ جیسی حسینہ کے
دودھ کے مزے لیتا ہے - میرا تمام علم - میرا فن اور
میری لیاقت تیرے لئے حاضر ہیں - اور . . . .
ممن - بس بس حکیم صاحب ذرا چونچ سنبھالئے -
میری بیوی کو کچھ نہ کہئے
ننھے خاں - ہیں - کیا یہ تمھاری بیوی ہے؟
ننھے خاں ممن سے بغلگیر ہونے کا بہانہ کرتا ہے

ورہبٹ مڑ کر لطیفن سے لپٹ جاتا ہی) جہ خوب
مجھے اس کا مطلق علم نہیں تھا - یہ سن کر مجھے نہایت
خوشی حاصل ہوئی -

**ممن** - (اسے الگ کھینچ کر) ارے یہ کیا
بیہودگی ہے الگ ہٹو -

**ننھے خاں** - یقین جانو کہ مجھے تمھارے اس
جوڑے پر نہایت خوشی ہوئی - دایہ کو اس بات
کی مبارک باد دیتا ہوں (ممن سے پھر بغلگیر ہونے کا
بہانہ کرکے اس کے بازوؤں کے نیچے سے سرک
جاتا ہے اور جھبٹ لطیفن کے گلے میں باہیں ڈال دیتا
ہے) کہ اسے تم جیسا خاوند ملا اور تمھیں اس بات
کی کہ دایہ جیسی خوب رو - معقول مزاج اور گداز بیوی ملی

**ممن** (زور سے الگ کرکے) آپ اپنی تعریف
رہنے دیجئے - حد سے نہ بڑھ جایئے -

**ننھے خاں** - واللہ کیا موزوں جوڑا ہی -

**ممن** - آپ کو جو کچھ کہنا ہے مجھ سے کہیئے
میری بیوی کو اس تمسخر سے باز رکھئے

**ننھے خاں** - مجھے تم دونوں کی خوشی تہ دل
سے منظور ہے - (بغلگیری کا سلسلہ بے جھجک جاری
رکھتے ہوئے) تم سے بغلگیر ہو کر تمھاری خوش
نصیبی پر اور اس سے بغلگیر ہو کر اس کی خوش بختی
پر خوشی کا اظہار کرتا ہوں -

**ممن** - (پھر الگ کھینچ کر) ارے واہ حکیم صاحب
آپ تو بڑے مرشد نکلے -

endeavour to explain how and why.

ترا چنانکه توئی هر نظر کجا بیند
بقدر بینش خود هر کسی کند ادراک
تا نگردی آشنا زین پرده رمزی نشنوی
گوش نامحرم نباشد جای پیغام سروش

در حریم عشق نتوان زد دم از گفت و شنید
زانکه آنجا جمله اعضا چشم باید بود و گوش
[illegible]
[illegible]

(To be continued.) [illegible]

---

## NEWS & NOTES

***Welcome***

Mr Henry Martin—the well known Principal of the Islamia College Peshawar has been appointed Acting Pro-Vice-Chancellor of our University. By his life long service in the cause of Muslim education he has endeared himself to Muslim India. His regard and sympathy for Muslim Youth are well-known. One who could control, for years, people who inhale and breath "khyber air" can look after the youth anywhere. His methods seem to us if we are not mistaken to "conquer" by affection and not otherwise. He was a Professor here long ago and therefore, now that he has come back to us, he is not a stranger. He knows Aligarh and can guide us aright even in the period of transition. The University, we hope, will prosper and progress under him. We accord a hearty and sincere welcome to him on behalf of the members of the Intermediate College and hope that our College in general and the Magazine in particular will find a kind patron in him.

* * *

Our staff has been strengthened by the appointment of Messrs. Bokhari and B. A. Khan to the English Department of the Arts and Science Sides respectively. We welcome them both. It would not be presumptions on our part to say that in addition to their class work, the teachers at Aligarh take interest in the "out of class" life of the students also.

* * *

With this issue there has been a change in the Editorial board. The name of Mr. A. A. Puri appears in place of Mr. Sh. Abdur Rashid as Censor and Manager. Mr. Rashid has gone over to the History Department of the University. The loss of our College no doubt is the gain of the University. But the Magazine, will greatly miss him. He had from the beginning toiled hard to make it a first rate monthly. It is gratifying that before giving over charge he could see that his "pet child" had made great strides. Mr. Puri, we are told feels that it is not possible to achieve the same results without the knack and journalistic talent of Mr. Rashid.

We thank him for all he did for the Magazine. His work as Censor was by no means pleasant and if he could earn the gratitude of the Editor with all that, surely he possesses wonderful tact and talents. We wish him every success in life and hope that he will not forget us but will "infect" the other members of the University History Department with the interest he has in our Magazine.

در گلستان ارم دوش چو از لطف هوا
زلف سنبل ز نسیم سحری می آشفت
هوا مسیح نفس گشت و باد نافه گشا
درخت سبز شد و مرغ در خروش آمد
تنور لاله چنان بر فروخت باد بهار
که غنچه غرق عرق گشت و گل بجوش آمد
(حافظ رح)

and the melody of those never-failing birds of paradise.

دیگر ز شاخ سرو سهی بلبل صبور
گلبانگ زد که چشم بد از روی گل بدور
(حافظ رح)

The babbling fountain and the rushy brook are all there, while you sit beside your May Queen, carousing deep, on the brink of Kausar.

ساقیا سایهٔ ابر است و بهار و لب جوی
من نگویم چه کن ار اهل دلی خود تو بگوئی
کنار آب و پای بید و طبع شعر و یاری خوش
معاشر دلبر شیرین و ساقی گلعذاری خوش
زلف آشفته و خوی کرده و خندان لب و مست
پیرهن چاک و غزلخوان و صراحی در دست
نرگسش عربده جوی و لبش افسوس کنان
نیم شب مست ببالین من آمد بنشست
(حافظ رح)

But heaven forbid ! liquor it was not and liquor it will never be ; and woe betide the man who fancies or seeks to smell in this etherial cup an odour of liquor :

ساقیم خضر است و می آب حیات
توبه از می چون کنم هیهات هات

قوت شراب ده که ظلمات راه ایمن است
با آب ما ده ملبس اهی الله اکبر است
(حافظ رح)

The deeper you drink of this celestial cup, the nearer you are to Hafiz. But it is not everyone who can get at it.

ذره را تا نبود همت عالی حافظ
طالب چشمه خورشید درخشان نشود
طالب لعل و گهر نیست وگرنه خورشید
همچنان در عمل معدن و کان است که بود
بیا و معرفت من شنو که در سخنم
ز فیض روح قدس نکته سعادت رفت
طلب ز عشق مسیحا دم است و مشفق لیک
چو درد در تو نبیند کرا دوا بکند
(حافظ رح)

No money can buy it. No army can conquer its. No emperor in the world can offer it.

این سعادت بزور بازو نیست
تا نه بخشد خدای بخشنده

If the teaching of my great master makes for the elevation of the soul, if it is a divine cup brimful of that nectar which enables one to forget all the worries, the turmoils and the reverses and prepares him for fighting the battle of life with fresh vigour and energy, it is indeed the best teaching humanity has need of ; and no other teaching can compare with it. It is a teaching that suits the saint and the philospher as much as it does a civilian or a soldier. Nowhere has he taught us like an old recluse to leave the world alone. Nowhere would it eventually clash with an established order of society.

The only pity of it is, that he has been hopelessly misunderstood ; I shall

sured, by the wealth one can accumulate, or, the lands he may buy for himself, or by the so-called 'comforts,' he may be in a position to get together, or, by the luxury he may find it possible to enjoy. The aggregate of prosperity is to be a happiness, which nothing short of a philosophic contentment can give.

Modern education, while it seeks to develop the head, and, to a certain extent, the heart of man, leaves the soul entirely untouched. It is Hafiz, who knows how to enrich and elevate the soul. But it is not easy to find access into his heart of hearts.

عاشق که شد که یار بحالش نظر نکرد
ای خواجه درد نیست وگرنه طبیب هست
(حافظ رح)

Here you have to dive deep into the bottom of the ocean, ere you may dream of a clue to its priceless pearls:

در ره عشق نشد کس به یقین محرم راز
هر کسی بر حسب فهم گمانی دارد
خلقی زبان بدعوی عشقش گشاده اند
ای من غلام آنکه دلش با زبان یکیست
(حافظ رح)

A jump into the unknown is impossible. A long period of apprenticeship is essential. We have to start with a training. The essence of it is self-denial and self-sacrifice. There is no room for egoism here. Egoism and narrow-mindedness are barriers that must be broken through. What am I, but a dot in the illimitable universe, a drop in the ocean. The first step is the realisation of the self. This self will have to be merged in the Universe, or if you prefer to say so, in the common good of all. This will lead us on the road leading to the fountainthead of all goodness, all purity and beauty and love, the God of Love.

گرچه راهیست پر از بیم زما تا بر دوست
رفتن آسان بود ار واقف منزل باشی
(حافظ رح)

But eternal virtue, eternal beauty is nothing short of Islam. And, while, following the path of that eternal virtue, we are only unconsciously led to Islam; and it is through Islam that we obtain the simplest and shortest route to the ever-lasting happiness of the divine kingdom.

There is no royal road to our goal. Kings and peasants must follow the same path, as have done some of our kings of old. You have to forget what you appear to stand for in the visible world, so as to find an outlet into the invisible. No sham, no shallowness, no superficiality and no hypocricy. Thoroughness and efficiency are as much essential here as anywhere else.

Aritificiality is all that money can buy. It can no more buy happiness than in surrounding us with all the so-called comforts that we may believe we need, for that is after all a matter of belief, or rather of make-believe, mere toys for children to play with. Happiness is something totally different; and no money can buy it.

Turn any page of the Diwan at haphazard, take any couplet you will, you never miss the self-same delightful fragrance of sweet-smelling flowers,

# SIDE LIGHTS ON HAFIZ.

**By Azhar Ali Azad.**

Persia has had its own galaxy of distinguished poets like any other country in the world. She can boast of quite a host of them, but Hafiz was Hafiz and no poet in the world can afford to stand in his shoes. He towered above them all. He had soared highest, far, far above the limits where human vision could reach, and conquered for us empires undreamed of by Napoleon or Columbus.

How very fascinating was the music of his song, how very wonderful his diction. He was a poet for all ages and all times; and like the immortal bard of Avon, he still survives. Men have come and men have gone, but he never goes. He has come to stay. His eternal song, sung centuries ago, is still ringing in our ears, and will ring in the ears of generations yet unborn, till eternity. His melody, so softly beautiful, so sweet, so ravishing and yet with its import, so elusive, has been charming Asia for centuries and has now sought its way overseas to Europe. It is like the distant flutter of angels' wings, heard in the dreamland of ecstacy, half suspected, but never, never yet fully realized.

چو ماه نو رهٔ نظارگان بیچاره
زند بگوشهٔ ابروئی و در نقاب رود
کس ندانست که منزلگهٔ مقصود کجاست
اینقدر هست که بانگ جرسی می آید
(حافظ رح)

Hafiz has taught us that the kindling of the divine light within is the landmark from where spiritual advancement begins.

[illegible]

Love must be cultivated and love will pave the way leading to that advancement. This love must be universal, perfectly colour blind and not confined to the narrow limits of a particular nation or country. Love everyone. Wrong no one. Hatred is a blasphemy and the most unpardonable sin, because God is love and hate is Satanic. God's kingdom is divine. There is no room for hatred in it. A sufi fails to follow Shakespeare, for instance, where he happens to let fall a word here and another there in derogation of the Jew or the Turk. That is what Hafiz will not stand.

The question is not, how far an individual, or for the matter of that, a nation, can go on pushing his frontier of territorial possessions forward and forward, but, how far he can go in elevating himself and his brother man, and thus making the largest number of men and women happier and more prosperous. This kind of thing had already been done in the past by men like Khwaja Moinud-din Chishti of Ajmere and Sheikh Salim Chishti of Fatehpur Sikri, even in India. Prosperity, by the way, is not to be mea-

if you are disturbed in the middle you are apt to lose the link thus throwing yourself in confusion. But you can combat it if you learn how to overcome nervousness. You should not miss this opportunity and should take fullest advantage of the Union. You help the office bearers and I am sure they will help you.

## Magazine.

If you are shy and cannot face the audience as a speaker you can learn to become a good writer. Your College Magazine is there to help you. Last year when we started it I had expressed the hope that the majority of the articles would be contributed by the students to give them practice in writing. I am glad the last administration was successful. It has gone now to equally zealous hands and we will, I am sure, get the same results. The students, however, have not so far taken fullest advantage of this magazine.

## Uniform.

I am afraid we cannot wear all kinds of dresses always, except during the hot weather. We must be dressed alike. The stuff of the coat need not be the same in every case but we must conform to the form and cut. Same is the case with the head dress and the shoes. It is essential that we should be cast in the same die, and supreme affinity must prevail among us. The student should have the same respect and regard for his uniform coat as a private in the army has. It gives a shabby look to find young men keeping their collars unhooked and coats unbuttoned. When we are dressed alike we learn to think alike and this is a happy sign for the advancement of a nation. You may not like a particular dress but when it is a matter of duty you cannot shirk it. It is not honest to be a member of a community and not to abide by the will of majority. Be honest and brave, for honest people always are the source of strength of a community. Honest people know how to maintain discipline and the reputation of their Class, community and country.

* * *

One word and I have finished. I am afraid I can never say the last word on everything. I have said enough for the present but not for all times. Personal contact will give me many opportunities for doing that.

My chief complaint against you, my boys, is that very few of you come to see Mr. Kureishy. Many come to him as criminals perhaps more as plaintiffs or seekers of office or favours. Very few approach him as a father for help and advice.

To the office, come by all means, for the routine work. I shall listen to and decide your matters but do not treat the Principal as a machine. Meet him oftener to discuss your future as well as that of your community, and country.

I thank you for the excellent way in which you have listened to me.

in making a choice and do not come to tell me that you want to change from Arts to Science or Science to Arts because your friends have advised you to do so. On the choice of subjects, will depend, to a great extent, your future. It is, therefore, imperative that you should think deeply before you commit yourself to any choice. This done, you should diligently apply yourself to the subjects of your choice.

Degrees or certificates are no longer considered to be Passports for Services. Competitive Examinations require something more than degrees—real worth and ability. You cannot acquire this, my boys, if you have not made up your mind to lead a life of regular habits. You have teachers to guide you in and outside class rooms but surely they cannot drive or drag you. Discipline and manners affect your studies and consequently your future. It is, therefore, necessary to cultivate well disciplined and regular habits so that you may develop into good citizens. When once you have made up your mind for a thing it is very essential that you should stick to it. Character and firmness are the jewels of a gentleman and scholar.

## Games.

If you work you require recreation and exercise also. The doctrine of the survival of the fittest has changed its form but not its essence. Only such can live and thrive who are fitted with the requirements of modern times. A sound mind and a sound body are needed. I ask every one of you to devote your evenings to outdoor exercises. I am getting the fields ready and in due time shall appoint "Whips" also to help you to drive sloth out of you. I ask the Seniors and Captains to continue setting a good example for the other students. We have made great strides in this behalf with the help of the seniors but there is still room for improvement. I want every one of my boys to be punctually and regularly out on the fields and the rest we shall provide and manage.

## Union Club.

The Union Club is an institution for developing your oratorical faculties. In modern times of Constitutional development and progress the utility of public speaking cannot be exaggerated. To take your proper share in the battle of life you have to equip yourself with talent and ready wit. We cannot expect the Vice-President and the Secretary to run the Club smoothly if they are denied co-operation and help by their constituents. For encouraging speakers we have to show good taste and restraint. You may hiss or hoot when required but should not become professionals in hissing and hooting. Beware, it is cutting at the root of budding speakers. I do not advocate that you should tolerate or encourage "Bores." Speakers have to prepare speeches with due regard to matter and polish. Teachers and senior students may, by all means, be consulted but it is essential that confidence in self be cultivated. My friend Mr. Puri will be able to tell you better but what I feel inclined to think is that there is no harm if speeches are committed to memory in the beginning. Some of the greatest speakers started their careers in this way. The only difficulty is that

# PRINCIPAL'S SPEECH

**Delivered on 22nd July, at 11 a. m. in the Marris Hall.**

My boys,

I have asked you to assemble here this morning, not with a view to read out to you any learned academic dissertation but with the sole object of welcoming you as new members of our large family and to talk to you about the special features and traditions of the family which you have joined and for conveying personally to you all the message of Aligarh. As Principal and as an old boy I take delight in addressing you and to enable you to try to become true sons of Aligarh. How to become one ? is a question I will briefly attempt to answer today and shall try to do the same every now and then, when I get the opportunity to do so.

As compared with the last year our numbers have decreased due to various reasons—external and internal. I deplore it ; for the strength of our family should not be allowed to impair or deteriorate. But if we feel that it is necessary to sacrifice quantity for quality, we should readily do so.

I am very glad to welcome those who have newly joined and hope they will soon settle down. Although I have not received any reports about disturbances, but having been educated here my self, I understand that the "onslaughts" of the old students on the intelligence and wits of the New Comers and of the seniors on the juniors are not unusual or uncommon in a residential institution. I have sympathy for those who may have felt disquietude and assure them that it will be all over very soon. To the seniors, I ask to cry halt. It is time now for us to settle down to work and with mental worry it is not possible to achieve concentration necessary for serious work. The difference between residential life here and elsewhere is that here you feel quite at home after a short sojourn which may not be possible elsewhere. The first impressions of the new comers may not be as encouraging as their subsequent experiences. They should bravely and boldly put up with everything and return the jokes or feats of wit and humour with compound interest even if it is not possible to turn the tables over their assailants. It is cowardice to ask for shelter from people of the same district or same province. The provincial and district spirit is subversive of Aligarh spirit. Students come to us from all parts of India and surely they have to bear great trouble and expense. There is no dearth of colleges in the different provinces and states from which most of you have come but if you skip over all and come to us you are actuated by something higher, nobler and loftier—All India spirit nay Muslim spirit. Learn this thing during your stay here. You should as far as possible associate and live with men of other provinces and not only those of your own. Learn what is best in them and impart to them what is your speciality.

In studies, games and Union you should make your mark. The choice of subjects is an important factor. Exercise your own discretion, taste and inclination

# HERE AND THERE.

To obtain a single ruby thousands of tons of soil have to be washed and examined. The finest of these gems come from the great ruby mines of Burma.

* * *

At one point in England 30,00,000 tons of traffic pass annually both ways over a roadway only 15 feet wide. It is in Warrington, on the road between Liverpool and Manchester.

* * *

A Chinese manuscript proves the startling fact that Anaesthetics were used in China 1700 years ago. A concoction given by the doctors before performing a surgical operation rendered the patient unconscious. The Anaesthetic was a simple preparation of hemps.

* * *

A cousin to the present day elephant was found in Siberia more than a hundred years ago by some explorers. The huge carcass was frozen and so well preserved that the explorers' dog actually tore the flesh from the bones and ate it. Geologists are of the opinion that these animals inhabited Northern Siberia more than a hundred years ago.

* * *

In July, 1928, a boy in Labrador caught a common tern and put an Aluminium band round its leg. After 13 months the same bird was caught off the extreme south coast of Africa, 9,000 miles from Labrador. This is accepted by authorities on the subject as the longest flight by a bird on record.

* * *

A man, when medically examined by some Bomby doctors, surprised them by the fact that his heart beat appeared to be coming from the right side. A closer examination revealed that not only his heart but his liver, too, was reversed. An X-Ray examination confirmed this discovery and it was found that all his organs including his stomach were exactly opposite to the natural order. The man is left-handed but is quite healthy.

* * *

Excavations in Italy have revealed a part of the city of Herculaneum, buried for over two thousand years as a result of volcanic eruption. A house complete with porch, terrace, rooms and windows has been brought to light by excavations. There is a kitchen, too, filled with pots, pans, ovens and a little oil lamp. A gymnasium and a theatre, large enough to seat two thousand people, are steadily uncovered. Future visitors to Italy will enjoy the thrills of seeing a real Roman city.

* * *

Soviet Russia has also followed the example of Turkey and adopted the Latin Script. A Soviet official in the Education Department declares that this would make it easier for Russians to learn other European languages and will strengthen the international ties.

> As welcome as sunshine in every place,
> Is the beaming approach of a good-natured face;
> And as welcome as sunshine, like warmth to impart
> Is a good-natured word from a good natured-heart.

A kind-hearted person is generally happy and optimistic. One cannot show kind-heartedness to others without feeling happy himself, for kindness is twice blessed.

"It blesseth him that gives and him that takes."

Just as "kind hearts are more than coronets" so too is the simple birth of the average man better than being of "Norman blood."

There was a time when noble birth gave one many advantages in life, when it was indeed a "SINE QUA NON" to society. But *the old order changeth yielding place to new.*

In this advanced and democratic age of today all such differences are overlooked. Now the son of a farmer has the same prospects in the battle of life as the son of a Duke, provided, of course, both have received the same education.

After all a man is the maker of his own fortune, and it matters little how illustrious and great one's ancestors were unless he himself is so. In fact he who has nothing else to boast of but his noble ancestery is like a potato—the only good belonging to him lie underground.

In a way it is luckier to be born in humbler surroundings than with the proverbial silver spoon in one's mouth. It is only when one finds himself at the bottom of the ladder that one makes a gallant and manly effort to reach the top. More often than not wealth prevents a man from proving his worth.

One can quote many instances where the poorest of men have risen to the highest of positions. The most renowned President in the annals of the history of the United States of America was the son of a wood-cutter while the one who adorns the office of the President of the same country today was but a news-paper-boy in his youth.

However parodoxical it may appear at first, one does not take long to realise the truth of Shakespeare's famous lines;—

> Sweet are the uses of adversity,
> Which, like the toad, ugly and venomous
> Wears yet a precious jewel in his head.

The be-all and end-all of one's existence in this "naughty world" is but to lead a good and peaceful life. It matters little whether one be rich or poor, of humble or noble birth.

Having infused into human beings greater intellectual power and a keener sense of feeling, the Creator expects men and women to play their parts well and honourably.

> We are born to do, not to dream and doubt.
> To learn life, how best to spend;—
> To live a life of use to all around,
> A help to those who are trodden on the ground,
> To do the good, and scatter deeds of love
> On all who come within our little round.

to be very large fish; the largest, I have seen was caught the morning of which I have just been telling you and it weighed sixty pounds. I have almost exhausted the subject and I must bid you farewell. I wonder if you fish like this ever in India?

Well Cheerio and good loud Australain Coo-ee!

Your Australian friend,
*Eddie.*

# QUALITIES OF A GENTLEMAN.

**By M. A. Didi.**

Kind hearts are more than coronets,
And simple birth than Norman blood.
(*Tennyson*)

From time immemorial man has been stirred on with the ambition of having high titles bestowed on him, and even to this day people of England take great pride in saying that their ancestors came with the Conqueror, for still in such honour and esteem do they hold the Normans. Hence the significance of the above lines.

But what are all these to a man if he lacks simplicity and kindness of heart, which are the greatest assets of a gentleman?

In common courtesy we are all called "gentlemen." But, alas, how few of us deserve that honourable name?

To be a gentleman is not a matter of birth or of wealth. One who is entitled to be called so should possess a noble and sincere character, and above all a kind heart, a heart, like Miranda's, that suffers with those that we see suffer. Nobility and sincerity of character cannot be cultivated in a man any more than mercy can be forced out of one.

The quality of Mercy is not strain'd,
It droppeth as the gentle rain from Heaven.
Upon the places beneath.
—*Shakespeare.*

But these are natural qualities with which few men and women are blessed.

The possessor of a kind heart and a genial disposition can win the love and respect of many and is always welcomed with open arms to every society. Such a man, or woman, cannot be in any place without brightening up things, and without winning the heart of every one present

The present Prince of Wales owes his world-wide and unparalleled popularity not so much to the fact that he is the Heir-apparent of the throne of England, as to the fact that he is the proud possessor of a kind-heart and a genial disposition. Such men and women can generally be recognised even by appearance. For, genial and a good-natured face often indicates a kind heart within.

Kind words, too, are worth much and cost little. How often does one's heart warm towards a mere stranger by a single kind word uttered?

Nothing is more encouraging to a soldier than a kind word from his commander and nothing leaves a more lasting impression on the mind of a student than a kind word from his teacher, while to the sorrow-stricken a kind word acts like a balm.

## *Our Australian Letter.*

# CATCHING COD —NOT BY A ROD.

By Edrie Thomson.

[Miss Thomson, of Australia, is a new addition to our foreign correspondents. Her article, we hope, will be appreciated by all and especially those interested in Geography. Ed.].

Dear Friends,

Some years ago, I had a rather uncommon experience, which will perhaps interest you.

It was while I was living at a cattle farm situated on the banks of the Gwydir River.

Now, if you will open your Atlases and find a map of new South Wales, you will see that the Gwydir rises in the mountains of the Northern Tableland, and flows along its twisted course, past town and village, farm and field to the great Darling River.

When it rains in the hills the river is flooded without there being rain near its mouth. The time, I speak of, was rather a dry season, and the river near my home which stood on its banks, some eighty miles from its head—was almost only a chain of water holes. Then there were good rains up among the hills and we went to bed at night after looking at a tiny tricle of water that flowed down between steep dry banks and was only a very poor apology for a river. When we awoke, we heard a sound, unheard for many long months, the soft murmur of running water, and on going to look we found the river as large as anything—a broad, deep stream of very dirty and muddy water. We decided to go fishing—not the ordinary fishing done with rod and line.

We armed ourselves with short sticks, all between two and three feet in length and not too heavy, and made our way to the river.

All the farm hands took a holiday to join in the fun, everyone having pleasant feeling of getting large fillets of fish, steaming hot, for the morrows breakfast. All that was necessary to catch our game was to walk along the edge of the water and tap the heads of the fish that were all lying as near the shore as they could get. When tapped on the head with the sticks they gave a mighty spring and landed high and dry on the grassy bank.

It is a strange way of catching your breakfast. Isn't it, friends. The fish have been lying in their deep pools and when the sudden rush of water comes they are washed out without any "notice" and the water being muddy they become sick and only float near the bank far from the main current. We caught many fish that morning, only taking the largest Cod. Jewfish and the Bream, etc., are all very nice—but only when you cannot get Murray Cod.

The Murray Cod are so called because they were first found in the Murray River (they are to be found in almost all of the Australian rivers). They are a distinct variety, and not at all like the cod of the sea. They grow

[illegible] Babu told me that there was [illegible] the next morning except an [illegible] a mail which did not stop at [illegible]pore.

I was at the point of fainting. No food and sleep for the last eighteen hours and no hope either for further fourteen hours. This was more than I could bear. I went to the waiting room and sat brooding over my unfortunate experiences when I caught sight of a HALWA-PURI-WALA in the station compound. I purchased some Halwa and a few puris of him, returned to the waiting room, and ate them most greedily.

Being dreadfully tired and having had no sleep in the train I fell asleep on a broken wood couch in the waiting room.

"Your train is on the platform, sir," howled a Railway Babu in my ears and opening my eyes I saw that it was broad-day light. Seizing my coat, I ran to the platform and jumped into the first compartment. Hardly had I seated myself that the train moved, and with the motion of the train I remembered something. I had forgotten my attache case in the waiting room. Added to the crocodile leather attache case, were one shirt, one collar, a towel, a pair of hair brush, comb and other toilet requisites and the loss amounted to something between sixty and eighty

"Troubles never come alone," I muttered and sat lamenting.

I phoned from the next station to the station master of Karagpore and he very politely replied that despite a thorough search he found nothing in the waiting room.

I lost all hope of getting back the lost articles and attributing it to *kismet* tried to forget all about them.

Of course on reaching Hyderabad I got a good long speech on "How to keep one's luggage safe while travelling" from my father and suffered from fever for the next three days.

I had hardly recovered from the fever when at break-fast I got another summons from the Magistrate asking me to present myself at his court. I did not even read it to the end and tore it in as many pieces as I could and threw it out of the window. I had decided not to go again to Karagpore.

But that was not the end of it all. I had to spend sixteen more rupees on the medical certificate and sent it to the Magistrate along with a long letter from my father telling him of how ill I was and that how dangerous it would be for me to travel in hot weather.

A week later I got a letter from the Magistrate of Karagpore saying that the case had been dropped. What became of my wrist watch I do not know even to this day.

---

[illegible] is [illegible] great price, and [illegible] at the expense of [illegible] makes a wise and [illegible]lguy.

He who cannot forgive others breaks the bridge over which he must walk himself, for every man hath need to be forgiven.

* * *

Magistrate of *Karagpore* (in which district Dogra was situated), requiring my presence at his court on Friday.

Friday. Ya Allah! That day was Thursday—meaning thereby that if I wanted to be at Karagpore by 10 o'clock I should catch the 11 a. m. train at once.

I had not the slightest intention of going—I had lost my watch for good. Even if there was any chance of recovering it who would undertake a troublesome journey, and spend about thirty chips—for a wrist watch which my grandfather had bought in his school days for not more than seventeen. But there was another side of the affair which my uncle dilated upon at length for about half an hour.

"You know, if you don't present yourself at the court of the Magistrate tomorrow you will be courting the displeasure of a Government official", threatened my uncle, "and may be your name is registered in his black-book."

I did not want to 'court the displeasure of a Government official' as my uncle had put it—and so I went.

I reached Karagpore Railway station the next morning at nine. On enquiring of the station master as to how far and in what direction was the court of the Magistrate I was informed that if I went straight for a mile and then turned to the left, a further trampling of about two miles would bring me to the local post office from where the course was only half a mile to the right.

I started. I had hardly covered a mile when the heat of central India compelled me to take off my coat and putting it on my shoulder I moved on. My condition can be well imagined than described. An attache case in the left hand, the coat on the right shoulder, dust on the shoes and on trousers upto the knees and perspiring all over I reached the court of the District Magistrate.

On enquiry I learnt from a peon that my case would be taken after lunch. But after the Magistrate's lunch or mine—that I was not told. But he must have meant the former for I got no lunch. I roamed through all the bazars of Karagpore but got nothing to eat or drink. There were some sweet-meat shops but the sweets were so covered with flies that I shuddered at the very idea of eating them.

I kept on enquiring from the peon about my case and he kept on telling me "Sahib, abhi hota hai." The court gong struck two—then three—and at last four and I was not yet called. The Magistrate—a burly bulky Englishman came out of the court and when he was informed by the peon that I was waiting, blankly replied "AJ-NAHIN. I will summon him some other day," and went.

How I wished, then, I had not come to the court. I wished I had never owned such a thing as a wrist watch. I even wished I had never travelled on that beastly line on that day.

But all these thoughts were soon repelled by the thought that the down train left at 5. 15. It was quarter past four and I had three and a half miles before me. I made my way back to the station as quickly as my legs could carry me; but alas—the train was gone. Even the consolation that the next train would be there in a few hours time was gone

## MY WRIST WATCH.

**By Tahir Husain Zuberi.**

I have taken a vow never to use a Wrist watch again ; and I am one of those who mean what they say. And what led you to such a decision ? one may ask. It is because the hardships, inconvenience and troubles caused by my first wrist watch were experiments not to be forgotten.

It all happened when the college having closed for the Summer Vacations, I was going to Hyderabad, my home.

I left Delhi on the afternoon of 21st April, comfortably installed in my berth. Nothing worth mentioning happened and at about 10 p. m. I fell asleep.

Being tired after shopping at Delhi I slept soundly till 7 in the morning when I was awakened by the stopping of the train at a small station called Dogra. My compartment was deserted. all my fellow-passengers having alighted during the night. I kicked away the blanket and made my way to the bathroom. Just as I was entering the bathroom I perceived a figure clad in navy blue enter the compartment. He was a Railway sweeper.

After toilet I returned to my berth and looked under the pillow for my wrist watch which I, after the fashion of all gentlemen, had left there.

It was gone and with it the sweeper too.

I alighted on the platform and found the culprit in the adjoining compartment dusting the berths. He looked the most perfect picture of innocence and I hesitated a moment before I asked him if he had seen my watch. Of course he replied that he had seen no watch and I was about to return to my compartment when I saw the end of my watch strap peeping out of his shirt pocket. I followed a bold course of action and seizing the thief's hand recovered the watch. This restoration was unfortunately performed before a limb of the law. I say "unfortunately" because this was the beginning of all trouble. It is needless to say that I had no desire to have the culprit punished ; all I wanted was my watch and that I had got

But this was not for me to decide. A police-man had observed the recovering of the watch from the sweeper and he took the matter in his hand. First he requested the Guard to detain the train for a few minutes as, he said, "an important *waradat* has happened." Then he proceeded to my compartment and examined the place from where it had been stolen. Then taking down my name, father's name, caste, religion, occupation, college address, home address and many other details, took the prisoner in custody and also the watch as a piece of evidence.

I reached Hyderabad next day, without any other incident and had decided to forget all about the watch which I considered now as irrecoverable. But little did I know that there was further calamity for me in store.

About two or three days after my arrival at home I got summons from the

mined to draw him into the field of the debate.

"No, you *listen to me*," he shouted.

I sat as one dead, and blinked at him, surprised at the turn the events had taken.

"*What is your opinion about my new* suit," he asked getting up to display his new fancy. I, in my fury and eagerness to open the debate had forgotten that he was wearing a new suit.

I rapidly thought in my mind, and came to the logical conclusion that surely if he had no opinion on civil disobedience I too would have none about his suit.

"Here, what are you thinking of," he *cried breaking into my logical thoughts*, "I have asked you a question."

"Fine, excellent stupendous, glorious," I pounded out, and then in the same breath, "I say what is your opinion about the civil disobedience movement." and thereby I tried to reduce him into an argument.

"Yes, it is fine," he said "How much do you think I paid for it."

Now what the Hell did I care how much he paid for it, why the devil was he asking me.

"Ay," he said getting impatient." Are you deaf? can't you answer a civil question."

A civil question, I mused. Well, I didn't see anything military about mine. Surely if he could not answer my question, I was determined not to speak.

"Ay," he hissed pulling my ears, "what's the matter, are you Dumb?"

I got up in a rage determined to tell him what I thought of him but on second thought I knew that it would be impossible to tell him all what I thought of him.

"Well," I spluttered catching an end of his coat, and making a very shop-keeper-like face, "about a rupee a yard."

"You idiot," he screamed, "you mean to say that I paid Re. 1 a yard for this, this is my best serge suit, and cost me Rs. 7 a yard."

"Rs. 7?" I exclaimed pretending to look surprised, "by God yo're clever, why, my brother bought the same for Rs. 10 a yard." I lied again.

"Your brother," he sniffed, "you once told me you had none."

Yes, that was true. This is true also.

"Yes," I replied," Do you think Gandhiji is justified in launching this movement."

"Yes," he replied.

I could hardly believe my ears, at last I thought I had brought him round into my debate, and then a smile of triumph lit my face.

"Yes," he kept on muttering, "your brother bought it for—?"

The smile died upon my lips, I jumped up, the strain was too great for me.

"Good bye," I muttered through my clenched teeth, and as I turned to go my foot again hit that accursed rug and I sprawled out of the room, making as dramatic an exit as I had an entrance.

"You clumsy idiot," were the words sent out after me.

I got up in a daze, picked up my cap, swearing and cursing at that logic that had brought me into such a mess. I went home a more thoughtful and cautious fellow. That was the last debate I swear that I would ever have with a sportsman, and I can swear that if at that moment any logician had crossed my path he would have done so at his own risk.

hatred in the hearts of the ignorant people. And this is the greatest barrier on the way to "Freedom."

The question is: Is religion unnecessary and meaningless for the co-operation and harmony of a people? The answer ought to be plain. We will, at this stage, take the case of our own religion. It is surely a mere interpretation of Nature. It teaches us nothing but a way to live in absolute peace and harmony in this world and in the next. It means in its way the denial of self—the annihilation of self. It is yet the highest wisdom that Heaven has ever revealed to our Earth.

If we follow Islam which is a sure source for the world's peace and harmony, there is no reason what-so-ever why we should not be acquainted with the meaning of the very word "Toleration." Islam surely teaches us the very noble qualities of toleration. And it is a clear violation of our own religion that we don't realize the importance of Hindu-Muslim Unity today in this country.

Religion is taken as a mere excuse for our faults and selfishness. Crimes are perpetrated in the name of religion. Hindu-Muslim differences exist in this country, they say, because the Muslims want to protect their religion.

Islam is a religion which is strong enough to take care of itself. It is not, like many other religions, confined only to the four corners of the Indian peninsula, or to the Mussalmans of this country. It is a "world-wide" religion, and even if its ill-wishers were to succeed in their wild aspiration of carrying on a propaganda against its progress in this country or in any other, Islam will surely not suffer in the least but will shine forth as brilliant and bright as ever.

Is it not, therefore, mere childishness that we say Hindu-Muslim Unity is impossible in India because we want to protect our religion? Brutus is said to have committed a crime in order to prevent a greater crime: Similarly the Muslims of this country quarrel with the Hindus against the teachings of Islam because they want to protect their religion.

No wonder we do so, or it happens to be so. Why? Because the Moulvi, whose obscurantism clouds the enlightened views of the youths of this country, has got a very strong grip over us. He strongly holds us back from both progress and the knowledge of our religion. And this is the reason why we are today in the depths of an unfathomed ocean of perfect confusion.

Look at the case of women in this country. I mean the poor veiled Muslim women. The unfortunate creatures are kept in bondage. They are never given the slightest training. They are strictly chained within the four walls. And why? Because we want to protect them.

I wonder if women are created to be treated by men like animals and simply to satisfy our desires, and act as our slaves. It is a pity that we deprive them of the position of human beings.

Indeed the most essential step to be taken to win freedom, is the emancipation of our women who will honour us by their graceful co-operation in the field

not fit for it." It is a pity indeed. For surely it is not for them to judge whether we are fit or not for independence.

Sometimes, those who believe that freedom is to be got as a gift, are resolved to beg the British to make them free as they themselves are. To this their reply is : you need not poke your nose in our affairs. You are not our equals. It means that the Britishers endeavour to show us that East is East and West is West. But our whole effort is to make them realize that East plus West is the best.

It is not an easy task to obtain our ultimate object. It can't be achieved by mere words. But where there is a will there always is a way. We must remember solid deeds often bring good results. We must put aside a spirit of pessimism and put in its place a spirit that glories in the overcoming of obstacles. Our self-sacrifices are sure to bless us with freedom. Let us, therefore, hurry up to buckle our armour and begin our march. We will not make a halt unless and until "Freedom" is ours.

It is not absolutely necessary that we should succeed in our efforts just today. For failure is almost a part of freedom. Since we are free to succeed we must also be free to fail. But let us not leave even a single stone unturned. And we are certainly not pessimistic because :—

Freedom's battle once begun
Bequeathed by bleeding Sire to Son,
Though baffled oft, is always won.

In the meantime, there are many obstacles that stand in our way. The greatest calamity is the Hindu-Muslim question. Unless and until we come to a perfect understanding, freedom will be quite meaningless to us.

I am again and again reminded of the Nehru Report which was very narrow-mindedly introduced simply to add fuel to the fire of communal hatred and which has fortunately been dropped by the Congress as it deserved to be; of the Sarda Bill which has recently been passed by the Assembly as well as the Council of State, and of the strong opposition shown towards these by a certain section of Mussalmans.

It can't, however, be said that this section is from among the uneducated. For we recently saw the stirring statement made to the press by Maulana Mohammad Ali opposing the Sarda Bill. It is, however, interesting to note that despite the ability of the Mussalman's pleading, in the tune of perfect communalism, to reject the law of child marriage prevention, he was many a time rediculed, criticised and censured by even a very young Muslim lady. She made it clear that though she had great regard and respect for him, yet she was at a great loss to appreciate or accept the statement where in the Maulana had been led away from being a reasonable person to support child marriage which Islam, as the Maulana himself admitted, does not explicitly enjoin.

We can, therefore, just imagine the nature of the opposition of the uneducated mullahs. We do not hesitate to conclude that these oppositions are nothing, but, taken as a whole, a kind of selfish device to excite communal

not in accordance with the insulting recommendations of an all white commission, but a change which may encourage socialism to overcome individualism and thus relieve the poor starving masses of this country. We want that the foreign spoliation and exploitation must now cease. Surely it is high time for such to disappear altogether. And if a certain section of some unfortunate people is to support it, we must force them (by non-violent means) to assert themselves and to have some self-respect. We must boldly declare that we are entirely tired of bearing the yoke of slavery, and will bear it no longer. We will certainly remove the foreign exploitation for ever and ever.

The question is : How can we achieve that freedom ? This time the answer is very difficuit. For had it been an easier one, we would have been free to-day.

However, some are of the opinion that it can be got as a gift from the present rulers while others preach the use of violence. This preaching, fortunately or runfortunately, is winning the hearts of many youths in this country. These enthusiastic youths are firmly resolved to do some bold deeds, even at the risk of their own lives. They believe that independence will only be won by strict means of violence.

I hold both the above opinions as mere moon shine. It is, indeed, gratifying to note that the sense of duty to their mother-land is rapidly gaining place in the hearts of our younger generation. But equally and more it is deplorable to see that they are not diverting their energy into more useful channels

It is, therefore, not surely the means by which we can achieve our ultimate goal. Since we want to get a peculiar kind of freedom of which, unfortunately, we rarely think, it is also necessary to achieve it by some means of which we do not so often dream.

We have said that individualism is wholly opposed to us. Our aspiration is not selfish. Then what is it, I ask, that makes them to be inclined to throw bombs on innocent Englishmen ? It may be said that it is because of the ruthless repression and inhuman treatment meted out to our national leaders. But this argument does not hold good, for, we should, in no way, persue the path of violence.

Why should we make the Britishers our enemies ? And if they really are, why should we not convert these enemies into our well-wishers so that they may also join us in the struggle for the common cause of humanity ?

Let them not sit idle. Let them realise that we are no enemies of theirs. Let them be sure that we do believe in equality, co-operation, harmony and peace. Let us rather force them to open their eyes which could not be done by the knowledge of Science and literature they possess, and show the fact that there are only a few conservatives who, in this century, pretend to believe in the so-called "Divine Right" while the whole world is against their imperialism—the greatest curse for the uplift of human beings.

But when we talk about freedom they are ever ready to remark, "you are

# TURN A NEW LEAF.

**By Ibrahim Hilmy**

Stand upright, speak thy thought, declare,
The truth thou hast, that all may share,
Be bold, proclaim it everywhere,
They only live who dare.

To-day, there is the talk about Freedom. It is everywhere—in the lecture rooms, play-grounds, union and so forth. It no more belongs to followers of Mr. Gandhi only. It is on the lips of almost every student. It has become still more popular since the launching of civil disobedience movement by the reverened Mahatma.

When people talk about "Fareedom," it sounds very very pleasant. It is positively affirmed to be the birth-right of every nation—nay every individual. It is, indeed, suitable, and everybody aspires to have it. But the bare fact is that we often desire before deserving!

Suppose we get "freedom" to-day. And what have we to do with it? Oh, surely we will take it. "Well," we will exclaim, "Free, free, quite free!" Then perhaps we will go along the streets singing that we are free.

On the way we meet a gang of people who are in the habit of causing inconvenience to others. And we are nicely slapped and kicked by them, because they, too, are free. Somehow we get rid of them, but again, at a little distance off, meet another gang of robbers. For these persons are also free to rob others just as they desire. At last when we return home we, although free, will be in a very sad state of mind, indeed. For we will have to do nothing but press the hurt limbs and grope in our empty pockets!

This picturesque idea of freedom is still clearly represented when we just think of a fox being present in a hen-roast. For then the fox is free to jump over the hen and the hen to cry out and be eaten. This is, indeed, the freedom enjoyed by the late Bacha-Saqao and his followers. He was also free in whatever he did. To him man-slaughter was a rare virtue. From the time he usurped the then-progressive Afghanistan till the end of his short reign of terror, Bacha Saqao enjoyed a sort of freedom of which the most striking features were slaughter of many an unfortunate man, woman and child, and the reduction of the country to a most barbarous and savageous state of existence!

But is it the freedom we claim for? Do we want to get rid of the present government and take their places in the field of exploitation and plunder? Should we, if possible, roam over the world and loot it in the name of liberty? On our answer will depend not only the future of this country but of the whole world.

Certainly by "Freedom" we do mean something more than many of us often think about it. We don't surely mean to have a mere selfish substitution of the bureaucracy. Nor do we mean the free actions of a mere individual.

But all we aspire to achieve is an immediate change in the present order of things in this country—a change surely

High up above the set in a glass cabin sits the *mixer* who controls the sound. He cannot hear the actors directly but through a loud speaker and he tones their voices down and amplifies them to the volume required when they will be heard in the cinema. This is simply done by the turning of a switch.

Above all actors, out of camera range, hang microphones. They are suspended above every place the actors are expected to occupy.

One cannot help wondering, when complete silence is the order of the time when a talkie is being shot, how do the directors, the camera man and the *mixer* receive instructions. The instructions are given by a signaller who stands in a corner by an indicator board. As long as the scene is being shot he is the monitor of the whole company. When he sees that the camera man, the actors and the mixer are ready a red bulb glows on the switch board. A shriller whistle blows, the director waves his hand, the actors begin enacting their parts and the camera and the microphones begin their work. Throughout the shooting of the scene the signaller gives his directions in this silent electrical language.

There is a funny aspect of talkies-making also. All the dresses worn by the actors must specially be treated with beforehand otherwise the microphones will make their rustle sound like the marching of soldiers. No actor or actress is allowed a floating dress; that is why in a marriage scene in a talkie we don't find the bride wearing a veil. Even if a letter is to be read during the scene it must be damped previously or the microphone will make it sound like the cracking of wood in a newly-lit fire.

The sound of the voices is carried, through the microphones, to the recording apparatus. There are two ways of recording sounds. Either they are recorded on a wax disk, as in the case of a gramophone record, or they are transformed by means of Photo electric cell into thin lines on a thin strip of film.

When the talkie is heard in the cinema the sound comes through a loud speaker placed behind the screen. This is connected with the projector to reproduce the sound record as the film runs through the machine.

Unusually the sound on-disk process is used. The record, similar to a gramophone record though many times larger, is placed on a turnable behind the projector. There is one record for every reel of the film. The wear on the record is so great it can only be used not more than twenty times. That is why with each reel several duplicate records are issued.

---

Plough deep, while sluggards sleep, and you shall have corn to sell and to keep.—*Franklin.*

* * *

No nation is good enough to rule another nation.—Lincoln.

* * *

It is no part of a citizen's duty to pay blind obedience to the laws imposed on him.—Gandhi.

* * *

It is not genius that is so rare, but sincerity.—Goethe.

* * *

## HOW TALKIES ARE MADE.



This photograph shows a talkie being made at a British studio. On the right are the hero and the heroine. The microphone can be seen hanging from the roof. An actress is learning her part. while the directors are watching intently. The Camera is in a sound proof glass cabinet in the back ground.

*By Courtesy of " Shabistan", Bombay.*

Christopher who without looking at it put it in his register and of course I had to stand the whole period.

I don't know whether he read the whole of our magazine or not but he certainly read my article for the next day I saw a notice saying I was fined Rs. 10 for some unknown offence.

One never saw or heard of Ninth class Magazine afterwards. That was the end of it.

# HOW TALKIES ARE MADE.

**By Scientist.**

How are talking films made? Although most of us have enjoyed a talkie, one hears this question on every side and so far it has not occurred to any newspaper in India to publish a simple description of the various apparatuses involved in making a sound film. It might be for the reason that a simple as well as detailed explanation of this complicated technical process is considered impossible.

The British and American papers, however, are giving as much publicity as possible to the simple description of this process. I, being interested in movies in general and talkies in particular tried to get as much information on this subject as was within my reach and succeeded in understanding the general and fundamental principles of this process.

To understand the details of this process, as I said before, is not an easy affair and to describe them is still more tedious. It is, however, possible to give a general idea of the principles involved in the methods by which they are applied in the process of making a sound picture. In essaying this task I hope to be excused if I ignore, or dismiss in a word or two some technical problems not only because I am unable to deal with them but also because it would make the subject more complicated for the reader.

The making of sound pictures is in short, as Mr. Lewis Hawes describes it, "a combination of the process of the silent film and the process of the gramophone with a host of electrical gadgets in between to link up the two."

Now let us have a peep into a sound film studio.

Imagine a monstor building like a huge Airplane hangar, filled with *sets** for interior scenes to be shot during the various stages of preparation. In one of them we see a well furnished drawing room with actors ready to go through their respective parts. Just above and in front of the *set* are hung huge arclamps which supply the light.

For the making of a sound-picture extreme heat and extreme silence are essential. This accounts for the tropical heat and graveyard-like silence to be found in a sound-film studio.

Just before the actual shooting of a scene the Director is giving his final instructions to the actors and actresses. Suddenly the Chief Director blows a whistle. Two sound-proof doors slide with a faint noise and the *set* is isolated from the rest of the studio. Nobody dares even to breathe.

*Arrangement of back-ground, furniture etc. used for shooting a certain scene.

applause). We will start our own magazine (hear, hear)." Sharif concluded by saying, "I hope the hon'ble members will prove the generosity of their esteemed sentiments by voting for this motion."

The motion was carried amidst ear deafening cheers. Sharif, in recognition of the great services he rendered to the class by moving that resolution was elected the editor of our class magazine and the meeting adjourned when the bell rang for our Arithmetic period.

---

Sharif got the articles from Fatty and told all the contributors to make any changes they may like in their articles and to return them the next day. I proposed to him that the magazine should be kept a secret to let us discuss in it, any subject we liked freely. To this he consented.

I took from him my article (and how I lement it now) changed the title of the character sketch from Rahim Bakhsh to Christopher so that the students may derive more pleasure from it. After making this slight but (little did I know, alas!) fatal change I returned it to Sharif.

He promised the publication of the magazine on Saturday.

We waited in great suspense for Saturday. Sharif was not to be seen till the end of the 3rd period and when he came he was mobbed by all of us. He took out with great ceremony a packet from somewhere between his copy books and unwrapped it disclosing a bound copy book with a coloured title page.

Yes, there it was in red, green and yellow. The Nth Class Magazine, edited by Sharif Ahmad.

It passed round from one hand to other and when it came to me I had a chance of seeing that along with other articles (which were all nicely typed by the way) was an editorial also.

The difficulty arose as to how every one should read this valuable document. Many ways were suggested but that proposed by Abdul Karim was unthinkingly approved by the majority. He said that the Magazine should be circulated in alphabetical order and he got it.

Unfortunately the time table had been changed and now the fourth period was taken by Mr. Christopher. Karim had hardly hidden the Magazine in his Science practical note book when he appeared and we had to enter the class room. I took my seat near Karim and when Mr. Christopher began calling out the attendance I borrowed the magazine from Karim and began reading the editorial. My name was at the end so I was sure of going through some pages before he called me.

I was reading how Sharif had attacked the college Magazine people in his editorial and how he had called them impudent beggars and some other silly things when all of a sudden I heard, "Now, what are you doing there. Bring the book you are reading to me."

I was caught and there was no escape. Christopher's eyes rivited on the magazine.

I handed over the volume to Mr.

his pocket and thanked me in a manner which made me feel very important.

I was glad. The article would be published within a fortnight; of that I was certain. But the pride I was feeling was gone when I saw the trick that had been played on all of us. After I had handed over my contribution to him, he was seen taking every one of his class fellows to a corner and taking from him a packet or an envelope. On enquiring from one another we got to know of the trick Fatty had played on us. He had asked each one of us for articles telling everybody that he was the only person, he had asked for the article. However, he got about three or four dozen articles and gave them to the Editor. Every one of us was perfectly sure that his article would be published in the magazine.

---

"Isn't the magazine yet out?" asked some students of me after about 3 weeks of our giving the articles.

"Well, it ought to be—let's see if it's in the reading-room," I replied and made for the reading room where I found a dozen students leaning on the new number of the magazine. They were all the students who had contributed to the literary quota of our class. None of them seemed satisfied.

"Well, the Bloke has not even made a reference to our efforts. This is the greatest of all insults ever inflicted on our class. Out of so many articles not one has been published," shouted Azim who had contributed a love story, "Saeed and Khalida," spread over 24 foolscap pages. "To be sure there is a reference to us," shouted Nazeer who had been going through the Editorial.

And there it was. It ran.

"We are awfully sorry to reject all the articles contributed by the students of 9th class. We hope they will try and improve next time."

"The Cad!" shouted Akbar almost out of self-control with indignation, "I'm going to give Fatty the hiding of his life. He told me all the time that my article was sure to be accepted."

"Order, order," cried the Librarian at the top of his voice and turned us out of the room.

---

A council was hastily called in our class room to discuss the situation that had arisen. Shakir was voted to the chair and I moved the first resolution proposing to give Fatty a hiding. But an amendment was moved by Akbar that a bucket of water plus some swan ink at night would be the best prescription for him. I accepted this amendment and it was carried unanimously amidst loud cheers.

The second resolution was moved by Qasim that all the articles should be demanded back from Fatty. Qasim had not yet taken his seat when Sharif sprang to his feet and said, "Mr. President, Ladies, er—er—I am sorry, Mr. President. I withdraw my words. Yes, what was I saying—Mr. President and Gentlemen, I beg to move the following resolution.

"That in the opinion of the students of 9th class, the behaviour of the editor has been er—er—er—very insulting (hear, hear). The students of 9th class hereby boycott the magazine (applause), and will demand their money back. (Loud

offer my prayers in the evening and the Moazzin said. "Allaho-Akbar," I thought of writing on the conception of God in Islam but I knew so little about religion that it was impossible to imagine how I would deal with such a subject.

---

The whole day and the whole night passed and I could not hit on a possible subject to tackle. I could not afford to round off the college another day so I had to attend all the lectures. It was fortunate that I did so for it was in the fifth period that an idea struck me. It was our Geography period. Our Geography teacher, Mr. Robert Christopher, a Madrasi Christian who was always hard on the students and so I, with my class mates had a gruge against him for often caning us and occasionally fining us. When he called my name he told me to explain the reason of previous day's absence. I had of course an excuse ready that I was not feeling well but he would not believe me and was not satisfied till he had given me two stripes with which to remember his care for my salvation.

I was brooding over my late unfortunate experience (and not at all listening to Mr. Christopher's lecture) when an idea suddenly came into my mind. Why should I not write a character sketch of this tyrant? Yes, that would not only satisfy Fatty but also quench my thirst for vengeance on this cruel teacher.

The idea developed into resolution and the resolution was put into action the moment I entered my room after College. I described Mr. Christopher as an intolerent, ignorant pedant who was always down on the students of his class for nothing. I gave about a dozen imaginary instances of his stupidities.

Whatever example of stupidity and tyranny I could conceive I attributed to Mr. Rahim Bakhsh (Mr. Christopher's name in my sketch).

I wrote so hurriedly, spurred by the pain of the fresh wound inflicted by Mr. Christopher that morning, that I finished the sketch in about an hour and a half. I did not care to read it twice because that is not done by great journalists—or at least so I had heard. I put it in an envelope, addressed it to the editor and put it in my coat pocket fearing lest I might forget to take it to the college.

---

"Hallo, Zahid haven't you seen old Fatty," I asked.

"Well, not to be sure. He is just the man I am myself looking for. I have an important business with him."

"So have I," I replied and continued the search for Ahmad Din.

I was surprised later on at seeing nearly all the students of my class looking for Fatty and every-body professing to have some important business with him.

However it was not till the Interval that he turned up. I was standing before the Reading-room when I caught sight of him.

He was rather feeling pleased with himself and was humming. When he came up he took me to a corner and asked me if I had written the promised article. I produced it with great care and handed it over to him. He put it in

approval. It was seconded, put to vote and unanimously carried amidst ear-deafening cheers—all in a minute.

Fatty was elected to represent the 9th class on the Editorial Board. Fatty himself was looking a mixture of wonder and foolishness rubbing his eyes as if to ascertain whether it was all a dream.

Every one was contented. There would be no harassing for articles and we would go on our old, old way—dreaming. For Ahmad Din, nicknamed Fatty, because of his immense girth, was the last man to do any stroke of work.

---

But who could believe it that Fatty, our new representative on the Editorial Board would also take to the way of all other members of the board.

We were all going our old way and had just returned from our Christmas Vacation when one day Fatty took me aside and said, "Well, you know the editor is always asking me to extract some articles from you people. As you are good at composition, won't you be good enough to contribute one. See, you are the only one I have asked for it and I hope you will not grudge this small favour."

"But—but—but you know I—er—." I wanted to tell him that I had not contributed any article before, that I was not good at writing articles and that he ought to ask some one else but he cut me short saying.

"No, no. Don't be silly," reading what was in my mind, "one has to make a start somewhere and sometime. And now don't try to tell me that you can't write four or five pages. The teacher was speaking very highly of your composition last week."

I felt flattered and gave in. "All right, then, I'll take it from you on Saturday. Don't forget it. Cheerio," he said and left me wondering.

It was Tuesday and there were four days more. But—what was to be the subject of my composition. A short story, a mystery, or a murder? I could not decide. But whatever it would be it was going to be—what should I call it—*a topping affair*.

That day I did not attend any more lectures but sat in the library turning over the pages of nearly all the papers on the table in the hope of finding some clue to the topic of my contribution. But in vain did I search for it in the *Strand*, the *Argosy*, *Indian Review* and many more. "Oh, I can't find it here," I said to myself and went to the garden. There lots of things suggested themselves to me. "The Autobiography of a rose" on the same line as the autobiography of a coin would be very appealing and romantic. Or should I write a romance. What would it be called? Shamim and Nasima. Yes, that would be a very beautiful name. But, then, what was I to write about the blooming rose or the affectionate pair, Shamim and Nasima?

I relinquished the thought. I returned to my room full of thoughts of my article. I saw as in a vision everybody talking of my article, the teachers praising it and the editor being proud of having published it in his magazine.

The whole day was spent in such pleasant reveries. Every thing seemed to give an idea but my extremely small amount of knowledge prevented me from writing about them. When I went to

# OUR CLASS MAGAZINE.

**By Max.**

It was a dark December day and all the students of my class, well-wrapped in their over-coats, were enjoying their vacant period on the lawn basking in the dim sunlight. I was a student of 9th class—the class looked down and despised by the seniors of the Intermediate College. However, deprived though we were of the much-wished-for company of the seniors, we were contented with ourselves. I might have been called an important member of my class—in the sense that every student of 9th class regards himself as important.

As I said before we were standing in the sun, though not all, for a few had climbed the vault horse and others were purched on the horizontal bars. I, along with some others was engaged in making a fool of a class mate whose only sin was that he had a small bushy beard. We were all making the best of the time when Hamid yelled out "Hi. Some one from amongst the seniors is coming towards us." And he was right. An important looking person in Oxford bags was making straight for us. Nobody could mistake his identity—he was Asghar, the Editor of the Magazine.

Why is he coming towards us? What business has this important official with us? May be there is some party and he is coming to invite us—or is it for the class report that he is always asking for through the pages of the magazine? These were the several questions we asked ourselves.

"Well, youngsters," he said in a tone that made all of us blush, "I have come to you for a very important matter."

We were in suspense and a little elated at the unexpected notice taken of us.

"It is about your class representative for the Editorial Board" he added, "and you must elect one from amongst you at once and let me know of it before twelve o'clock." Saying this he left us all wondering.

---

Nobody had any idea of what the duties of a class representative on the Editorial Board were except that it was a 'responsible position.' A ninth class student, while he'll not lose a chance of assuming importance, is never prepared to take any responsibility. That was why every one proposed the name of some other while nobody seemed bold enough to take the office himself.

"Jafar—Jafar." "Why not Sagheer?" "Shahid would be the best."

In the tumult that followed it was impossible to make oneself audible. I was myself going to propose the name of someone when I remembered having heard from somebody that the members of the Editorial Board are always harassing their class-mates for articles to fill the pages of the magazine.

"We must elect somebody who will be a sluggard, so that we may have no fear of being asked to write articles," thought I, and suddenly an idea flashed in my mind.

"Fatty—Fatty, Fatty will be our representative," I cried out.

I had never imagined that my proposal would be met with such universal

In the opinion of a witty friend the meeting looked like a Union Function for, the students' "Premier" was the only person seated on the dais while our revered teachers occupied front seats on the floor of the House. We do not agree with our friend. It could not be a union function for the "Premier" was "*in the sofa.*" Had he been "in the chair" it could, perhaps, be called a Union Function. Besides it was so quiet and peaceful. Surely it was a college function. If a student felt out of place, the nature of the function cannot be changed.

* * *

A wise man was once asked the question "which do you think the most crowded profession?" and he replied, "The Physicians." This was long ago.

But if one was to ask me the same question today. I would reply "The critics." It is perhaps easy to criticise and this is why their numbers have gone up—it is easier still to criticise the editor of a Magazine but difficult to appreciate his difficulties. Lack of articles—especially good ones—from contributors; of accuracy and punctuality from the Press; doubts about the likes and dislikes of the readers; paucity of time due to rush of college work and lack of support from the readers are difficulties that can be realized better than related. But when one has to do a thing for it has to be done, he does it and swallows criticism also. We welcome constructive and healthy criticism to any extent. We are prepared for the unhealthy dose also but there must be a limit to everything. The Editor's patience can go beyond limits even but it is not unlimited.

* * *

We are publishing three photographs taken by Mr. Meraj Ahmad Khan on the occasion of His Excellency Sir Malcolm Hailey's visit to our University. We are sorry we had no control over the circumstances which combined to delay their publication. Our thanks are due to Mr. Meraj Ahmad Khan for the photographs.

* * *

With the article "How Talkies are made," we are publishing a photograph showing a sound-film being made at a British Studio. We are thankful to Mr. Sharar, editor of 'Shabistan', the foremost screen monthly, for the loan of the block.

# EDITORIAL.

The college is in full swing and it seems to have settled to work after admissions. The variety entertainment, offered by the *freshers* at the time of admission, has been replaced by the serious drama of College routine. Suits and *shalwars*, *lungis* and hats, *chust pyjamas* and Lucknow *gharāras* have been replaced by Fez, *sherwanis* and trousers. One feels a sort of harmony notwithstanding the various dialects spoken by the newcomers.

* * *

In spite of occasional inconvienence caused by rains, the weather is not so un-plesant and some people are even enjoying it. The danger of Malaria and cholera is, however, staring us. This is not very serious at present, because precautionary measures have been adopted and enforced by the Muslim University Hospital. Inoculation and Injections have started on a large scale. "Drugging and netting" are coming next. Conscription may be bad in other ways, but in measures of health, like the surgeon's knife, it is a blessing. Let us co-operate with the medical authorities and thus avert a catastrophe.

* * *

The sports and games clubs, probably because of the rains and absense of proper drainage, are inactive. Can the Union and other Literary Societies plead the same excuse? Let us hope we will have, ere long, interesting matches and net practice, instructive lectures and lively debates.

* * *

When we go to Press, we are informed that Tennis Club has started regular practice. Kabaddi has also been played once. We congratulate Messrs. Masood and Tahir on stealing a march over others.

* * *

Principal, A. M. Kureshy addressed the Intermediate College staff and students in the Marris Hall on Tuesday, the 22nd July, 1930, at 11 a. m. and dwelt at length on the various phases of college life and the rights, duties and responsibilities of students. For three quarters of an hour he kept the audience charmed and spell-bound and we feel it our pleasant duty to thank him for the kind and wise words of advice and guidance that he spoke to us. We assure him that the students value his advice and will utilize the same with advantage.

* * *





*Above:*

His Excellency inspecting the Guard of Honour.

*Below:*

The Convocation procession. The late Mr. Horne is seen in a Fez in the rear.



*Above:*

The Principal introducing the Hyderabad students to His Excellency in front of the Marris Hall.

*Photos:*—Meraj Ahmad Khan.

# The Intermediate College Magazine

**AUGUST 1930**

## CONTENTS

مسلم یونیورسٹی انٹرمیڈیٹ کالج علی گڑھ



# انٹرمیڈیٹ کالج میگزین

## علی گڑھ

جلد (۲) | بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء | شمارہ (۱۰)

باہتمام محمد مقتدی خاں شروانی
مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں طبع ہوا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# انٹرمیڈیٹ کالج میگزین

نگران ۔ عبدالعزیز صاحب پوری
ایم اے ایل ایل بی

مدیر ۔ حکیم ماجد حامدی
نائب مدیر ۔ ظفر احمد صدیقی

جلد ۲ | بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء | نمبر ۱۰

## فہرست مضامین

# اوّل اوّل

## افکارِ عالیہ

سرکار جنت مکان نواب سید حامد علی خان بہادر المتخلص بہ رشک

حسینوں میں تھے انتخاب اوّل اوّل
غضب تھا تمھارا شباب اول اول

اب آنے لگا خونِ دل آنسوؤں میں
بہی خوب چشمِ پُر آب اول اول

گئی جان فرقت کے صدموں سے آخر
ہوا خانۂ دل خراب اول اول

وہ بچپن وہ بے باکیاں اب کہاں ہیں
نہ تھا اُن کو ہم سے حجاب اول اول

وہ ترچھی نظر اور بانکی وہ چتون
ادا تھی ہر اک لاجواب اول اول

اُبھرتا ہی جوبن نکھرتی ہی رنگت
لڑکپن ہی آخر شباب اول اول

محبت نے برسوں رُلایا ہے ہم کو
جلایا ہے مثلِ کباب اول اول

کسی بت پہ آئے گا جب دل کسی کا
تو سہنا پڑے گا عذاب اول اول

وہاں قتلِ عشاق اک کھیل ٹھیرا
اُمنگوں پہ جب تھا شباب اول اول

بتاؤ تو کیوں ہو گئی ہم سے نفرت
ہمارا تھا عاشق خطاب اول اول

محبت وہ کرنے لگے آخر آخر
جنھیں تھا بہت اجتناب اول اول

نہایت ہی نازک ہی یہ شیشۂ دل
نہ توڑو اس کو مثلِ حباب اول اول

ابھی ابتدا ہی مگر رشک تم نے
کہی ہی غزل لاجواب اول اول

# غزل

(از حضرت اظہر علی صاحب آزاد)

پیالہ آئینۂ دورِ جاودانِ من ست — کہ دورِ جام رواں شرحِ داستانِ من ست

سخن کمانِ من و ناوکِ کمانِ من ست — زبانِ دردِ من و درد ترجمانِ من ست

بیادِ طوطیِ شکّر بیاں شکر بشکن — کہ نغمہ ام شکر و شکّریں زبانِ من ست

سرائے من ہمہ عالم بہر کجا کہ روم — غلامِ شاہِ جہانم جہاں جہانِ من ست

پیالہ می کشم و دل زباں زبانست دلم — نہاں عیانِ من ست و عیاں نہانِ من ست

کلاہِ بالِ ہُما بر سرم نہاد قضا — غزل سرایم و بلبل ہم آشیانِ من ست

نیامدم کہ روم۔ من نمی روم آزاد
زمانہ می رود و ہر زماں زمانِ من ست

# آہ ماتمِ نوّاب سیّد حامد علی خاں والیِ رام پور

۳۰ ۶ ۱۹

(از قبلہ مولانا سید علی احسن صاحب احسن مارہروی)

---

موت زندہ چھوڑنے والی نہیں
اس بلا سے کوئی گھر خالی نہیں

بچہ، جوان، ادھیڑ، بوڑھا، نیک، بد، فاسق، عابد، فقیر، امیر، بادشاہ، گدا۔ غرض کوئی متنفس کسی حال میں ہو، خراباتِ عالم کی نام نہاد آبادی میں وقتِ معین سے زیادہ آزادی کا سانس نہیں لے سکتا، قضائے مبرم ایک ایسا مستقل اور اٹل فرمانِ واجب الاذعان ہے جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک بدستور رواں رہے گا۔ ضروری سے ضروری، سخت سے سخت اور اہم سے اہم، معاملات واحکام آگے پیچھے ہو سکتے ہیں مگر۔ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ۔

کوئی علاج کیا جائے، کسی قسم کا تدارک عمل میں آئے، کیسے ہی تیر بہدف نسخے پلائے جائیں، زبردست سے زبردست روک تھام کی جائے، بایں ہمہ ع

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

زمین و آسمان کے قلابے ملائے جائیں، بقراط وارسطو کو بلایا جائے، تریاقِ فاروق کا استعمال کیا جائے، لیکن ع

چوں قضا آید طبیب ابلہ شود

کارگاہِ عالم میں تمام کاموں کے لئے مختلف مدارج و مراتب مقرر کئے گئے ہیں، جن کی ترتیب انسانی معاشرت و تمدن کے تحت میں حسبِ موقع ہوتی رہتی ہے۔ یہ دستورالعمل جملہ امور کے متعلق دو عنوانوں میں تقسیم ہو سکتا ہے یعنی معمولی

اور غیر معمولی۔ غیر معمولی باتوں کا اپنے وقوع سے انسان کے جذبات وحسیات کو متحرک ومہیج کرنا قرین قیاس ہے، لیکن روزمرہ کے معمولی واقعات کا اثر اپنی کثرتِ وقوع کے باوجود قائم رہنا عقل سے بعید ہے۔ کھانا، پینا، اُٹھنا بیٹھنا، سوجانا، جاگنا۔ یہ ایسے معمولات ہیں جن کے نہ ہونے پر ضرور متعجب ہونا چاہیئے مگر ہونے کی صورت میں استعجاب و اضطراب فعلِ عبث سے زیادہ وقیع نہیں۔ موت جو مندرجۂ بالا معمولات سے زیادہ معمولی چیز ہے اُس پر متعجب ہونا ایک بے نتیجہ بات ہے۔ آدمی دو وقت کی جگہ ایک وقت کھا سکتا ہے۔ ۸ گھنٹے کے عوض ۴ گھنٹے سو سکتا ہے، لیکن موت کو جسے ایک گھنٹہ کیسا ایک ثانیئے کے لئے اِدھر سے اُدھر نہیں کیا جا سکتا کیوں مرکزِ استعجاب بنایا جاتا ہے اور اُس کے وقوع پزیر ہونے پر کیوں حد سے زیادہ اثر لیا جاتا ہے۔ روح جس پر مدارِ زندگی ہے ایک امانتِ خداوندی ہے جس کا امین ہم کو بنایا گیا ہے جو چیز ہماری ملکیت نہیں بلکہ بطورِ استعار نامعلوم وقت تک کے لئے ودیعت کی گئی ہو اُس کے چلے جانے پر ہائے وائے کیسی۔ نالہ وگریہ کیسا، البتہ اس کا ماتم وافسوس کیا جا سکتا ہے کہ ہم نے کما حقہٗ امانت داری کے فرائض ادا نہیں کئے اور بسا اوقات کوشش کی کہ اُس امانت میں خیانت کی جائے، غرض کہ اس امانت کی واپسی پر ہمیں کسی قسم کا استحقاقِ شکوہ حاصل نہیں ؎

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی ٭ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

معاشرتی وتمدنی معاملات میں تفرقۂ اوقات کی وجہ سے جو تغیر ہوتا ہے اُس پر جس قدر افسوس کیا جاتا ہے وہ آنی ہوتا ہے اور جتنی تکلیف محسوس ہوتی ہے وہ فانی ہوتی ہے۔ موت کا ملال بھی ہماری خیالی پیداوار ہے۔ اسے بھی دھوپ چھاؤں کی طرح آنی جانی چیز سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ ہماری روحانی اور ایمانی تعلیم بتاتی ہے کہ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ وَّالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَّأَبْقَىٰ۔

اگر عزاداری کے مراتب کا تجزیہ کیا جائے تو ایک حقیقت بیں نظر بآسانی دیکھ سکتی ہے کہ مرنے والے کا غم وافسوس اُس کے معدوم ہونے پر بہت کم کیا جاتا ہے بلکہ بہت زیادہ اپنے تعلقات وفوائد کے انسداد وانقطاع کی ماتم گزاری کی جاتی ہے۔ ہاں وہ عزاداری سچی عزاداری ہے جس میں مرنے والے کے عزیز، قریب، نوکر چاکر، متعلقین ومتوسلین سے زیادہ اہلِ ملک اور ابنائے زمانہ اُس کے فراق میں اُس کے محاسن ومکارم اور کمالات وخصوصیات کی معدومیت پر کڑھتے رہتے ہیں۔ مبارک ہیں وہ ہستیاں جو اپنے بعد ایک دنیا کو اپنے لئے روتا چھوڑ جائیں، مسعود ہیں وہ افراد جن کی صفِ ماتم بچھانے والے اقارب سے زیادہ اغیار ہوں۔ ؎

پس چناں زی کہ وقتِ مُردنِ تو ۔ ہمہ گریاں شوند و تو خنداں

نواب سر سید حامد علی خاں والیِ ریاست رام پور کی رحلت سے یقیناً تمام شاہی خاندان جملہ متوسلین و مقربینِ ریاست مغموم و دل گرفتہ ہوں گے مگر وہ سب اس لئے اور محض اسی لئے کہ اُن کے وظائف و مراتب یا قدر دانی و ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو گئی، البتہ وہ بے تعلق افراد جو اُن کو محض شخصی رفعت اور ذاتی بلند پائگی کے سبب سے قابلِ قدر سمجھتے تھے اُن کے سچے عزادار ماتم گزار ہیں! انسان محاسن و معائب کا ایک معجونِ مرکب ہے اس لئے اس کی ضرورت نہیں کہ مرحوم کو فرشتہ سمجھ کر حلقۂ معصومین میں شامل کیا جائے، ہاں بحیثیت انسان اُن کے اُٹھ جانے کے بعد اُن کی لازوال خوبیوں پر منصفانہ نظر ڈالی جائے تو وہ ایک بے مثال اور بے عدیل ہستی ثابت ہوں گے اور ایسی ہستی کہ اُن کا قائم مقام من حیث المجموع اگر قطعی ناممکن نہیں تو محالِ عادی ضرور ہے۔ ایک والیِ ملک کا عیش پرست، آرام طلب اور اُن تمام لوازم سے دست و بغل رہنا جو افراطِ دولت کی وجہ سے عموماً دیکھا جاتا ہے کوئی قابلِ تعریف بیان نہیں، مگر ایسی ہستی کا جو ہر قابل ہونا، فردِ کامل بننا اور انسانی معارج کی بلند منزلیں طے کرنا ضرور لائقِ توصیف ہے اس جگہ قسم دوم کا مختصر تذکرہ منظور ہے۔ اُن کی عشرت و نشاط کی داستانیں بغیر کسی خاص تصدیق اور عینی شہادت کے ہزاروں مشہور ہیں لیکن شاید اس کو بہت کم اشخاص جانتے ہوں گے کہ اُن میں بکثرت ایسے خصائص و محاسن موجود تھے جو عادۃً ایسے اربابِ دول میں مفقود ہوتے ہیں۔ وسیع النظری با عام معلومات جو ایک علامہ و سیاح کا خاصہ ہے، بے تکلفی و بے ساختگی جو غربا کا شیوہ ہے۔ تحریص و تشویقِ علم جن کو شکم سیر پسند نہیں کرتے یہ اور ایسے بہت سے اوصاف بدرجۂ اتم اُن میں ہر معمولی نگاہ والے کو نظر آتے تھے، اسی کے ساتھ اپنی شاہانہ حیثیت کے مطابق انصاف پسندی، معدلت گستری، قدر افزائی اُن کے معمولات میں داخل تھیں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ کسی مقرب و مخصوص حاشیہ نشیں نے کسی غریب متوسل کی شکایت کا دفتر کھولا ہے اور اُس کے قصور کو ایک حد تک ثابت کرنا چاہا ہے اور نتیجے میں یقین کئے ہوئے ہے کہ یہ نشانہ تیر بہدف ہوگا لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس خود غماز و نمام کو گرفتارِ عتاب ہونا پڑا، داد و دہش کے تذکرے داستانوں کی طرح بلکہ قومی واقعوں کی طرح اس قدر ہیں کہ اگر اُن کو تفصیل سے نہیں بالاجمال ہی لکھا جائے تو بھی ایک دفتر چاہیئے۔ اس لئے ایسے مضمون کو جس میں خواہ نخواہ خوشامد کا پہلو بھی نظر آتا ہو قلم انداز کیا جاتا ہے حافظے کی خداداد قوت ایسی عطا ہوئی تھی کہ جس معمولی سے معمولی آدمی کو ایک مرتبہ دیکھ لیا یا کسی بات کو سن لیا پھر اُس کے بھولنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ یہ قوتِ حافظہ، لطائف و ظرائف تک محدود نہ تھی بلکہ علوم و فنون کے بڑے بڑے

نظریئے اور کلیے اس طرح نوکِ زبان رہتے تھے کہ جید سے جید متبحرین و ماہرین فن میں بہت کم پائے جاتے ہیں۔

مجھے چند بار حاضرِ دربار ہونے کا موقع ملا۔ پہلی مرتبہ سنہ ۱۹۰۷ء میں مشہور شاہانہ مشاعرے کی شرکت کے لئے رام پور جانے کا اتفاق ہوا۔ اس موقع پر ایک شب کے چند گھنٹے ایسے بھی میسر ہوئے کہ مخصوص شعرا کو باریابی کا موقع دیا گیا، اُس وقت میں نے موقع کی مناسبت سے اُردو کی سرپرستی کے شکریے میں ایک قطعہ پڑھا تھا۔ اس حاضری کے ۹، ۱۰ برس کے بعد پھر چند ساعتوں کے لئے یہ شرف حاصل ہوا۔ پہلی ہی نگاہ میں پہچان لیا اور اسی کے ساتھ اُس قطعے اور اُس کے مضمون کا اعادہ کیا گیا۔ غرض کہ یہ اور ایسے بے شمار واقعات و حالات ہیں جن کی تفصیل میں لسان الغیب کا الہام ترجمانِ حال ہو سکتا ہے ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

بہرحال دعا ہے اور بخلوص نیت استدعا کہ غفور الرحیم اُن کے ساتھ اپنا معاملہ بہتر سے بہتر فرمائے اور دنیاوی زندگی سے زیادہ حیاتِ اُخروی میں مدارجِ اعلیٰ کے ساتھ اپنی رحمتِ عام کے دربارِ خاص تک پہنچائے۔ اس موقع پر اکثر اہلِ قلم و مورخین نے ان کے انتقال کی تاریخیں کہی ہوں گی، خاکسار نے بھی بطور یادگار پہلی ہی فکر میں ایک مصرعِ تاریخ حاصل کیا ہے جس کو بوجہ تنگی قافیہ دو شعروں ہی میں ختم کر دیا ہے اور اس مضمون کے آخر میں درج کیا جاتا ہے۔

## قطعہ تاریخ

سن چکے حکمِ قضا جب حکمرانِ رام پور — چھوڑ کر قالب کیا روحِ رواں نے عزمِ عدن
مصرعِ تاریخ میں ملہم نے احسن سے کہا — پا گئے نواب سر حامد علی خاں بزمِ عدن

۱۳۴۹ھ

؎ آج کل عمرِ رواں اور آبِ رواں کی طرح روحِ رواں کی ترکیب بھی بکثرت عام تحریروں میں دیکھی جاتی ہے۔ میری تحقیقات میں روح نہ عمر کی مترادف ہے نہ وہ ہر وقت پانی یا عمر کی طرح رواں رہتی ہے بلکہ اُس کی روانی کا اطلاق صرف مرنے پر ہو سکتا ہے۔ چناں چہ اسی معنی میں یہاں بہ ترکیب توصیفی روحِ رواں کہا گیا ہے۔ ورنہ عموماً روح و رواں عطف (و) تفسیری کے ساتھ لکھنا چاہیئے جیسے رنج و غم، عیش و نشاط وغیرہ ۱۲



میجر جنرل ہز ہائینس عالی جاہ فرزند دلپذیر
دولت انگلشیہ مخلص الدولہ نصیرالملک امیرالامرا
نواب سر سید محمد حامد علی خان بہادر
مستعد جنگ جی. سی. ایس. آئی، جی. سی.
آئی. ای، جی. سی. وی. او، اے. ڈی. سی، ٹو
ہز امپیریل میجسٹی دی کنگ امپرر
(مرحوم نواب صاحب رامپور)

# سرکار جنت مکان میجر جنرل ہز ہائی نس عالیجاہ - فرزند دلپذیر دولت انگلشیہ
# مخلص الدولہ ناصر الملک امیر الامرا نواب سر سیّد محمد حامد علیخاں بہادر مستعد جنگ
# جی - سی - ایس - آئی - جی - سی - آئی - ای و جی - سی - وی - او - والئی رامپور -
# آنریری ایڈی کانگ ہز مجسٹی حضور ملک معظم - اور تحریک علی گڑھ

---

ابھی نواب سید کلب علیخاں بہادر سریر آرائے حکومت تھے کہ ولی عہد بہادر نواب سید مشتاق علیخاں کے کاشانۂ اقبال میں ۲۹ ر رجب ۱۲۹۲ھ ہجری مطابق ۱ ر اگست ۱۸۷۵ء کی ساعت سعید میں اس ماہتاب نے طلوع کیا جو بعد کو آفتاب بن کر چمکا اور جس کی انوار باریٔ جود وسخا سے رامپور تو رامپور بیرون ہند تک کی ظلمت گاہیں جگمگائے بغیر نہ رہ سکیں۔

سید محمد جعفر رئیس شمس آباد نے قطعہ تاریخ لکھکر گزرانا -

یوسف لقا نواب کا روشن قمر پیدا ہوا     مسند نشیں پیدا ہوا لخت جگر پیدا ہوا
شگل رجب انتیسویں پہر دوپہر کی ماہ نو     فالی حسب آصف نشان فرخ سیر پیدا ہوا

حقیقتاً چوتھا مصرعہ تاریخ کیا تھا گویا الہام تھا کہ لفظ بلفظ صحیح ہو کر رہا - ظاہرا مقدر کو دیکھیے کہ ابھی سفر زندگی کی وہ ہی منزلیں طے کر پائی تھیں کہ خلد آشیاں کا سایہ سر سے اٹھ گیا - جب نواب مشتاق علیخاں راہیٔ ملک بقا ہوئے تو اُس وقت نواب حامد علیخاں بہادر کی عمر صرف چودہ سال اور کچھ ماہ کی تھی لیکن تاہم تاجپوشی کی مبارک تقریب کے موقع پر جو الفاظ ممدوح نے مسٹر نیل قائم مقام ایجنٹ گورنر جنرل بہادر کی تقریر کے جواب میں فرمائے وہ انکی قدر

امید افزا تھے کہ تھوڑی دیر کے لیئے وابستگانِ دربِ دولت اور بہی خواہانِ سلطنت میں سے ہر شخص ایک شاندار اور خوشگوار مستقبل کے خوابِ شیریں میں کروٹیں لینے لگا۔ اب اس دُرِ یتیم کی تعلیم و تربیت کی تمامتر ذمہ داری گورنمنٹ انگلشیہ کے کاندھوں پر تھی۔ ۲۰ مارچ ۱۸۸۹ء سے وہ کونسل انتظامی جو نواب عرش آشیاں کے عہد میں قائم کی گئی تھی "کونسل آف ریجنسی" میں تبدیل ہوگئی اور اس کے پریسیڈنٹ صاحبزادہ سید صفدر علیخاں ہوئے۔ وائس پریسیڈنٹ کا عہدہ مدار المہام ریاست جنرل اعظم الدین خاں کو سپرد کیا گیا اور حکومت کے تمام کام بظاہر ان دو افسران و دیگر دو ممبرانِ کونسل کی متفقہ احکام کے تحت میں سرانجام پانے لگے۔ درحقیقت میں جنرل اعظم الدین خاں ہی تن تنہا سیاہ و سفید کے مختار تھے، نواب صاحب کی ذاتِ خاص سے متعلق جو امور تھے اُن کا تعلق بلاواسطہ جنرل صاحب سے رہا۔ گو اہلِ خاندان کو یہ بات کسی طرح گوارا نہ تھی لیکن نواب صاحب بہادر کی تمامتر تعلیم رامپور سے باہر ہوئی و دیگر جدید انتظامات کے ساتھ کپتان کا ٹون صاحب بحیثیت اتالیقِ خاص مقرر ہوئے اور موسم سرما کی جائے قیام بریلی اور گرما کی نینی تال قرار پائی۔ آپ نے علومِ مشرقی و مغربی کی تحصیل میں جس غیر معمولی ذہانت اور لیاقت سے انتہائی دلچسپی کا ثبوت دیا وہ یقیناً دوسرے کے لیئے قابلِ صد رشک تھی۔ اُن کے زمانۂ تعلیم میں جو معاملات گاہ بگاہ حدودِ ریاست میں رونما ہوتے رہے اُن میں سب سے زیادہ اہم واقعۂ قتل جنرل اعظم الدین خاں بہادر تھا جو ۳۰ اپریل ۱۸۹۱ء کو وقوع میں آیا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ نام نہاد ایجنٹ بھی اس سازش میں شریک تھے۔ ۱۶ مئی ۱۸۹۱ء سے کل اختیارات صاحبزادہ سید صفدر علیخاں سے لے لیئے گئے اور ان کی جگہ کرنل ونسنٹ صاحب کا تقرر عمل میں آگیا۔ اب نواب صاحب بہادر قریب قریب تعلیم ختم کرچکے تھے لہذا باایمائے گورنمنٹ فروری ۱۸۹۴ء میں رامپور تشریف لائے اور ۳ مارچ ۱۸۹۴ء کو جملہ متعلقین و متوسلین سے رخصت ہوکر ہزاروں سلامتی کی دعاؤں اور لاکھوں بہترین تمناؤں کے ساتھ سیاحتِ عالم کی نیت سے اپنے عزیز و اقارب اور اپنی محبوب رعایا کا داغِ جدائی سینے میں لیئے گیارہ بجے دن کے وقت بریلی کی طرف روانہ ہوگئے۔ تمام حدودِ ریاست پر ایک اداسی ایک بے کیفی ایک تاریکی مسلط ہوچکی تھی اور ہر چھوٹا بڑا بے چین و متفکر تھا کہ دیکھیے اب وہ دن کب آئیں اور ہماری شامِ رنج و الم صبحِ دل افروز سے کب تک تبدیل ہو۔ ہوتے ہوتے ۱۱ جنوری ۱۸۹۶ء کو رامپور کے گلی کوچوں میں یہ خبر عام ہوگئی کہ عنقریب آفتابِ ابہت و اجلال طلوع ہونے والا ہے چنانچہ ۹ کو عالی جناب امارت پناہ نواب حامد علیخاں

بہادر کی سواری نہایت کروفر و تزک و احتشام کے ساتھ دار السرور رامپور میں داخل ہوئی ۔ تمام شہر میں خوشی منائی گئی اور پبلک کی طرف سے مسرت و انبساط کے بڑے بڑے مظاہرے کیے گئے۔ اب وہ روزِ سعید بھی کچھ دور نہ تھا جبکہ وہ دو رشتہ ہوا رہمیشہ کے لیے ایک رشتۂ اتحاد میں منسلک ہونے والے تھے۔ چنانچہ ۲۲ر اکتوبر ۱۸۹۱ء کو صاحبزادہ حمید الظفر خاں کی تحریک و کوشش سے موجودہ نواب صاحب بہادر جاورہ کی ہمشیرِ کلاں کے ساتھ آپکی نسبت طے پا گئی۔ باراتیوں کی پہلی گاڑی ۱۲ر فروری کو ریاستِ جاورہ کی طرف روانہ ہوئی پھر کیا تھا اسپیشل پر اسپیشل چھوٹنے لگے غرض شادی کے شرکا میں علاوہ عوام کے راجگان و مہاراجگان کی تعداد بھی غیر معمولی تھی - بہاں پر رخصت کی رسم ادا کی گئی اور دُلہن کی پالکی پہ روپیوں اشرفیوں اور جواہرات کی اس قدر بارش ہوئی کہ جاورہ میں آج تک یادگار رہے ۲۱ر مارچ کو برات رامپور میں داخل ہوئی تمام شہر چراغاں کیا گیا اور محلّے محلّے کھانے بٹنے لگے ۔ ۸ و ۱۰ تاریخ تک ضیافتیں ہوتی رہیں۔ حساب لگایا تو اخراجات ۳ ۵ ہزار ہوئے۔

اب وقت آگیا تھا کہ عنانِ حکومت براہِ راست ریاست کے والی کے ہاتھ میں پہونچ جائے۔ ۴ر اپریل کو ایک عظیم الشان دربار کیا گیا اور لفٹننٹ گورنر بہادر نے جو اسی لیئے رامپور تشریف لائے تھے اپنے ہاتھ سے تاجِ سلطنت نواب حامد علیخاں بہادر کے زیبِ سر فرماکر شمشیر کمر سے آراستہ کی۔ جب تمام رسمی فرائض انجام پذیر ہو چکے تو دربار برخاست کیا گیا اور اُس وقت سے کونسل آف ریجنسی کی صدارت نواب صاحب بہادر کی ذاتِ خاص کو منتقل کر دی گئی - حکومت نے جن آرزوؤں اور امیدوں کے ساتھ نواب صاحب کی تعلیم کا بیڑا اُٹھایا وہ سب بفضلِ خدا تکمیل کو پہونچیں - باوجودیکہ اب حامد علیخاں کسی حد تک بااختیار ہو گئے تھے لیکن گورنمنٹ کی دخل اندازیاں اب بھی کوئی غیر موزوں اور بے محل خیال نہیں کی جاتی تھیں - چنانچہ آپ کے حقیقی نانا کو صرف اس بنا پر کہ اُن کی صحبت کا اس نوعمر فرمانروا کی روزمانہ زندگی پر بُرا اثر پڑھنے کا احتمال تھا، رامپور سے علٰحدہ کر دیا گیا۔ یکم جون ۱۸۹۶ء کے سرکاری اعلان کے مطابق نواب صاحب کو اختیاراتِ کاملہ حاصل ہو گئے۔ کونسل آف ریجنسی توڑ دی گئی اور اسحاق خاں صاحب مدار المہام ریاست مقرر ہوئے۔ نواب صاحب نے خود مختار ہوتے ہی پہلا کام جو یقیناً اُن کی خدا ترسی اور رحمدلی پر دلالت کرتا ہے یہ کیا کہ اُن جملہ اشخاص کو جو کسی جُرم کی پاداش میں یا کسی خانگی جھگڑے کے سلسلہ میں رامپور سے معتوب کر کے نکال دیئے گئے تھے اور جن کو

حدود ریاست میں قدم رکھنے تک کی اجازت نہ تھی کامل معافی عطا فرمائی - اسی سال جب قحط کے آثار ظاہر ہونے شروع ہوئے تو نواب صاحب بہادر نے چھ ماہ کی کل مالگذاری یک قلم معاف فرما دی اور تحصیلدار صاحبان کو حکم بھیجدیئے گئے کہ خزانہ سرکاری سے روپیہ لیکر اپنے ماتحت مواضعات کے غلہ گراں قیمت پر خریدنا شروع کر دیں - یوں غلہ بعد کو حکومت کی طرف سے ارزاں نرخ پر فروخت کر دیا جاتا تھا - غرض جس حسن انتظام کے ساتھ حضور پُرنور نے ایسے نازک وقت پر غربا و مساکین کی امداد فرمائی وہ اپنی مثال آپ تھا - اس داد و دہش میں خزانہ کا کافی سے زیادہ روپیہ صرف میں آگیا -

اسحاق خاں صاحب کامل دو سال تک عہدۂ مدار المہامی کے فرائض سرانجام دینے کے بعد نہایت نیکنامی کے ساتھ اپنی خدمات سے سبکدوش ہوگئے - اور اُن کی جگہ مولوی عبد الغفور خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر کا تقرر باَیمائے گورنمنٹ عمل میں آیا - موصوف ابتدائے ملازمت سے لیکر اختتام دَور تک جس حُسن و خوبی ولیاقت و سلیقہ کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ساعی و کوشاں رہے وہ کسی باخبر شخص سے پوشیدہ نہیں تاہم کسی بنا پر ۱۹۰۸ء میں آپنے ملازمت سے استعفا دیدیا اور حج کی نیت سے بیت اللہ شریف کی طرف راہی ہوگئے - اور آپ کی خدمات صاحبزادہ عبد الصمد خاں صاحب عرف ابن میاں کو تفویض کر دی گئیں - ۲۰ مارچ ۱۹۰۸ء سے مدار المہامی کا عہدہ توڑ دیا گیا - اور حسب ذیل تقررات عمل میں لائے گئے -

| | |
|---|---|
| (۱) صاحبزادہ عبد الصمد خاں صاحب | چیف سکرٹری |
| (۲) قمر شاہ خاں صاحب | جوڈیشل سکرٹری |
| (۳) عبد المجید خاں صاحب | ریونیو سکرٹری |

چونکہ نواب صاحب بہادر کی پرورش ہز ہائی نس جناب عالیہ منور محل صاحبہ کے آغوشِ عاطفت میں ہوئی تھی جو شیعی المذہب تھیں لہذا جب آپ نے ہوش سنبھالا تو اُنھیں کے نقش قدم پر چلنا شروع کر دیا - عقائد کی پختگی اور پابندی رسوم عزاداری کا یہ عالم تھا کہ ۲۹ ذی الحجہ کی شام کو جس وقت سرکاری تعزیہ توڑے اصلہ پر ہوتا تھا تو خود پاپیادہ استقبال کر کے امام باڑہ میں لاتے تھے شب میں تمام مجالس میں بنفسِ نفیس شرکت فرماتے تھے - ۷ محرم کو جب مہندیاں چڑھائی جاچکتی تھیں اور جملہ دیگر رسوم اختتام پذیر ہوجاتی تھیں تو

اپنے ہاتھ سے وصیا تقسیم فرماتے تھے۔ بارھویں محرم کو بوقتِ عصر سوم کی فاتحہ نہایت خلوص کے ساتھ دلاتے تھے۔ جب جلوس کربلا کو روانہ ہوتا تھا تو تمام حکامِ ریاست، اہلِ خاندان و دیگر معززینِ شہر ہمراہ ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ آپ خود بھی پاپیادہ ہاتھ میں علم لیے محل سے پیکر کربلا تک ساتھ جاتے تھے۔ غرض ایام محرم میں شکر خیرات اور نیاز کا وہ عالم ہوتا تھا کہ دیکھنے والی آنکھیں ہی خوب جانتی ہیں۔ ۱۲ محرم تک تمام دفاتر و محکمہ جات میں تعطیل رہتی تھی۔

حضور پُرنور کے مختلف بیگمات سے نو اولادیں ہوئیں۔ جن کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

(۱) جناب عالیہ کنیز فاطمہ نواب سکندر بیگم صاحبہ عرف نواب بیگم

(۲) عالی جناب حسن علی خاں صاحب

(۳) عالی جناب حسین علی خاں صاحب

(۴) عالی جناب ہز ہائی نس نواب رضا علی خاں بہادر حال والیٔ رامپور

(۵) عالی جناب جعفر علی خاں صاحب

(۶) جناب عالیہ شہزادی بیگم صاحبہ

(۷) جناب عالیہ کنیز بتول صاحبہ

(۸) جناب عالیہ چھوٹی بیگم صاحبہ

(۹) عالی جناب وتن صاحب

نواب صاحب بہادر جہاں اپنے ہم چشم والیانِ ملک میں اور بہت سے اوصاف کے باعث غیر معمولی خصوصیات کے حامل کیے جاتے تھے وہاں داد و دہش کے میدان میں بھی آپ کا نہ رُکنے والا قدم کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ تعلیم سے آپ کو خاص شغف تھا۔ آپ نے علی گڑھ کالج۔ ایجوکیشنل کانفرنس اور ندوۃ العلماء کی حمایت و سرپرستی میں ہمیشہ غایت انہماک اور شاہانہ فیاضی سے کام لیا۔

جب دسمبر ۱۹۱۱ء میں مسلم یونیورسٹی فونڈیشن کمیٹی کے ضروری اور اہم اجلاس بمقام لکھنؤ منعقد ہونا شروع ہوئے تو اُن کے صدر حضور والا نواب سید حامد علیخاں ہی منتخب ہوئے۔ آپ نے جس حُسن و خوبی و کاوش اور حوصلہ مندی

کے ساتھ اپنے فرائض کو سرانجام دیا اُسی کا نتیجہ ہے کہ وہی علی گڑھ کالج جو کسی زمانہ میں ایک چھوٹی سی درسگاہ خیال کیا جاتا تھا آج ایک عظیم الشان دارالعلوم کی شکل میں تبدیل ہو چکا ہے۔ جب فروری ۱۹۱۱ء میں مسلم یونیورسٹی کو روپیہ کی سخت ضرورت تھی تو نواب صاحب نے بروقت بکمال فراخدلی ڈیڑھ لاکھ روپیہ کی گراں قدر رقم یکشت عطا فرما کر اتنا بڑا احسان فرمایا کہ قوم قیامت تک اس سے سُبکدوش نہیں ہو سکتی۔ جو تار عالی جناب نواب صاحب نے بسلسلۂ مراسلات متعلق مسلم یونیورسٹی ایجنٹ حیدرآباد کو دیا اُس کی نقل حسب ذیل ہے۔

"ہز ہائی نس سر آغا خاں اور ہندوستان کے مسلمانوں نے مجھ سے خواہش کی ہے کہ یونیورسٹی کے مسئلے کے متعلق ہز ہائی نس نظام سے ملاقات کروں اور حیدرآباد میرا آنا بحیثیت ایک والیٔ ملک کے نہ ہوگا بلکہ ایک مسلمان اور مسلم ایجوکیشن کی تائید میں ایک ناچیز کام کرنے والے کی حیثیت سے ہوگا۔"

مندرجۂ بالا تحریر سے صاف ظاہر ہے کہ نواب حامد علیخاں بہادر مسلمانانِ ہند کی تعلیم سے کس قدر دلچسپی لیتے تھے اور اس کارِ خیر میں کس قدر تندہی اور جانفشانی کو عمل میں لاتے تھے۔ آپ کی دریادلی اور فیاضیوں کے افسانے کچھ علی گڑھ ہی تک محدود نہیں رہے بلکہ اطراف و جوانبِ ہند کا ہر گوشہ اور ہر ناویہ آپ کی مدح طرازی سے آج تک لبریز ترنم ہے۔ چنانچہ بریلی کے اسلامیہ مڈل اسکول کے چندے میں کہ اب ہائی اسکول ہوگیا ہے ۱۹۱۳ء میں علاوہ قطعۂ اراضی عمارت اور ایک مستقل سالانہ امداد کے دس ہزار روپیہ نقد عطا فرمائے۔ جب ۱۹۱۸ء میں قحط پڑا تو کیفیاتِ مصائب سے متاثر ہوکر ایسے مواقع پر امدادِ عامہ کے لیے پچاس ہزار سالانہ ہمیشہ کے لیے وقف کر دیے۔ نمائشِ الٰہ آباد کے چندے میں بیس ہزار روپیہ کی گراں بہا رقم مرحمت فرمائی۔ جب لکھنؤ میں زنانہ اسکول قائم کرنے کی تحریک شروع ہوئی تو حضور ممدوح نے بھی چالیس ہزار کی ایک رقم یکشت عنایت فرمائی۔ شیعہ کالج لکھنؤ کا سنگِ بنیاد اپنے ہاتھ سے رکھا اور فوراً دو لاکھ روپیہ نقد اس کے فنڈ میں عطا فرما دیا۔

آپ کے فیضانِ کرم سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، شیعہ کالج لکھنؤ اور طبیہ و ویدک کالج دہلی خصوصاً اور ہندوستانی میرس میوزک کالج اور ہندوستان کے اور بہت سے علمی و فنی ادارے عموماً تادمِ آخر فیضیاب ہوتے رہے۔ نواب صاحب فطرتاً نہایت فراخدل، عالی ہمت اور بلند حوصلہ واقع ہوئے تھے جود و سخا کے باب میں اگر آپ کو نوشیروانِ ثانی کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ آج تک بیرونجات کے ہزاروں خاندان آپ ہی کے شاہانہ کرم کے سہارے عیش و آرام کی زندگی

گزار رہے ہیں۔ نواب صاحب کی ذاتِ والاصفات میں وہ تمام اوصاف مجتمع تھے جو انسانی شرافتِ نفس کا طرۂ امتیاز خیال کیے جاتے ہیں اور جن کو نیک نیتی، زندہ دلی، رحمدلی، محبتِ عامّہ اور حق پسندی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ تعمیرات کا اس قدر شوق تھا کہ جب تک زندہ رہے یہ سلسلہ ایک روز کو بند نہ ہوا۔ پرانے طرز کے محلات کو منہدم کرا کے اُن کی جگہ نئی نئی کوٹھیاں اور محلات تعمیر کرائے گئے اور نئے نئے باغات لگائے گئے۔ رفاہِ عام کے لئے کوتوالی عمارت عدالت اور عمارتِ کچہری صدر کے علاوہ جامع مسجد۔ امام باڑے۔ مٹن گنج ہسپتال اور ہائی اسکول وغیرہ وغیرہ کئی جدید عمارتیں تیار کرائی گئیں۔ بجلی اور تار برقی کے محکمے بغیر کسی محصول کے جاری کر دیئے گئے۔ اور بہت سے دیگر محصولات مثلاً پرمٹ چوکیواری کے قطعاً معاف کر دیئے گئے۔

چونکہ طبیعت فطرۃً رنگین پائی تھی لہٰذا حکم ہوا کہ ۲۱ مارچ کو تمام دفاتر اور محکمہ جات میں تعطیل ہوا اور جشنِ نوروز نہایت اہتمام کے ساتھ منایا جایا کرے۔ اس کے علاوہ سال کے مخصوص موقعوں پر اور بہت سے میلے بھی ترتیب دیئے جانے لگے جن کے ساتھ زنانہ بازار بھی لگتے تھے۔

نواب صاحب کی خاص خوبی جو آپ کو تمام والیانِ ملک سے حقیقتاً ممتاز کیے ہوئے تھی وہ آپ کی مہمان نوازی اور خاطر داری تھی۔ آپ کے دسترخوان کی وسعت کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ شہر و بیرونجات کے سیکڑوں شرفا جو زمانے کی ناسازگاری سے فاقہ زدہ ہو جاتے تھے اور نوبت فاقوں تک پہنچ جاتی تھی۔ بغیر کسی روک ٹوک کے سرکاری مہمان خانوں میں آکر مہمان ہو جاتے تھے اور مہینوں نعمت ہائے گوناگوں سے سیر ہوتے رہتے تھے غریب سے غریب اور بڑی بڑی ہستیوں کو آپ کا مہمان ہونے کا فخر حاصل رہا ہے۔ اور یہ صرف خاطر و مدارات اور وسعتِ اخلاق ہی کا سبب تھا کہ جو ایک مرتبہ بھی آپ کا مہمان ہو گیا وہ پھر عمر بھر آپ ہی کا کلمہ پڑھتا رہا۔ گفتگو بہت پُرلطف اور ہمیشہ انبساط کا پہلو لیئے ہوتی تھی۔ پژمردگی اور افسردگی سے سدا کا بُعد تھا۔ بُردبار، صابر اور ہمت اس بلا کے تھے کہ جوان اولادیں آنکھوں کے سامنے سے اُٹھ گئیں مگر پیشانی پر کبھی شکن تک نہ آنے پائی۔ وہی شگفتگی، وہی شادابی۔ وہی زندہ دلی۔ فنِ موسیقی میں اس قدر کمال حاصل تھا کہ بڑے بڑے اُستاد آپ کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے تھے۔ ہندوستان کا کوئی ماہرِ فن ایسا نہ ہوگا جس نے اس دربار سے دادِ فن نہ پائی ہو اور انعام و اکرام سے مالا مال ہو کر نہ گیا ہو۔

نواب صاحب خلد آشیاں کا قول تھا کہ "ہمارے بعد ریاست کا نام یہی روشن کریں گے۔" چنانچہ یہ پیشین گوئی بھی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی اور بالآخر ۱۹۱۲ء میں گورنمنٹ انگلشیہ کے ایک ذمہ دار اور اعلیٰ افسر کو ریاست کی سالانہ رپورٹ میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھنا ہی پڑا کہ "نواب صاحب بہادر کی حکومت انتظامی قابلیت نہایت اعلیٰ رکھتی ہے۔"

جہاں آپ کے اعلیٰ اور بلند پایہ کیرکٹر میں اور بہت سی خصوصیات نہایت شاندار اور انمول تھیں وہاں آپ کی خدا ترسی۔ رحمدلی۔ رعایا پروری اور بے تعصبی بھی کسی طرح کم نہ تھیں۔

بغیر کسی مذہبی ملی یا قومی اختلاف کو دل میں جگہ دیئے ہوئے آپ بڑی کاوش و محنت کے ساتھ عدالت العالیہ کے فیصلوں کے بعد اکثر و بیشتر مقدمات کی اپیلوں کو بذاتِ خود سنتے اور حکم لکھواتے تھے اور گاہے گاہے افواج کی قواعد و دیگر محکمہ جات کا معائنہ بھی فرماتے تھے۔ آپ کے عہدِ معدلت گستر کی سب سے بڑی شان رحم اور چشم پوشی تھی۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ حصول داد و دہش میں آپ کے بدخواہ بھی خواہان وابستگانِ دامنِ دولت سے بازی لے گئے ہیں۔ آپ کے زمانۂ حکومت میں جب سے کہ حضور جنت مکان نے اختیاراتِ کلیہ ہاتھ میں لیئے تھے آخر وقت تک کسی قسم کا کوئی جھگڑا اقتصادی، مذہبی یا تمدنی حدودِ ریاست میں وقوع میں نہیں آیا۔

یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ سرکار جنت مکان کوئی معمولی ماہرینِ فنِ موسیقی نہیں تھے اور جملہ فنونِ لطیفہ میں آپ کو کم و بیش دخل حاصل تھا۔ لیکن تاہم خصوصاً جو چیز آپ کو بزرگوں سے وراثت میں ملی تھی وہ شاعری تھی۔ چونکہ ولادت نواب کلب علیخاں خلد آشیاں جیسے نکتہ آفریں شاعر "شاعر نوازِ حکمراں کے عہد میں ہوئی تھی لہذا اُس زمانے کے بہترین ادبا و فضلا کی شب و روز کی صحبتوں نے اور بھی سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ منشی امیر احمد صاحب مینائی کے فرزند محمد احمد صاحب مینائی المتخلص بہ قمر سے تلمذ اختیار کیا اور رشک تخلص کے ساتھ شعر کہنے لگے۔

چونکہ طبیعت فطرتاً من چلی اور رنگین واقع ہوئی تھی لہذا طبیعت کی موزونیت کے لحاظ سے شعر گوئی کو غزلیات ہی تک محدود رکھا اور شروع ہی میں وہ جوہر دکھائے کہ اُستاد تو اُستاد تمام دربار سر دُھنے لگا۔ نموناً ایک غزل نقل کی جاتی ہے۔

---

# غزل

کیا چیز ہے وقت کم سِنی کا | کچھ خوف نہیں بُری بھلی کا
کیوں مست ہی فصلِ گل میں بلبل | کیوں رنگ ہی اِسپہ بیخودی کا
رونے میں اثر نہیں ہمارے | اس پر بھی گمان ہے ہنسی کا
کہتی ہے ادا سے اُس کی شوخی | کٹ جائے گا اب گلا کسی کا
ہوتے ہی جُدا کسی سے افسوس | جاتا رہا لُطف زندگی کا
دل لے کے بھلا مُکرتے ہو کیوں | بتلاؤ تو خوف ہے کسی کا
رونا ہے کبھی، کبھی ہے جلنا | اُلفت میں تو ہے مزا اسی کا
آنکھوں سے لہو بہا ہے برسوں | یہ رنگ ہے اپنی عاشقی کا

اے رشکؔ کلام میں تمہارے
انداز نیا ہے شاعری کا

ہز ہائی نس کے کلام میں جو خصوصیت سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز ہے وہ معاملہ بندی محاورات کا برمحل استعمال اس طرح کہ بندش کی چستی ہاتھ سے نہ جائے اور زبان کی صفائی اور بے تکلفی ہے۔ اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ریاستِ رامپور کا سا عظیم الشان کتب خانہ شاید ہی کسی دیسی ریاست میں جو تو ہو ورنہ قلمی نسخہ جات کے لحاظ سے ہندمیں نہیں تو صوبۂ ہذا میں عدیم المثال ضرور ہے۔

آپ کی کتب بینی و وسعت مطالعہ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ باوجودیکہ آپ نے ایک عرصہ سے کتب بینی کے مشاغل سے معذوری اختیار کر لی تھی ضرورۃً کبھی اچھی طرح یاد تھا کہ فلاں کتاب فلاں الماری میں فلاں جگہ رکھی ہے اور فلاں نسخہ فلاں الماری میں رکھا ہے اور اکثر جب کبھی کسی فاضل یا ملد وست بزرگ سے کسی علمی بحث میں الجھ جاتے تھے تو کتابوں کا بلکہ صفحوں کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بھی فرما دیا کرتے تھے کہ وہ کتاب آپ کو کتب خانہ کے فلاں کونے میں جو الماری رکھی ہے اُس کے فلاں خانے میں فلاں جگہ ملے گی۔

مندرجہ بالا حقیقت سے پتہ چلتا ہے کہ حضور نواب صاحب کا مذاقِ کتب بینی کتنا وسیع اور حافظہ کس قدر زبردست تھا۔

یہ بات کس قدر محیر العقول اور قابل قدر ہے کہ ایک ہی شخص بیک وقت ایک کامیاب حکمراں ایک اعلیٰ فاضل ایک بلند پایہ شاعر اور ایک ماہر فنِ موسیقی ہو۔ یقیناً نواب صاحب جنت مکاں اگر ایک طرف گورنمنٹ کی نظروں میں نہایت ممتاز اور قابلِ عزت خیال کیئے جاتے تھے۔ اور کوئی سال ایسا خالی نہیں جاتا تھا کہ حضور پُر نور پر حضور شہنشاہِ معظم کی سالگرہ و نوروز کے مواقع پر قومی اعزازات و دیگر خطابات کی بارش نہ ہوتی ہو تو دوسری طرف عام لوگوں کے دل آپ کی محبت اور عقیدت سے لبریز نظر آتے تھے اور اس قسم کے مظاہرے سال کے مخصوص موقعوں پر اکثر پبلک کی طرف سے ہوتے رہتے تھے اور آج اگر ایک طرف نواب صاحب کی وفاتِ حسرت آیات نے پہاسو چمیز میں ایک غمگین سکوت ایک درد آمیز خاموشی ایک ماتم خیز اداسی مسلط ہے تو دوسری طرف انجمن ہائے ماتمۂ نالہ و فریاد اور آہ و بکا کی بیا تک اور فلک دوز شور و غوغا سے محشرستاں بنی ہوئی ہیں ؎

اس طرح جی کہ بعد مرنے کے
یاد کوئی تو گاہ گاہ کرے

"ماخوذ"

# دعائے مرگ

(از مسودۂ زیارت حضرت جوش ملیح آبادی)

کر قطع نخلِ عمر گلستاں کا واسطہ
یا رب بہارِ عالمِ امکاں کا واسطہ

اب آفتابِ عمر کو دے رخصتِ غروب
تجھکو طلوعِ صبحِ درخشاں کا واسطہ

کام و دہن کو موت کی تلخی سے کر دوچار
شکر فشانیٔ لبِ خوباں کا واسطہ

اب طولِ زندگی سے مجھے کر نہ شرمسار
بالیدگیٔ زلفِ پریشاں کا واسطہ

یا رب بہارِ عمر کو دے اب خزاں کا درس
موجِ نسیم و طبعِ گلستاں کا واسطہ

کربِ فنا و تشنگیٔ مرگ کر عطا
عمرِ مسیح و چشمۂ حیواں کا واسطہ

اب چشمِ تر سے چھین بھی لے نورِ زندگی
اہلِ نظر کے دیدۂ حیراں کا واسطہ

اب قیدِ آب و گل سے رہائی کا دے پیام
تجھکو مآلِ شاہدِ کنعاں کا واسطہ

بادِ اجل سے جلد بجھا دے چراغِ عمر
پچھلے پہر کے نجمِ پُر افشاں کا واسطہ

ظرفِ گلو سے توڑ بھی لے گوہرِ حیات
یا رب نزولِ قطرۂ نیساں کا واسطہ

ایفا کر اب اجل کا کیا تھا جو تو نے عہد
شیریں لبوں کی لغزشِ پیماں کا واسطہ

دے روزِ گرمِ زیست کو اب حکمِ اختصار
تجھکو درازیٔ شبِ ہجراں کا واسطہ

زہ قامتِ حیات پہ کر اب کمانِ مرگ
تجھکو بلندیٔ قدِ خوباں کا واسطہ

دے روشنی جبیں کو پسینے سے موت کے
سیمیں تنوں کی تابشِ افشاں کا واسطہ

اب فکرِ زندگی سے فراغت کی دے نوید
تجھکو فریبِ وعدۂ جاناں کا واسطہ

چٹکی سے چھوڑ ناوکِ ہستی شکار کو
رنگیں رخوں کی جنبشِ مژگاں کا واسطہ

اب نشۂ حیات سے دے جوش کو فراغ
تجھکو خمارِ نرگسِ جاناں کا واسطہ

# حسن بن صباح

عبدالعلیم صاحب نامی

"اساسن" انگریزی لغت کا ایک لفظ خیال کیا جاتا ہے لیکن بہت کم لوگ اس سے واقف ہیں کہ یہ عربی زبان کا ایک لفظ ہے جو انگریزی کے قالب میں ڈھال لیا گیا ہے۔ اس کا تعلق ایران کی اُس عظیم ترین ہستی سے ہے جو پہاڑی شیخ (شیخ کوہی) کے نام سے تاریخی صفحات میں نظر آتی ہے۔ تعجب کی بات نہیں بلکہ واقعات کی بے ترتیبی قسمت کی بدنصیبی ہے کہ ایک ہی کان کے دو ہیرے کبھی شاہی تاج کو زینت بخشتے ہیں اور کبھی ہاون دستہ کی زد سے محفوظ نہ رہ کر سرمہ بنتے ہیں۔ ایک ہی شاخ کے دو پھول کبھی کسی حسین کے سینے کو رونق بخشتے ہیں اور کبھی امواج کی لہروں میں آکر یا کسی ناشاد کی مٹھیوں میں دب کر اپنی سیاہ بختی کا ثبوت دیتے ہیں اور کچلے جاتے ہیں یہ میری بدقسمتی ہے۔ قسمت کا جہاں تک تاریخی صفحات سے تعلق ہے اس نے کبھی انسان کو اتنا برداشتہ خاطر نہیں کیا جتنا پانچویں صدی ہجری میں امام موفق الدین ان بزرگ ترین ہستیوں میں سے تھے جن کی شہرت دور دراز ملکوں تک پھیلی ہوئی تھی اور جس نے سیکڑوں طلبا کو ان کے مکتب کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ انہی میں تین ایرانی جوان بھی تھے جن کو کبھی اس بات کا خیال تک نہ گزرا تھا کہ وہ بقائے دوام حاصل کریں گے یا انتہا تک اپنا روشن نام چھوڑ جائیں گے۔ ان میں دو حسن تھے اور تیسرا عمر وہ آپس میں انتہائی دوست تھے اور اس دوستی نے رفتہ رفتہ یک رنگی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ یہی وہ ہستیاں ہیں جو دنیا میں اپنے اپنے موقعوں پر کامیاب رہیں اور اُنھوں نے وہ نام چھوڑا جو آج تک عزت سے لیا جاتا ہے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ اُنھوں نے خدا کو درمیان دے کر قسمیں کھائیں کہ اگر ان میں سے کوئی معزز عہدے پر پہونچے یا دولتمند بنے تو باقی ماندہ کو اپنا شریک کار بنائے۔ درس ختم ہوا اور وہ مختلف سمتوں کو اپنی قسمت آزمائی کے لیئے روانہ ہو گئے۔ ان میں سے ایک حسن شاہ سلجوق کے دربار میں پہونچا اور اپنی خداداد ذہانت کی بدولت جلد وزیر اعظم کے درجہ تک ترقی کر گیا۔ شاہ نے نظام الملک طوسی"

کا خطاب بخشا اور اس کو اس کی انتھک کوششوں کے صلے میں بہت کچھ انعام و اکرام عطا کیا۔ یہ وہی شخص ہے جو مدرسۂ نظامیہ کا بانی تھا اور جس کا نام اب تک عزت و عظمت کے ساتھ لیا جاتا ہے اور اُس کی اسلامی خدمات سے آج تک تاریخی صفحات روشن ہیں۔ دوسرا شاگرد جس کا نام عمر تھا عمر خیام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہ اپنے زمانہ کا ایک جدت پسند فلسفی زبردست ریاضی داں، قابل ہیئت داں اور شاعر تھا۔ اور جس کی رباعیات آج تک دنیا کو محو حیرت کرتی ہیں اور اس کو غیر فانی شہرت کا مستحق بناتی ہیں اور جس کو پارسی اب تک بہ نظرِ احسان دیکھتے ہیں کیونکہ اسی نے ان کی تقویم پارینہ کو از سرِ نو زندہ کیا اور ترمیم و تنسیخ کے بعد قائم کیا۔ تیسرے شاگرد کا نام حسن تھا جو حسن بن صباح کے نام سے تاریخ میں یاد کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں سے زیادہ قابل اور اُستاد کا مایۂ ناز شاگرد تھا۔ ان میں نظام الملک پہلا شخص تھا جو وزیر اعظم کے درجہ پر پہونچا اور شاہ سلجوق کا منظورِ نظر بنا۔ عمر خیام بھی بہت جلد ملک الشعراء کے درجہ پر ممتاز ہو گیا اور ایک خوب صورت باغ اور بہت سی جائداد کا عطیہ شاہ سے حاصل کیا۔

## مسلمانوں کی خفیہ جماعت

خفیہ جماعتیں آجکل بہت مفید ثابت ہو رہی ہیں اور دنیا کے تمام ملکوں میں ان کا ایک وسیع جال پھیلا ہوا ہے۔ جہاں تک تاریخی داستانوں سے اس کا تعلق ہے پیغمبر سلیمان اس کے بانی نظر آتے ہیں لیکن اس کا کوئی کافی ثبوت موجود نہیں ہے۔ غالباً مسلمانوں کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ مسلمانوں کی پہلی خفیہ جماعت افریقہ میں قائم ہوئی اور اس کا بانی ایک اسماعیلی تھا۔ مصر کے فاطمی خلفاء اس کے معاون تھے۔

اسماعیلی فرقہ نے اپنی کامیابی اس وقت کی ملکی فضاء میں مضمر دیکھی جب ایک شخص دوسرے کا جانی دشمن تھا ملک میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ دربار سازشوں کا آماجگاہ بنا ہوا تھا اور مسلم خون سے حاصل کی ہوئی زمینیں ٹکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم ہو رہی تھیں۔ اس جماعت میں صرف وہی لوگ شامل ہو سکتے تھے جو قرآن پر قسم کھاتے اور اس کے تمام آئین و قوانین پر عمل کرنے کا وعدہ کرتے۔ قروان میں ان کا دفتر تھا لیکن کچھ عرصہ بعد قاہرہ جو خلفائے فاطمی کا

---

علـہ دوسرے تاریخداں امام موافق لکھتے ہیں ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۱۹ صفحہ ۱۰۰۔ ہارمسورتھ یونیورسل انسائیکلو پیڈیا جلد صفحہ ۵۰۴۔ ایوری مینس جلد ۱۰ ابن خلقانس بائیگرافکل ڈکشنری جلد سوم۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام مولفہ ہاسماونسک۔ کیسلس لٹ آف تاریخ جلد چیمبرس بائیگرافکل ڈکشنری صفحہ ۰۰۰۔ رباعیات عمر خیام مطبوعہ میکملنس۔ رباعیات عمر خیام مؤلفہ و مترجمہ فزجیرلڈ۔ رباعیات عمر خیام مؤلفہ حافظ جلال الدین احمد و مترجم

ہیڈکوارٹر تھا، تبدیل کر دیا گیا۔ ان کا افسرِ اعلیٰ "داعی الدرجات" کہلاتا تھا اور موجودہ زمانہ کے گرانڈ ماسٹر سے مشابہ تھا لیکن اس کے زیرِ اقربت سی دوسری قومیں بھی تھیں جن کو وہ نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتا تھا۔ یہ جماعت ہفتہ میں دو مرتبہ یکجا ہوتی اور انتہائی راز کے ساتھ معاملات طے کرتی۔ المامقریزی کا بیان ہے کہ یہ سات حصوں پر تقسیم تھی لیکن قاہرہ میں تبدیل ہونے پر اس میں دو حصوں کا اور اضافہ کر دیا گیا۔ اس میں داخل ہونے والوں کو جو داعی کہلاتے تھے اس بات کی قسم کھانی پڑتی تھی کہ وہ اپنے افسرِ کا حکم مانیں گے۔ جس بات کی فرمائش کی جائے گی اُس سے منکر نہ ہوں گے اور نہ آپس میں لڑیں گے۔ اس کے بعد اُن کو مقاصد کی تلقین کی جاتی تیسرے عہدے پر اسماعیلیہ مذہب کے ارکان بتلائے جاتے۔ سات اماموں کا ماننا اور اسمٰعیل بن جعفر صادق کو رُکنِ اعظم جاننا۔ خدائی کے چوتھے عہدے پر خدا کے سات پیغمبروں پر ایمان لانا بتلایا جاتا یعنی آدم، نوح، ابراہیم موسیٰ، عیسیٰ، محمد اور اسمٰعیل بن جعفر صادق اور یہ عقیدہ کہ اُن کے ثانی ان کے کاموں میں پوشیدہ امداد کرتے ہیں۔ جعفر صادقؒ کے بعد اُن کے پوشیدہ اماموں میں اضافہ ہونا شروع ہوا۔ ہر ثانی کے پاس بارہ داعی ہوتے جن کی تعلیم پانچویں عہدے تک ہوتی تھی۔ چھٹے عہدے کی یہ تلقین تھی کہ شریعت کے احکام فلسفہ اور دلائل کے رو سے صحیح اور اصول پر مبنی ہیں۔ ساتویں کا مقصد اُن کو خفیہ اشارات و نشانات سے آگاہ کرنا تھا۔ آٹھویں کا خیال مین یکجہتی اور عمل میں یکسانی پیدا کرنا۔ نویں نے ان کو تلقین دلایا جتلا کہ بسوائے داعیوں کے اور کسی کے احکام نہ سنیں اور اسی پر پوری توجہ دیں اور جس طریقہ سے اُن کو حکم دیا جائے ویسا عمل کریں۔

## حسن کی ابتدائی زندگی

حسن بن صباح کی روانگی کے وقت یہ فرقہ اپنا کام نہایت اطمینان بخش طریقے سے کر رہا تھا اور اس کا اثر دور و نزدیک اور روز بروز پھیلتا جاتا تھا۔ اس کے داعی خاص خاص مقاموں پر تعینات تھے اور اُس کی بڑھی ہوئی قوت کو اور مستحکم بنا رہے تھے۔ حسن بن صباح اثناء عشریہ سے تعلق رکھتا تھا۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ اِدھر اُدھر گھومتا رہا لیکن حسب منشا ملازمت نہ ملی۔ اسی دوران میں اس کو معلوم ہوا کہ اس کا پرانا دوست حسن "نظام الملک" وزیرِ اعظم کے درجہ تک ترقی کر گیا ہے وہ شاہ سلجوق کے دربار میں پہونچا اور اس کو پرانا وعدہ یاد دلایا۔ نظام الملک ایماندار آدمی تھا اپنے دوست کا خوشی کے ساتھ استقبال کیا اور شاہ سے سفارش کر کے اُس کو ایک معزز عہدہ دلوایا۔ لیکن حسن کینہ فطرت تھا اور یہ

نہ دیکھ سکتا تھا کہ اس کا دوست اس سے اعلیٰ منصب پر تعینات ہو۔ ایک دن شاہ نے نظام الملک کو حکم دیا کہ اس کے تمام ملک کا حساب و کتاب جلد سے جلد تیار کرے۔ سلطنت چونکہ وسیع تھی اور حساب کتاب شاہی خزانہ میں ترتیب سے رکھا نہ جاتا تھا اس لیے اُس نے دو سال کی مہلت طلب کی لیکن حسن بن صباح نے جو اُس وقت دربار میں موجود تھا عرض کیا "حضور میں چالیس دن کے اندر اس کام کو انجام دے سکتا ہوں"۔ شاہ متعجب ہوا اور وزیر حیرت سے اُس کا منہ تکنے لگا۔ شاہ نے اُس کی قابلیت کا امتحان لینے کے لیئے کام سپرد کر دیا۔ چالیس دن کے اندر اُس نے یہ عظیم الشان کام پورا کر دیا اور چالیسویں دن ہی کھاتوں کے ساتھ دربار میں حاضر ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ نظام الملک نے حسن کے پرائیویٹ کلرک کو لے دے کر اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ صفحات کو سادہ چھوڑ دے اور اس طریقے سے حسن شاہ کو اطمینان بخش جواب نہ دے سکے اور خفگی کا باعث ہو۔ اگر حسن اس کام کو پورا کر دیتا تو نظام الملک کا زوال لازمی تھا۔ شاہ نے خوشی کا اظہار کیا لیکن جب سوالات پیش ہوئے تو اُس نے بجائے جواب دینے کے صفحات کا حوالہ دیا۔ نظام الملک آگے بڑھا اور عرض کیا "حضور عالی! عقلمندوں کا شیوہ ہے کہ اس جیسے عظیم کام کے لیے کافی وقت طلب کرتے ہیں لیکن بے وقوف اس مقام پر اپنا اثر جمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاں فرشتے تک آہستہ چلتے ہیں"۔ حسن بے عزتی کے ساتھ دربار سے نکال دیا گیا۔

حسن اس شکست سے پژمردہ یا برداشتہ خاطر نہ ہوا بلکہ پائے استقلال کو اور زیادہ مضبوطی سے گاڑ دیا اور شام سے اصفہان کی طرف روانہ ہو گیا۔ مدتوں ایک جگہ سے دوسری جگہ پھرتا رہا۔ اسی دوران میں وہ اسماعیلیہ داعیوں سے ملا اور اُس نے دوستی پیدا کی جو رفتہ رفتہ بیعت میں تبدیل ہو گئی۔ اس سے کہا گیا کہ وہ قاہرہ میں خلیفہ مستنصر باللہ اسماعیلیہ امام سے ملے۔ اُس نے ایسا ہی کیا اور اپنی خداداد قابلیتوں کی بدولت ایک عہدے سے دوسرے عہدے پر جلد جلد ترقی کرنے لگا۔ اس سے دوسروں کو حسد ہوا اور اُنھوں نے ایک شب ایک جہاز میں جو شمالی افریقہ جا رہا تھا بند کر کے روانہ کر دیا۔ جہاز سمندر کی طوفانی موجوں میں گرفتار ہو گیا اور ایک عرصہ تک فٹ بال کی طرح زبردست لہروں پر اُچھلتا رہا۔ تمام ملاح جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے اور

گڑگڑا کر دست بدعا تھے لیکن حسن خوش تھا گویا وہ سمندر کے غضب سے بے خبر ہے اُس نے دوسروں کو بھی خوش کرنے کی کوشش کی اور کہا "ڈرتے کیوں ہو۔ خدا نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہم کو ڈوبنے نہ دے گا" کہا جاتا ہے کہ اس نے یہ جان کر کہا کہ اگر جہاز ڈوبے گا تو سب تباہ ہو جائیں گے اور اس کے ساتھ وہ بھی اگر بچ جائے گا اُس کی فتح ہو گی چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جہاز سمندر کی طوفانی لہروں سے نکل کر صاف سطح پر چلنے لگا اب اس کی فتح تھی تمام ملّاح اور مسافر اس کے سامنے سربسجود تھے اور اسمٰعیلیہ فرقے سے بیعت کر رہے تھے۔ اسی طرح اس نے آئندہ سیر و سیاحت میں بے شمار مرید کیے اور آخر میں الملات کی پہاڑیوں میں مقیم ہو گیا۔

## حشاشین یا اساس

حسن نے خود کو ایک مضبوط قلعہ میں محفوظ پا کر ایک نئے فرقہ کی بنیاد ڈالی جو اساس کہلاتا ہے اُس نے اسمٰعیلیہ آئین کو گھٹا کر سات تک محدود کر دیا۔ اس کی قوت روز بروز بڑھنے لگی اور قرب وجوار کی طاقتیں مغلوب ہوتی گئیں۔ الملات (الطاعونت) کے پہاڑی سلسلہ میں بے شمار قلعے تعمیر ہوئے اور خوبصورت محلات، عالیشان حویلیاں جن کے نمونے انسان نے اُس وقت تک دیکھے تھے بنائی گئیں۔ حسن نے تھوڑے ہی عرصہ میں اس غیر آباد خطے کو شاداب بنا دیا اور جنگل میں منگل کا منظر نظر آنے لگا۔ اس کا مقصد در اصل یہی تھا کہ عام نگاہوں سے جدا ہو کر وہ عیش و عشرت کے لوازمات سے مستفید ہو۔ خاص محل کے لیئے بہترین اشیاء مہیا کی گئیں اور ہر شے کو اعلیٰ پیمانہ پر سجایا گیا۔ مزید اضافہ کے لیئے مہ جبیں کنواری لڑکیاں اور حسن کی دیویاں مدعو کی گئیں جن کا کام صرف خوش رہنا اور لوگوں کو خوش کرنا تھا۔ فدائی جو بیعت کے اوّل درجہ سے گزرتے تھے اسی دنیاوی جنت میں لائے جاتے تھے اور اُن کو ایک قسم کا عرق جو حشیش[1] کہلاتا تھا پلایا جاتا تھا جس سے اُن کے ہوش و حواس کھو جاتے تھے۔

---

[1] از قسم بھنگ وافیون ۱۲

چونکہ یہ اُن کو شروع ہی سے ایک بڑی مقدار میں دیا جاتا تھا اس لیئے یہ حشیشی یا افیونی کہلاتے تھے۔ جب فدائیوں کی خواہشات نیم پوری ہو جاتی تھیں تو اسی نیم غشلی میں وہ پہاڑ کے نیچے لایا جاتا تھا اور شیخ کے ہاتھوں کو بوسہ دیتا تھا اور کہتا تھا کہ وہ داعی کا حکم بے چون وچرا بجا لائے گا۔ حسن کا گروہ اُس وقت تین حصوں پر مشتمل تھا (۱) فدائی (پجاری) (۲) رفیق : ساتھی ، (۳) داعی (اعلیٰ) تمام مرید مختلف مقامات پر بیٹھے ہوئے تھے ۔ فدائی ایک جام نوش کرنے کے بعد اپنے شیخ کا ہر وہ حکم ماننے کے لیئے تیار ہو جاتے تھے جس کے لیئے اشارہ ہوتا تھا خواہ اس میں اُن کی جان ہی کیوں نہ ضائع ہو جائے۔ ایسے لوگ عموماً جوان قویٰ کے مضبوط اور بہادر ہوتے تھے اور موت کے ساتھ ایسے ہی کھیلتے جیسے بچے گیندوں سے کھیلتے ہیں۔

فدائی اپنی اس تربیت کی بناپر وہ کام کر جاتے تھے جو دولت اور قوت سے ناممکن تھا۔ وہ مشکلات کا سامنا بہادری سے کرتے تھے اور نتائج کو بالکل خیال میں نہ لاتے تھے۔ ایک فدائی نے نظام الملک کا خاتمہ کیا۔ جس کے متعلق وہ کبھی بدنیتی کا خیال بھی نہ کر سکتا تھا۔ ایک نے سلطان سنجر کے خاص بستر پر اُس کے تکیہ کے نیچے خنجر رکھ دیا۔ اس سے سلطان اس قدر خوف زدہ ہوا کہ اُس پہاڑی شیخ سے مصلحت کر لی جس کو کچھ عرصہ پیشتر بے عزت کر کے دربار سے نکالا تھا۔ صلح کی شرطیں یہ تھیں۔

(۱) اسمٰعیلیہ فرقہ کے لوگ اس کی مملکت میں فوجی قلعہ تعمیر نہ کریں گے

(۲) نئے ہتھیار برآمد نہ کیئے جائینگے۔

(۳) حسن لوگوں کو اپنے مذہب میں داخل نہ کرے گا۔

اس صلح کو قائم رکھنے کے لیئے شاہ کو ایک معقول رقم پہاڑی شیخ کو بطور الاؤنس سالانہ دینی پڑتی تھی۔ حسن نے شرائط کو بخوشی منظور کر لیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے تمام کام راز میں ہوتے ہیں۔

**قوت کا استحکام** | حسن اور اس کے حشیشی تمام ایشیا اور افریقہ کے لیے ایک خوف زدہ جماعت بن گئی
اُس کے پجاریوں کی زندگیاں اُس کے معمولی اشاروں پر تھیں۔ سلطان اور شاہ
اُس سے اور اُس کی پوشیدہ جماعت سے خوف زدہ تھے۔ قیمتی جانوں کا تحفظ بیکار تھا۔ حشیشی اپنے زمانے کے
سب سے زیادہ کامیاب قاتل شمار ہونے لگے تھے لیکن حسن کی وفات ۵۱۸ھ کے بعد اُن کی قوت کمزور پڑنے
لگی پھر بھی کئی فاطمی خلیفہ ان کے ظلم وستم کا نشانہ بنے اور بہت سے علماء و فضلاء کی جانیں اُن کے خنجروں کے
نذر ہوئیں ان سے چھپنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ ان کا آنا موت کا آنا تھا اور اُن کا جانا آفتاب کا طلوع ہونا۔

(ترجمہ)

# کہ میں کیا چیز ہوں کیوں ہوں کہاں ہوں کس کا خواہاں ہوں

میں وہ خود کردۂ جوشِ جنونِ فتنہ ساماں ہوں
کہ فیضِ چاکِ دل سے غیرتِ صد صبحِ خنداں ہوں

مزا ہے زندگانی کا اگر مشکِ خود افشاں ہوں
مثالِ بُو چمن زارِ محبت میں پریشاں ہوں

جلا کر خاک کر ڈالا جسے برقِ حوادث نے
وہی میں خرمنِ وابستۂ ارمانِ دہقاں ہوں

مٹا دیتا ہی تابِ مہ کو نورِ عاجزی میرا
جو شرماتا ہے ذرّوں کو میں وہ خورشیدِ تاباں ہوں

زمانے بھر میں ہوں بدنام لیکن یہ نہیں کھُلتا
کہ میں کیا چیز ہوں کیوں ہوں کہاں ہوں کس کا خواہاں ہوں

شہیدِ جستجو ہوں یہ تو عالم آشکارا ہے
نہیں معلوم لیکن جستجو میں کس کی حیراں ہوں

اگر ہے شوقِ نظارا تو وا کر دیدۂ باطن
نہاں ہوں پردۂ ہستی میں لیکن پھر بھی عریاں ہوں

مجھے حاجت نہیں اے چارہ گر کچھ پردہ داری کی
کہ اصلِ حُسن ہوں زیرِ نقابِ حُسن پنہاں ہوں

کیا کوزے میں دریا بند اس نیرنگِ الفت نے
میں تھا کل تک تو اک بے مایہ قطرہ آج طوفاں ہوں

مجھے بے چین کر دیتا ہے کس کا جلوۂ مضطر
میں کس کی اشک ریزی پر الٰہی آج گریاں ہوں

رُلا کر غیر کو سیکھا ہے میں نے نالہ کش رہنا
قتیلِ عشق ہوں زحمت کشِ خود کردہ ساماں ہوں

رہِ الفت میں ہی قطعِ علائق منزلِ اول
بجا ہے میں جو اپنی چاک دامانی پہ نازاں ہوں

دکھا دوں گا اثر دنیا کو اپنی بے قراری کا
جو لرزا دیتی ہے دہقاں کو میں وہ برقِ لرزاں ہوں

نہیں ہے بے سبب یہ زار نالی میری اے بلبل
رُلاتا ہے کسی کو ورنہ میں کیوں آج نالاں ہوں

مٹا دوں گا میں لوحِ دل سے اک اک نقشِ باطل کو
شرارِ عشق ہوں آتش زنِ ہر کشتِ ارماں ہوں

دبائے پھر رہا ہوں دل میں اک احساس کی دُنیا
نہ میں اِس سے گریزاں ہوں نہ میں اُس سے گریزاں ہوں

ہر اک شے ہے مجھے آئینۂ رخسارِ شاہد کا
تہِ چرخِ کہن لذت کشِ صحرا و بستاں ہوں

ریاضِ دہر میں مجھ سے نہیں نا آشنا کوئی
شعاعِ مہر کی صورت میں ہر پتّی پہ رقصاں ہوں

---

میں اہلِ جاہ بھی ہوں صاحبِ اعزاز و ثروت بھی
یہ سب کچھ ہوں مگر زحمت کشِ گردونِ گرداں ہوں

تغیر ہے بنا میرے حصارِ زندگانی کا
ابھی مستورِ غنچہ میں ابھی بوئے پریشاں ہوں

یہ آبادی ہی آبادی یہ بربادی ہی بربادی
ابھی ناواقفِ حسرت ابھی دنیائے ارماں ہوں

ابھی ہوں منظرِ رفعت ابھی پستی کا نظارہ
ابھی شادی کا گلشن ہوں ابھی صحرائے حرماں ہوں

ثباتِ زندگی کو ڈھونڈھتا پھرتا ہوں عالم میں
اسی باعث میں سرگرداں ہوں مضطر ہوں پریشاں ہوں

سکونِ دل مگر نایاب ہے غوغائے ہستی میں
عبث ہے جستجو رفعت کی اے نادان پستی میں

# راستگوئی

(از احمد صاحب برادہ)

راستی را پیشۂ خود کن مدام
تا شوی در ہر دو عالم نیکنام

انسان تنہا رہنے کے لئے نہیں بنایا گیا۔ وہ اپنے دوسرے ہمجنسوں کے ساتھ رہتا ہے اور برادری کا ایک رکن ہونے کی حیثیت سے اس پر چند فرائض عائد ہوتے ہیں جن میں سے ایک سچ بولنا ہے۔ دنیا کے کام ایک دوسرے کے اعتبار پر چلتے ہیں۔ اس لئے اگر سب لوگ جھوٹ بولنے لگیں تو کوئی کسی کے عہد و پیمان کا یقین نہ کرے اور یہ کارخانہ درہم برہم ہو جائے۔

خود غرض اور بزدل آدمی اپنے کسی فائدہ کے لئے جھوٹ بولتا ہے اور اس کے پردہ میں پناہ تلاش کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے اوّل اوّل اس کو نفع پہنچ جاتا ہے لیکن یہ نفع دیرپا نہیں ہوتا اور بعد کو اس سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ اس نفع سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ جب اس کی قلعی کھلتی ہے تو وہ سب کی نظروں میں ذلیل و حقیر ہوتا اور پھر اس کی کسی سچی بات کا بھی اعتبار نہیں کیا جاتا۔

بعض لوگوں نے سچ بولنے کے لئے بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں۔ کیوں کہ وہ اُس کے حقیقی فائدوں سے آگاہ تھے۔ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت منقول ہے کہ آپ ایک مرتبہ دریا میں سفر کر رہے تھے۔ کشتی میں بہت سے آدمی سوار تھے۔ ایک شخص کی اشرفیوں کی تھیلی کسی نے چرالی۔ اُس نے کشتی کے تمام آدمیوں سے باری باری دریافت کیا کہ کیا تم نے میری تھیلی کہیں دیکھی ہے۔ سب نے جواب دیا نہیں۔ جب اُس نے امام صاحبؒ سے یہی سوال کیا تو آپ نے بھی یہی کہہ دیا کہ مجھ کو علم نہیں۔ اس کے بعد اس شخص نے یکے بعد دیگرے سب لوگوں کی تلاشی لینی شروع کی۔ اتفاق سے امام صاحبؒ کے پاس بھی اشرفیوں کی ایک تھیلی تھی۔ جب آپ نے دیکھا کہ وہ شخص لوگوں کی تلاشی لے رہا ہے تو آپ نے چپکے سے اپنی اشرفیوں کی تھیلی کو دریا میں پھینک دیا۔ بس جب آپ کی تلاشی کی باری

آئی تو آپ کے پاس سے کچھ برآمد نہیں ہوا۔ بعد میں آپؒ کے ایک دوست کو یہ حال معلوم ہوا تو اُس نے دریافت کیا کہ آپ نے اپنی اشرفیوں کی تھیلی دریا میں کیوں پھینک دی۔ وہ آپ کی ملکیت تھی اس لئے آپ کو اس کی وجہ سے اندیشہ نہیں پیدا ہونا چاہئے تھا۔

امام صاحبؒ نے فرمایا "بے شک وہ تھیلی میری ہی تھی۔ اور مجھ کو یقین تھا کہ وہ شخص اس کو اپنی ثابت نہیں کر سکتا تھا۔ مگر پھر بھی بعض آدمی مجھ پر بدگمان کرتے اور مجھ کو جھوٹا خیال کرتے۔ اس طرح میری کوئی حدیث اور روایت معتبر نہیں رہ سکتی تھی۔ پس میں نے دروغ گو مشہور ہونے کے مقابلہ میں مفلس ہونا زیادہ پسند کیا۔"

اس روایت سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سچ کی اہمیت کیا ہے اور جھوٹ سے کس قدر نقصان پہنچ سکتا ہے۔ جھوٹ تمام برائیوں کی جڑ ہے اور سچائی آدمی کو بہت سے گناہوں سے باز رکھتی ہے۔ جیسا کہ ذیل میں ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے۔

نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کے زمانۂ مبارک میں ایک شخص تین سخت گناہوں کا مرتکب ہوتا تھا۔ اوّل وہ چور تھا اور رہزنوں میں شامل ہو کر ڈاکہ ڈالتا اور قافلوں کو لوٹتا تھا۔ دوم شراب نوشی۔ افیون خواری اور قمار بازی وغیرہ افعالِ قبیحہ میں مبتلا تھا۔ اور سوم ہمیشہ جھوٹ بولتا تھا۔ عرصہ تک وہ ان معصیتوں میں گرفتار رہا۔

بالآخر اس کو ہدایت کا وقت آ گیا۔ اس نے اپنے عیوب کو محسوس کیا اور اپنی اصلاح کی طرف توجہ کی۔ لیکن مثل مشہور ہے کہ خصلت فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ اس کی عادتیں اس قدر پختہ ہو گئی تھیں کہ وہ ہر چند ان کو ترک کرنے کی کوشش کرتا تھا مگر ناکام رہتا تھا۔ ندامت کی وجہ سے وہ علماء و صلحاء کے پاس جاتے ہوئے بھی گھبراتا تھا۔

آخر وہ رات کے وقت پوشیدہ طور پر رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا تمام حال بے کم و کاست بیان کر دیا۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا "میں تمہارے نیک ارادے پر تم کو مبارکباد دیتا ہوں لیکن تمام بری عادتیں یک دم نہیں چھڑائی جا سکتیں۔ جس عمارت کو گرانے میں اس قدر عرصہ لگا اس کو از سرِ نو بنانے میں کتنی مدت درکار ہو گی۔ لہٰذا میں تم کو ایک سہل طریقہ بتاتا ہوں وہ یہ ہے کہ تم اپنی جملہ برائیوں میں سے ایک ایسی برائی منتخب کر لو جس کو تم سب سے زیادہ آسانی سے ترک کر سکو۔ اگر پہلی مرتبہ اس کو چھوڑنے میں ناکام رہو تو ہرگز نہ گھبراؤ بلکہ دوبارہ کوشش کرو۔ اگر اپنے ارادہ میں ثابت قدم اور مستعد رہو گے تو ضرور غالب آ جاؤ گے۔"

یہ سن کر اُس شخص کے دل میں طرح طرح کے خیال گزرنے لگے مثلاً اپنے دل میں کہنے لگا "مے خواری اور قزاقی کی بہ نسبت دروغگوئی کا ترک کرنا آسان ہے۔ اس کے لئے صرف تھوڑی قربانی کی ضرورت ہے۔ لیکن شراب اور چوری کو چھوڑنا بہت دشوار ہے۔ اور اس کے لئے مجھ کو اپنے نفس پر بہت قابو حاصل کرنا پڑے گا۔ میں شراب کا عادی ہوگیا ہوں۔ اس کے بغیر میرا کھانا ہضم نہیں ہوتا اور طبیعت افسردہ رہتی ہے۔ چوری کو چھوڑ دینے میں مجھ کو ملی نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔" میں پہلی صورت کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس میں مجھ کو کوئی قربانی نہیں کرنی پڑے گی کیوں کہ جھوٹ بولنا گناہ بے لذت ہے۔ میں رات دن بلا ضرورت بے شمار جھوٹ بولتا ہوں۔ اگر آئندہ نہ بولوں تو میرے کام میں کوئی حرج نہیں واقع ہوگا۔ بلکہ کچھ فائدہ ہی ہوگا۔ کیوں کہ مجھ کو کسی کے سامنے شرمندگی نہیں ہوگی اور سب لوگ مجھ پر اعتماد کریں گے۔ چنانچہ اُس نے بہت غور کے بعد سچ بولنے کی قسم کھائی۔

وہ آدمی راستگوئی کا وعدہ کر کے گھر آیا۔ جب اُس نے حسب عادت شراب کا پیالہ مُنہ سے لگایا تو اس کے ضمیر نے اس کو منع کیا۔ وہ اپنے دل میں خیال کرنے لگا۔ "میں رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ کے سامنے سچ بولنے کا حلف اُٹھا کر آیا ہوں۔ اگر وہ مجھ سے شراب کے متعلق کوئی سوال کرنے لگیں تو میں کیا جواب دوں گا۔ میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اُس وقت مجھ کو بہت پشیمانی ہوگی۔" ان خیالات سے متاثر ہو کر اُس نے شراب پینے سے توبہ کر لی۔

رہزنوں کے ساتھ مل کر لوٹ مار کرتے وقت بھی اس کے دل میں یہی گمان پیدا ہوا۔ جواب دہی سے ڈر کر وہ اس منحوس پیشہ سے بھی دست بردار ہوگیا اور مزدوری اور محنت و مشقت کر کے روزی کمانے لگا۔ پس ایک دروغ گوئی کی عادت ترک کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ ایک ایمان دار اور پرہیزگار آدمی بن گیا۔

# غزل

(از حافظ حسین صاحب رضاؔ)

شہیدِ عشق کو حاجت نہیں ہوتی چراغاں کی
لحد میں روشنی رہتی ہے شمعِ داغِ ہجراں کی

چلو مینا و ساغر لے کے توبہ توڑنے والو
بہار آئی گھٹا چھائی ہوا بدلی گلستاں کی

اب آگے دیکھیے جوشِ جنوں میرا اور کیا کیا ہو
بہار آتے ہی ہم نے دھجیاں کر دیں گریباں کی

ترا وحشی چمن میں گھوم کر اس شان سے نکلا
بجائے غنچہ و گل ہاتھ میں کلیاں تھیں داماں کی

کبھی بیمارِ غم اچھا نہ ہو گا چارہ سازوں سے
الٰہی دے رضاؔ کے درد کو تاثیر درماں کی

# نورِ ایمان

(از محمود واصل صاحب)

بیا تا گل بر افشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ نو در اندازیم

کبھی کبھی میں اپنے فرصت کے لمحات میں اس بات کو سوچا کرتا ہوں کہ دل میں جو ایک طرح کی بے چینی اور اضطراب ہے اس کو سکون و اطمینان کس طرح حاصل ہو سکتا ہے۔ اس قسم کا خیال ایک محشرِ آرزو کی تمہید ہوتا ہے۔ نہ پوچھئے کیا تمنائیں صد ہزار سامانِ دلفریبی کے ساتھ جاذب ہو جاتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر میں اپنی واقعی اور اصلی دنیا کو بہت ہی نامکمل اور ناقص سمجھنے لگتا ہوں۔ مجھے ہر طرف بدنمائی۔ بدسلیقگی اور بدذوقی نظر آنے لگتی ہے۔ موجودہ نظام کی ہزارہا خرابیاں بے ترتیبی کے ساتھ اُبھری ہوئی محسوس کرنے لگتا ہوں۔

میں کہتا ہوں کہ اس دنیا کو تو لوگوں نے بگاڑ ڈالا۔ اس کی رعنائیاں فنا کر دیں۔ اس کی مسرتیں مٹا دیں اور علوئیت برباد ہو گئی۔ یہ کیسی ذلیل و ناکارہ دنیا ہو گئی ہے۔ کیا اب اس میں انسان نہیں رہتے۔ کوئی دوسری مخلوق آباد ہو گئی ہے اور اگر انسان ہی آباد ہیں تو پھر یہ کیا بات ہے کہ ؎

دیکھنا رنگ اس کی محفل کا
ایک کو ایک کھائے جاتا ہے

ہمدردی۔ وابستگی۔ محبت۔ مودّت یہ سب عادتیں انسانیت کا طرۂ امتیاز ہیں۔ انھیں سے حُسن کی نیرنگیاں ہیں۔ ذوق کی بوقلمونیاں ہیں۔ لیکن جب یہی نہیں تو انسان و حیوان میں مابہ الامتیاز کوئی شئے نہیں۔ ایک طرف عسرت و افلاس ہے۔ تنگ دستی و مصیبت ہے۔ امراض و مصائب کا سامنا ہے۔ وفورِ رنج و یاس ہے۔ دوسری طرف عیش و عشرت کی بدمستیاں ہیں۔ جاہ و ثروت کی نخوت و پندار۔ دولت کی فضیلت و برتری۔ سرمایہ داری کا

جبر و حکومت۔ ایک جنبشِ نگاہ پر سو سو سجدے کرائے جاتے ہیں۔ عبد ہو کر معبود بنتے ہیں۔ ایک طرف گندگی و غلاظت۔ وحشت و بے تہذیبی کے چلتے پھرتے بھوت ہیں۔ دوسری طرف تہذیب و متانت سنجیدگی و شرافت کے فرشتے ہیں۔ ایک طرف حور و غلماں گل و ریحان۔ نغمۂ موسیقی۔ جوئے بار اور آبشار ہیں۔ دوسری طرف کیا کہئے کیا ہیں۔ زبان کو بیان کرتے شرم آتی ہے۔ قلم صفحۂ قرطاس پر لکھتے ہوئے لرزتا ہے۔ یہ آخر کیوں ہے۔ کیا خدا کا قانون یوں ہی ہے۔ جنگل کے سب ہرن ایک طرح کے ہیں۔ پپیہے سب پی کہاں کہتے ہیں۔ مور سب ایک انداز سے ناچتے ہیں۔ بلبلیں برابر نغمہ سنج ہوتی ہیں۔ کوئی تفریق و امتیاز نہیں کہتر و بہتر کا کوئی سوال نہیں۔ پھر کیا خدا کا قانون اپنے تمام مخلوق کے لئے یکساں نہیں ہے۔ فطرت کی منظر آفرینیاں کس قدر دل ربا ہیں۔ میرے بے قرار دل کو ان سے کیا کیا سکون نہیں پہنچا۔ معرفتِ کردگار کے کون کون سے راز ان سے منکشف نہیں ہوتے۔ لیکن مطالعۂ فطرتِ انسانی! یہ اچھے دین دار کو ملحد بنانے کو کافی ہیں۔ کیا انسان ہمیشہ سے ایسے ہی چلے آئے ہیں۔ کیا انسان ایسے ہی رہیں گے۔ کوئی چپکے سے کہتا ہے نہیں۔ اور سہ

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں<br>
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

an extremely able Introduction. This book which is entitled THE LEACOCK BOOK was published by Messrs. John Lane The Bodley Head Limited on August 22nd at 5 net.

---

To the generation of 1930 Frank Harris is already a legend. At 75 he sits on his balcony by the Mediterranean and remembers his youth. In the legend known to most of us he figures as the man of letters, the friend of Whistler, Wilde and other contemporaries, but before this he was a cowboy on the Western plains of America, whither he emigrated from Ireland the land of his birth On 22nd August Messrs. John Lane The Bodley Head Limited published Frank Harris's "ON THE TRAIL". In which he tells the story of his youthful experiences in the pioneer days of the seventies when men lived dangerously on the outskirts of civilisation, the days of the covered wagon and the buffalo.

Crown 8vo 7/6 net.

---

On August 22nd Messrs. John Lane The Bodley Head Limited published "THE PAVILION BY THE LAKE" by Arthur J. Rees, author of The Threshold of Fear", etc. The story revolves round a country house and a haunted and deserted pavilion James Altamount, 'the shipping master', finds the lifeless body of a man, whom he had befriended in London on the previous day, inside the pavilion And it is beside the pavilion on the following morning that Altamount himself is found dead with a bullet in his back. Who shot him and what became of the body of the unknown man? This dual problem rests in turn upon a third mystery—the disappearance of the famous historical miniature of Mary Queen of Scots which Altamount bought as a present for his wife, whose face resembles the Queen of the miniature. A certain analogy between the lives of the unhappy Queen and the woman who resembles her forms a mystery in keeping with the general design of the plot.

Crown 8vo 7/6 net.

---

*The Speaker at the Union.*—Sir, I want for my country political reform, I want social reform, I want economical reform, I want er-er—.

*Some one from the Back-benches.*—You want chloroform.

* * * * *

*Speaker (who was constantly interrupted.)*—There seem to be too many fools here tonight. Would n't it be better to let one speak at a time.

*A voice.*—Then, carry on.

* * * * *

*Speaker.*—Gentlemen, did you ever stop to think. I ask you again, did you ever stop to think?

*Weary listener.*—Did you ever think to stop?

could see an eager crowd in room No. 14 where he very cheerfully related his adventures and experiences We wish Mr. Oudyn and other world wanderers every success in their adventurous mission.

The *After-vacations* lunch of the New Circle was held just *before-vacations* on 20th September at 1. 30 p. m. The Dining Hall was very tastefully decorated and the dishes were all delicious. Although the enthusiasm of the students was damped by the absence of Mr. A M. Kureishy (because of ill health), the function proved to be a complete success. Interesting after-lunch speeches were delivered by Messrs. SyedWali Mohamed, Syed Amin, and Mohd Shamim. Mr. Kadri, his colleagues, and the monitors of New Circle deserve congratulations.

Our University was visited in the end of September by Miss Sakina Karamat, an Indian-Muslim lady who has just returned from America after studying there for about ten years. She possesses distinctions in two different subjects namely Biology and Oratory. She took a degree in the former and a diploma in the latter. A meeting was arranged by the University Union in which she narrated her experiences and described at length the student life of America A similar function was arranged by our Union also and Miss Sakina delivered a very interesting speech relating to the student activities of America.

She has very kindly promised to contribute an article to our Magazine.

## LITERARY NOTES.

Messrs. John Lane The Bodley Head Limited have in preparation for early publication GLIDING AND SAIL-PLANING: "A Beginners Handbook" by F. Stamer and A. Lippisch, which is to be profusely illustrated. The motorless aeroplane, now known as the Glider or Sail-Plane, is rapidly growing in popularity especially since the visit of the German gliders, Herrn Kronfield and Magersuppe. This book by two experts, is the first complete handbook on the sport to be published in this country. It covers the whole ground-equipment and training, choice of ground, practice flying, clouds and winds, tools, construction and maintenance.

Mr. Ben Travers, unlike traditional humorists, is by no means a dismal man. Apart from his hobby of cricket, he went to Australia with the last Test Team and has spent most of this Summer with the Australian Team here, his happiest moments are spent in the library at his house at Burnham-on-Sea where it is at once noticed that the books nearest to hand are those of "Saki", Stephen Leacock, O. Henry and other authors of the same calibre. In spite of all his other work, he has during the last few years written no less than eight successful plays and five best-selling books, he has found time to edit a selection of Stephen Leacock's works to which he has written

# NEWS AND NOTES.

The Principal has been pleased to appoint the following office bearers for the session 1930—31 :—

| | |
|---|---|
| Student Personal Assistant to the Principal | ... Tahir Hasan Zoberi. |
| Games Secretary | ... Mirza Rafi Ahmad. |
| General Secretary, Tennis Club. | ... Masood Ali Tahir. |
| ***Secretaries:—*** | |
| Dramatic Society | ... Zahir Baber Kureshy. |
| Historical Society | ... Syed Muhammad. |
| Logic Society | ... Masood Ali Tahir. |
| Geographical Society | ... Nafis Ahmad. |
| Arabic Society | ... Akhtar Imam |
| Urdu Society | ... Akhtar Imam. |
| Literary Societies Reading Room | ... Meraj Ahmad Khan. |
| ***Captains:—*** | |
| Cricket Club | ... Mirza Rafi Ahmad. |
| Hockey Club | ... Sardar Abdul Aziz. |
| Foot Ball Club | ... Moinuddin Foosi. |
| Sports Club | ... Sardar Abdul Aziz |
| Volley Ball Club | ... Syed Mehdi Hassan. |
| Basket Ball Club | ... Sardar Abdul Aziz. |
| Kabaddi Club | ... Tahir Hussain Zoberi. |

We offer them our hearty congratulations and hope their respective institutions will prosper under the new regime.

---

Mr. Kh. Hamid Hasan, The Secretary, Service of Humanity Society, writes :—

"We the members of the 'Servants of Humanity Society' started our work on Sunday the 24th of August. We went to Chetar village which is situated some six miles from our hostel, where we helped about 80 patients and disinfacted 13 wells.

In this connection I must thank Dr. Butt and Dr. Feyyaz for their assistance in giving us medicines free."

### Tourists at Aligarh.

Aligarh, these days, seems to be very popular with the tourists.

Two Ceylonese youngmen who are touring round the world on Motor bicycles visited our University in the last week of August. Mr. Yusuf, the Dutch-Muslim Vice-Counsel of Jeddah, who is visiting India, came to Aligarh and stayed with Dr. Butt for a day. He was much impressed by the University and spoke highly of those he came into contact with. But the most interesting and adventurous of all was Mr. Arie Oudyn, a young Dutch tourist who started from Holland two years ago and so far has visited about twenty countries. He was staying here with Mr. Shameem in Marris Hostel and all day long one

weakened and becomes more susceptible to disease; (3) inflamed gums and cavaties in the teeth leave unprotected places at which germs may enter to produce diseases that it may take years to cure.

"One of the secrets of preserving good teeth is diet. Another, and just as importent, is proper care, in the form of burshing.

"Most people have no idea of the proper way to brush, believing that their enthusiasm makes up for their lack of skill. Others brush their teeth up and down.

"They are, too, wrong although they are closer to the truth. Here is one of the few proper ways to brush the teeth, and almost no one knows it.

"Brush your gums as well as your teeth, brush the upper gums and teeth downwards; brush the lower gums and teeth upward.

"Brush them this way at least twice a day, and preferably oftener; brushing on arising, after each meal and before going to bed is not excessive. Use a good grade of tooth powder, and tooth brush that is dry when you start—the bristles of a wet one are too soft, no matter how good the brush, to give you effective results. If this means owning more than one tooth brush, do not hesitate at the additional expense. You will find it well worth the results. In these simple ways early precautions may save many miseries in later life."

## Salt for the Teeth.

"There would be a considerable lessening of dental troubles," says a writer in 'The Statesman', "if more use were made of common salt, not of course, as a substitute for dentifrice but as an extra treatment. Many of us would give our teeth an occasional brush with salt if it were not for the trouble of going downstairs to get it. For which reasons a salt sprinkler should be found in a medicine chest in every bathroom. They may be bought in coloured glass or china, quite cheaply, and their bright hues do not look out of place. A shake of salt should be put on the tooth brush at intervals after usual tooth paste or powder has been used. The salt keeps gums hard and healthy and removes film from the teeth."

## Bites between meals.

What is the dominant scientific fact behind the doctor's objection to "bites" between meals?

Any doctor will tell you that if you are in the habit of whiling away the weary hours between one meal and another with the help of this, that, or the other dainty, according to your taste, and the extent of your purse, you are denying your stomach its necessary rest as surely as you are denying your brain rest if you try to do without sleep.

It is bad policy to treat the stomach as the maid-of-all-work of comic fiction used to be treated in the bad old days.

## Kabaddi.

Kabaddi Club, like the Tennis Club, was one of the first to start practice. Mr. Tahir deserves credit for not lagging behind even during the last month in spite of his being "on the shelf," added to malaria for which he had to be admitted as indoor patient to the University Hospital.

## The Day Scholars Club.

We have received a very illuminating report from the Secretary of the Day Scholars Club. It shows that even during the vacations their Reading Room and Indoor Games remained open for the use of the members. After the vacation Mr. Kahnur Rahman, the present Secretary was elected unanimously, Mr. A. Shah having resigned.

Three successful debate meetings and a *Bait-Bazi* contest have been held so far and the attendance has been quite fair.

Certainly the Day Scholars Club has set an example for other Societies and Clubs.

## Historical Society

A very interesting debate was held on Saturday the 6th of September when Mr. Nafis Ahmad proposed that "the policy of Mohamed Tughlaq was well meaning." Mr. Moinuddin led the opposition. The attendance was fair, in spite of general indisposition and several speeches were delivered. The President, Mr. Momnul Haque, at the end, with a short and learned speech enlightened the members. Mr. Mahamud deserves credit for this successful meeting.

# HEALTH NOTES.

## What about Teeth ?

Writing in the Youth's Companion a dentist says :

"Many times when I have stood beside youthful patients in my chair I have wished that there were some way in which I could make them understand the vital necessity of caring for their teeth while they still have such fine teeth to care for—some way of giving them the benefit of the unhappy experiences that so many older people have. For experience is a stern task—master. She teaches us ; but usually we learn the lesson too late to help us.

"There are few parts of the body which, with proper care, it is more easy to conserve than the teeth ; and there are few parts which are more foolishly and needlessly neglected.

"Every normal young person wants to excel in bodily power and mental fitness. Those who are really determined must learn one lesson early, and must learn it well. It is this—that the full measure of bodily perfection is impossible without a clean, healthy mouth and sound teeth. There are the three reasons: (1) aching teeth cause unnecessary nerve strains that prevent good work in School or after life ; (2) decayed teeth prevent the proper mastication and therefore perfect assimilation of food with the result that the body is often permanently

# OUR SOCIETIES AND CLUBS.

[We requested the Secretaries of the various Societies and Captains of the Clubs to keep us informed about their activities and functions. We are glad to note that the respond this time has been very encouraging. We give below a precis of what we have received in this connection. Our thanks to those who have complied with our request. Let us hope that others also will extend us the same courtesy—*Editor.*]

## The Dramatic Society.

The Secretary has kindly tried to make known to the students the Society programme for the next session. Some gentlemen interested in the Society have left Aligarh, but he hopes to make up the loss by the co-operation of other members. The President, Mr. Syed Wali Mohamed, is, the Secretary says always, very anxious to give as good an account of the work of the Society as they did last year. We endorse his remarks. Another drama will be staged in the near future. Mr. Zahir Babar Kureishy has not, however, found it possible to make a beginning in this behalf. Let him start now if he is anxious to see *The Journey's end.*

## The Geographical Society.

One meeting was held in August at Mr. Qadri's rooms and the advantages of "Double Line traffic" were discussed by him. Mr. Nafis Ahmad is very anxious to beat the record of his predecessors. We hope we will have more interesting and largely attended functions under the auspices of this Society.

## The Arabic Society.

Mr. Akhtar Imam, the secretary, read an essay on *Omarul Qais,* the greatest Arabic Poet. The Secretary has done well in setting an example for others but he should *infect* the members also with his enthusiasm.

## Tennis Club

The Club started net practice very early after the reopening of the College. The Secretary has reported that the students are taking very keen and active part in the game due to the vigilant interest of our new games Secretary, Mr. M. A. Butt. It is gratifying to learn that under the new arrangements matters have improved considerably. Mr. Masood should also receive credit for it.

## Hockey Club.

Mr. Sardar Abdul Aziz is again wearing 'several crowns.' He is Captaining Hockey, Basket Ball and Sports Clubs. Instead of writing notes on Clubs separately we should write about him. Regular practice at all the games and on all the fields is very encouraging in view of the health conditions of our hostels and general illness of members. He is cheerful and laughing and attracts all to the fields by his tact and energy.

## Cricket Club.

Mr. Rafi has, after getting the desired "lift" into the higher "region" taken to net practice seriously and regularly. He has not been able to arrange any interesting matches on the College field. Let us hope, ere long we will have one between the Staff and Students.

comply with my request. He has allowed me to publish the following brief account *of his travel and has been kind enough to* lend us the block of his photograph which is printed herewith.

Wishing to see the world he started from Rotterdom on the 23rd August, 1928 when he was only nineteen years old. He has traversed Belgium, France, Spain, Morroco, Algeria, Tunis, Italy, Greece, Turkey, Egypt, Palestine, Syria, Iraq and Persia and after touring India proposes to visit Australia, Dutch India, China, Japan, America and then return *home throuh England and Ireland.* Throughout Europe he walked on foot, with all his baggage on his back In all he did about 10,000 miles on foot In Persia he bought a push-bike and did a few thousand miles on it. While in India, because of the hot weather, he is going by train but in Australia, America and China he intends walking on foot.

He started from Holland deliberately without any money, determined to earn the necessary expenses as he went along. His only impediment is his hand camera with which he takes photos of interesting views enroute and sells them to cover the expenses of the road. Till now he has succeeded in this although he has been robbed several times.

In India he has visited Bombay, Delhi, Agra, Simla (where he met Mr. Shameem), Lahore, Rawalpindi, Jammu and has spent two months in Kashmere.

When he started from his home he knew only Dutch and German languages but on the way he has picked up English and French also and speaks them fluently. He can adopt himself to every climate and to the ways of every country. Wherever he goes he always takes the food of that country and always tries not to give any trouble to his hosts.

On being asked as to which people he liked most he replied, "Arabs and the natives of Morocco" He, nothwithstanding likes his own country very much, is always prepared to give a country the credit it deserves. He is always frank and does not give his judgment on any matter according to his audience

Mr. Oudyn has impressed very much the students of our College with his magnetic personality and wherever he goes our prayers go with him.

## PUZZLE

By S. Sibte Hasan

Oh! diligent boy come take your pen,
Take 9 from 6 and 11 from ten
From 40, 50 then substract,
You will get 6 exact.



Mr. Arie Frederick Oudyn,
Dutch World Tourist

old woman came forward and said, "Has Ghandhije sent these medicines?" When we were about to leave the village a woman came to us with her five years old daughter and stated the child was suffering from fever, Hamid opened the medicine chest and took out some pills to give her. But we could not help laughing when the fear-stricken child ran towards her mother to avoid the strangers.

After finishing our work in this village we returned as it was already about 1 p. m. While cycling towards our hostel we felt in our hearts great pleasure and it seemed as if we had won a fortress of glory, and laurels of fame and honour. Indeed the thing which had created such unsurpassed joy was the conquest of the citadel of duty.

This we had tried to conquer by serving humanity. It is beyond the power of my pen to describe even a part of the pleasure which we felt while sitting at our dining table. It can better be imagined than described.

We can realize the miseries of these ignorant and innocent poor Indian villagers. Surely they need our help. For this purpose we are going to organise a regular society to help our most needy countrymen. It is our ardent desire to make this Social Service League a success. To do this we require help and encouragement which we hope our fellow students will readily accord us.

## A WORLD WANDERER.

**By Ahmad Abbas.**

Globe trotters are a novelty at Aligarh so when I heard that a Dutch tourist was staying with Mr. Shameem at 14 Marris Hostel I naturally felt interested in him. On entering Mr. Shameem's room on the noon of Sunday the 28th August I found about half a dozen people sitting round a table. As there was only one fair coloured, brown eyed young man in khaki shirt and shorts whom I did not know I presumed he was the young tourist and greeted him. Mr. Shameem endorsed my presumption by introducing him as Mr. Arie Oudyn, the Dutch world-trotter.

That was the first time I met him. For a week that he stayed at Aligarh I had occasion to know him more intimately and found him a young man of a very charming personality. Daily one could see him narrating his adventures with great glee and beaming countenance to the students who gathered in his room to talk to him and to see his wonderful collection of stamps, photographs, picture post cards and views of the various countries that he has visited. But the most attractive was his big autograph book which contained the autographs and photographs of great men of about twenty countries and in as many languages.

For the benefit of the readers of our Magazine I questioned him about his adventures and he was always ready to

on a frequented road would be very dangerous. We informed the old man about the fatal diseases which are caused by such water and asked him to drop some "Lal dawa" in the well. On hearing this the old fellow gazed at us in vacant stupidity and asked, "Won't this 'dawa' stop the supply of fresh water in the well." We told him that it was simply meant to kill the germs in the water. One need not laugh on hearing such a funny question as there are hundreds of simple people in the countryside who are still more ignorant.

That old man also said that he had been suffering from fever, but could not get any medicine. We gave him four pills and after dropping sufficient quantity of potassium permanganate in the well resumed our march.

After covering two more miles we reached a place where a portion of the road was under repairs. We alighted and inquired whether any of the labourers were suffering from fever. They named one; who was given four pills by Hamid, but to our astonishment after two or three minutes hesitation a score of labourers surrounded us. All were asking for medicine, some were showing cuts and bruises and the others complaining of fever. Hamid and Rafi distributed pills while I, Gauhar and Malik painted iodine on their cuts and swellings. It was after a pretty long time when we left the labourers amidst showers of blessings.

On leaving behind the grateful labourers we caught sight of a village situated on the ruins of an old fort. This was the first village which we entered. The nearest buildings was that of a school where three or four persons were sitting. They stood up on seeing us approaching. We asked them if there was any disease [illegible]. They replied that there were three or four persons who were down with fever. We gave the patients four pills each with proper directions and dropped some potassium permanganate in the school well. The simple yet thankful villagers' praise for our beloved institution which gave us immense pleasure. The demand for medicine was growing so great that we were afraid lest our stock would run short in that very village. While we were leaving the village we saw a man who was running towards us. As soon as he reached us, he showed a swelling on his leg and begged us to give him medicine. I then painted iodine on his leg and the poor fellow went away thanking us in his simple yet grateful manner.

Leaving this village behind we started for a village, the mud huts of which were visible at a distance. To our utter astonishment when we entered the village it was after a lot of wandering that we could find two aged persons in the village 'Chanpal.' Every where females peeped out of doors to catch a glimpse at the strange visitors. Probably most of the men had gone out to work in their fields. We inquired about the general health of the village and were told that three persons were down with fever, and as usual we distributed pills among the patients and directed them so as to take suitable precautions for the prevention of common diseases. While we were busy with the patient an

# SERVING HUMANITY

**By Nafis Ahmad.**

No one can deny that it is the primary duty of a man to have regard and sympathy for his fellow beings and to serve those who are needy and helpless. This realisation in man will mould for him high moral qualification and thus the result will be a happy and honourable life in this world and a reward in the hereafter. Those who can spare time, money or energy for the cause of their ignorant brethren are the real patriots.

If one goes about with eyes open, he can see the image of miserable India all around. The Indians in general, and the villagers in particular are in a miserable plight. These simple, superstitious and ignorant masses are not better than dumb mute cattle. These poor villagers spend a life of complete isolation from the outside world plunged in an ocean of ignorance and can only be dragged out of it through the advancement in knowledge and the efforts of their cultured countrymen. Such kind of realisation had often tormented myself and consequently I was in search of a sure remedy.

On the 17th August, 1930, an ordinary meeting of the Marris Hostel Parliament was held in the Intermediate College Union Hall when Mr. Abrar Hossain Qadri emphasised the awakening of the students to the sense of their service to their countrymen. He asked the students to try to uplift the masses of India and thereby lessen their miseries.

The meeting was over at 9 a. m. and some of us went to his room. He told us that the future destiny of India will be in the hands of the students so we need practical training in the course of our educational career. Some one asked, "How can we help the masses." He replied that 80% of the population of India is rural hence the best way will be to help the poor villagers. He further told us that innumerable diseases pest the villages with the result that hundreds and thousands die for want of medicine and careful treatment. These words touched our hearts and produced a magical effect on us.

When we left him five of us decided to visit the neighbouring villages in order to distribute medicine as well as to give them instructions to lead a healthier life. Mr. Kh. Hamid Hassan hastened to the dispensary and brought a small bottle of Iodine, a bit of lint, potassium permanganate and 50 quinine pills, while the rest of us *i. e.* myself, Rafi, Gauhar and Malik dressed ourselves. It will not be out of place here to thank Dr. Butt for his willing and substantial and kind advice.

It was about 10 A. M. when all of us were cycling on the Aligarh Chattari road. We felt quite delighted as the weather was cloudy and there was before our eyes on either side a vast expanse of green grass. When we had gone about three miles we saw an old man sitting near a well. Feeling thirsty we stopped, but to our dismay found the water exteremely dirty and full of germs. Now it can be imagined that such a well

still dark and I was in unknown and wild surroundings where I heard only the high sounding cries of bisons and wolves which were coming down from the higher hills. To my great relief, I saw a rustic coming from the opposite direction and asked of him the way of the "Vatory Hill." He exclaimed, "O! ham nahi janta. (I know nothing of it). Thent I said, "The place from which people see the snows!" A smile flickered on his wrinkled face and coming near me he said, "O Saheb, this is not the way". Then I returned with him to the foot of the "Observatory Hill". He pointed out to me the way up, as the day had almost dawned. I thanked him and started running up. Just as I ran up to the top, the sun tinged the virgin breast of the snows with the first blushes. Before my wondering gaze lay unfolded the glorious range. Far as the eye would follow snowpeaks rose up one another like a milk-white tent upon a wide plain. The crimsoned snow covered the mouth of the dark caves and a delicate tint of rose shivered on the top of the hill.

The rays of the sun dyed it scarlet, purple and gold—the melting snow flowed in a golden stream, and as a blast of horn it echoed from hill to hill, so the colours were reflected from a hundred parts. The snow became more and more dazzling white and after a few hours it was too bright to look at

The next evening, again I went to enjoy the pleasing sight of the setting Sun. I was wonder struck to see that the snow had enveloped the earth like a shroud and the famous Kanchenjunga was deeply aglow. Blue and blue the Kanchenjunga looked, a haven of peace and calm, while the peaks all round glistened bright with the last radiance of the parting ray.

Like diamond they reflected the evening in all the colours of the rainbow

Enthralled, I looked upon the scene, charmed and speechless till darkness enshrouded it and the fairy land vanished in grey mists.

One cloudless morning when the city was yet asleep, I left Darjeeling. As long as I could see, I kept my eyes fixed upon the snows of Kanchenjunga, which I saw first glimmer with dawn, then turn crimson and scralet as day broke and finally dazzled till I had to turn my eyes away When I looked back a hill intervened and the glories of the snows paled forth.

Karamat concluded her speech and was thanked by Kh: Ahmad Abbas. In a neat little speech he thanked her on behalf of the members of the Union and hoped she would serve her country with zeal and credit.

"Her speech was really one", said Mr. Abbas, "which would be recorded in the history of the Union as one of the finest pieces of oratory."

---

## A GLIMPSE OF THE SNOWS.

**By S. M. Shamsul Huda.**

It was last summer that I had my first glimpse into the mystery of the "everlasting snows." The world shone forth in life and beauty in the merry month of May, the birds reeled under the divine madness of melody, and "the soft wind did gently kiss the trees."

The hills burst forth before my wondering gaze as the day was dawning. The East was aglow with the radiance of the rising Sun and the saffron clouds cast a scarlet shade over the whole world. The hills loomed large in the horizon and the dark, sombre, water-laden clouds were scattered against the calm morning sky. The path by and by winded in and out of the primeval *Sal* forest. On both sides of the narrow road stood huge *Sal* trees like sentinels guarding the eternal secret and silence of the hills. A brook in the distance, listlessly murmurred on the red earth of a maze of fallen '*Sal* leaves that were strewn thick upon the ground like a soft carpet.

On reaching Darjeeling in the afternoon, I eagerly turned to the north in order to satisfy my curiosity.

Next morning I woke up very early to see the sun rising upon the snowpeak. To my great joy the sky was serene and blue as the bosom of the calm deep. It was yet dark and the deserted streets were lighted by dim street-lamps. I got up, dressed, and went out into the cold from the friendly shelter of the house. Now, a difficulty faced me. I had come to Darjeeling for the first time, and was not familiar with the place. So I did not know the way to the *Observatory Hills*, from where the best view of Darjeeling can be had. Trusting to my sense of direction, I started and came to the foot of the Observatory Hill, near the old Post Office. But I could not find the way to the top, nor did I know that the hill in front of me was the 'Observatory Hill.' So like a moth I went round and round it. Then, I asked the Nepalese sentry at the Governor's House to show me the way. He pointed out to me the road to 'Victoria Park.' I started according to his direction and after going for a good long distance I found that the scene was growing more and more wild and houses were becoming scarce. It was

The debate began at about 9 p. m. and the hall was fairly full. After the usual ceremonies, the Chairman called upon Mr. Hafeezur Rahman, Editor of *The Aligarh Mail* to move the proposition. He made a lengthy speech (most part of which was a lengthy statement of Mr. Jinnah which he quoted) exhorting the Muslims not to join hands with the Congress.

The opposition was led by Mr. Syed Aftab Ahmad, a University student. His arguments were forceful but his voice was not loud enough to reach beyond the front benches.

After the proposition was duly proposed and opposed, Kh. Ahmad Abbas came to speak on the opposite side. Judging by his former speeches we expected a trenchent speech from him but unfortunately he was subjected to such a hooting that only a speaker of his experience could stand it. But he stood it cheerfully and inspite of the continuous interruption did not retire till he had said all he had to say. Is it not rather hard to treat old speakers like this for wearing a [illegible] cap

He was followed by a dozen speakers most of whom spoke for the motion. Only a few good speeches were delivered and generally the quality of the speeches was very poor. But a remarkable speech was that of Mr. Mahamud who made his first appearance on the dais. He spoke in support of the proposition and his criticism of the leader of the opposition was very [illegible]. He deserves our congratulations for his brilliant speech and it is to be hoped that he will prove to be one of the best speakers of our College.

Late after midnight when there was no speaker forthcoming, the Hon'ble proposer was called upon to give his rejoinder. As it was already very late he made a very short speech and refuted some of the arguments brought forward by his opponents.

The motion was put to vote and carried

## IV

Of all the meetings of the Union held in this term the most interesting was that addressed by Miss Sakina Karamat who has recently returned from America after completing her education there. The meeting was held on the 23rd at 8. 30 p. m. The hall was packed even before 8 o'clock and Miss Karamat entered the hall with the ministry amidst deafening cheers.

After an introductory speech the Vice-President requested Miss Karamat to address the house. She began her speech very beautifully saying that of all the countries she had visited she liked and loved her motherland the best. In a very interesting and humourous way she described the college life of America and compared their activities with ours. She quoted some very interesting and humorous instances and thus kept the house amused to the last.

After answering a few questions from students about America, Miss

The opposition was led by Mr. Shams-ul Islam Siddiqi. He said at the very outset that he was opposing the motion against his conviction. As he explained there was no gentleman coming forward to oppose the motion and the proposer had requested him personally to lead the opposition. After explaining his position he compared the Simon Report with the Nehru Report and went on to say that the latter was better than the former. He talked about the advisability of India's participation in the Round Table Conference. However, he failed to make out a case for himself. He made a lengthy speech and retired when some impatient members requested him to do so.

Now the subject was thrown open for discussion and about a dozen gentlemen took part in the debate.

Only one of them opposed the subject. He contended that India was not fit for Dominion Status—nay even Federal constitution. He laid great stress on Hindu-Muslim disunity and India's illiteracy and ignorance. "What Simon Report has recommended for us is more than we desevered," he remarked, "and it would be suicidal on our part to reject it."

But the most interesting and learned speech was that of Mr. Abrar Husain Kadri. He spoke for the proposition in a very calm and charming way and carried the whole house by his sound arguments.

After Mr. Kadri had spoken Kh. Ahmad Abbas made a neat little speech. He related to the House how completely the Simon Seven had been ignorant of India's aspirations because of their having been boycotted throughout. He compared Sir J. Simon with a man who was searching blind folded in a dark room for a black hat, which was not there. I advise him to be less passionate, for we do not want to see him in the Guest House of His Majesty.

After two or more speeches the Hon. proposer was called upon to give his rejoinder which he did in a few minutes. He refuted the arguments of his opponents.

The proposition was put to vote and declared passed *nem con*.

The meeting adjourned at about 11-30 p. m. It was gratifying to note that there were fewer interruptions in this debate than in the former one, though at a time when the Hon'ble Vice-President was hooted at it seemed as if the House had gone off its head.

The new speakers made better speeches this time and it is to be hoped that if they are not discouraged they will turn out to be very good speakers. However, I must advise them in Principal Kureishy's words that, "No body will listen to you, unless you have something to say."

## III

A debate meeting of the Union was held on Saturday, the 23rd of August, 1930, to discuss that, "In the best interests of Indian Muslims they should not take part in the present political movement."

was very glad to find the members so jealous of their traditions and uniform.

He dwelt upon at length and described the atrocities perpetrated by the British Government in suppressing the movement. The alleged martyrdom of the innocent citizens of Peshawar, the promulgation of Martial Law in Sholapur and similar incidents were very frankly and forcibly described before the house. On a couple of occasions, the word "bloody" was objected to, perhaps rightly as being un-parliamentary. The anxiety of members in this behalf is commendable.

Then came the leader of the opposition Mr. Nafis Ahmed, who made his first appearance on the Union platform on this occasion. He recieved the reception usually reserved for new speakers, but he made a bold stand and carried on his speech though sometimes amidst uproarious scenes. He contended that the movement was not a national one and that the Musalmans have from the very beginning kept aloof from it.

This occasion gave one the opportunity of indulging in 'char char candy.' One gentleman came to the dais clad in a Roman turban and a short coat who preached the doctrines of Bhagat Singh and Dutt. Another gentleman clothed in a silk suit, shocked the audience by speaking *for* the proposition. He appeared on the dais as if he regarded it as an "Art Saloon" and was posing for an artist. From the very beginning his voice was drowned in hilarious uproars and I, from the gallery, could hardly catch his words.

Eventually came the rejoinder in which the proposer refuted the arguments of the side opposite. He gave a good account of himself.

The rejoinder was interrupted by a series of points of order from [illegible] who would have done well had he come forward on the dais to oppose the proposition. At times his points of order were neat little speeches.

The debate came to an end rather late in the night the proposition having been put to vote and *carried* by an overwhelming majority.

## II

The second debate came off on Sunday, the 17th of August, 1930.

The house was fairly packed and even in the gallery I had many a neighbour. Although the notified time was 8-30 p. m. yet the ministry did not appear till about nine. "Better late than never."

After the usual confirmation of the minutes of the last meeting the proposer, Mr. Aftab Ali Khan was called upon to speak. The subject, "the Simon Report is detrimental to our aspirations," was in the first place out of date and secondly very poorly worded.

In a fairly lengthy speech, however, he made out a case for himself and to a great extent succeeded in establishing that the Simon Report is detrimental to our aspirations. In fact, every one had the same view even without listening to him.

He knows the traditions of the Union well. Had he not used the word 'die-hard' too many times, and not pronounced *is* as '*ees*' his speech would have been a complete success.

# FROM THE GALLERY

**By Critics.**

**[Under this caption we will publish critical reports of the meetings of the Union. The criticism is constructive. We hope no one will feel offended. It might, on the contrary help some to improve Ed.]**

## I

The first debate of the session and incidentally of the new ministry was held in the Marris Union Hall on Sunday, the 3rd of August under an atmosphere that was mixed not only with political enthusiasm but perhaps with a desire on the part of some of the students to discourage and dishearten the new comers to the dais.

In my opinion, the freshers are in no way responsible for the creation of such an atmosphere. they are quite unaware of the traditions prevailing here. It is the duty of the "*seniors*" to see that all bad and unwanted traditions are extirpated once for all, lest they should corrupt the innocent minds of the new members.

It is high time now that the gravity of the situation is realised; we should remember that the time is not far when the destinies of our country would be in the hands of the coming generation. The fact cannot be denied that many youths are born with a desire to shine on the platform and become orators; they simply look forward for a chance and anticipate some sort of encouragement from the world itself. Oh! what a calamity it would be, if it were realised that the spirits and enthusiam of how many is damped by the incessant hooting and quite unprovoked hissing of some irresponsible members, who have no desire to come on the dias themselves and perhaps cannot tolerate others outshining them. Of course, people may, if required be hooted down and hissed at, but there is a limit to everything. When a thing is carried too far, it becomes not only boring and troublesome but also a sort of nuisance.

Aligarh has long been famous for its production of fine orators; but I am afraid, if such sort of persistent and incessant hooting is carried on, the time is not far when the reputation of Aligarh in this respect would be at a terrible stake.

It is ardently hoped that students would, in future, exercise their best of discretion and refrain from all such efforts at hooting and hissing, likely to result in the discouragement of new speakers.

Now, to come to this particular meeting: The Union Hall was practically packed up, perhaps, partly due to the fact that the debate was the first of the session and partly due to the fact that the subject was very interesting, namely that, "This house does not approve of the policy pursued by the Government in suppressing the national movement."

The proposer was our young and budding orator, Mr. Ahmad Abbas, who was clad in white khaddar and a "*little white rabbit-cap*," (according to Miss Mayo) which fact led to a shower or rather a bombardment of points of order to the effect that the hon'ble proposer was not in the proper uniform. I

In short, climate controls the activities of human beings and as a matter of fact every portion of the earth lends its peculiar qualities to nations and races that dwell upon it. It influences the life of man in the greatest possible degree

---

## THE TAJ.

**By M. Imdad Hossain**

Two men are there. I say not were - but are,
Each has his life bright as a shining star
*One** wrote his Paradise on paper white,
The *Other*† did build it in marble bright.
That one is seen through fancy's half shut eyes.
But this on earth is real paradise
Come Milton, come, and realize the dream,
Here lies the royal faithful lovers two,
Both of them to each other wonderous true,
Oh dewy silky, soft, oh milky white,
Oh gentle, tender, lovely creamy sight,
Faint not my ravished heart, oh let me gaze,
And give me time, this bride of tombs to praise,
What ! bride of tombs, Nay fairy queen of brides.
Surrounded by soft glories on all sides.
Such loveliness, majestic, calm, sublime,
Words cannot paint at least in my poor rhyme.

---

*Milton the English Poet
†Emperor Shahjehan.

determines the life of the people, as the inhabitants of Massowah practically need no clothing while those of Verkhoyansk are compelled to wrap themselves in thick furs and skins. The life of one becomes a burden to himself owing to the extreme cold while that of the other on account of oppressive heat.

The people of temperate zones are bold, energetic and sturdy while those of the tropics become lazy and weak in body. Thus in temperate lands like England a man can work for hours together without any trace of weariness, but in tropical lands. like India in the hot season, a man can never work for a long time, as from excessive heat we get laziness. Hence climate is undoubtedly a factor, which determines the welfare of nations. The Yakuts of the Lena Valley are of the same stock as the Turks of Western Asia, but the rigorous and extremely cold climate of the Lena Valley has made the people less advanced and poverty stricken while the milder climate of Western Asia has helped the people of the same stock to become more cultured and prosperous.

When the people of one climatic region migrate to another, the climate is sure to play its part in influencing their life, energy and vigour. The sturdy and energetic nomads of Central Asia on account of settling in the Indo-Gangetic plains have become in course of centuries weak and ease-loving. Can now any body recognize the tall and mascular tribesman of Central Asia in the plains of Hindustan? Surely not. The question arises how is it so? The answer is a simple one. The hot climate of India only has brought about such a transformation.

The people of the tropics owing to the luxuriant vegetation and easy means of supporting life have little to do for their existence and thus become lazy. Those inhabiting the temperate regions have to struggle hard in order to support their lives and the climate is such that it induces man to work and creates in him vigour. It is only the people of temperate climate who are energetic strong and sturdy while those of tropical regions are in reality less energetic and are weak in body. It is of course this distinction that has enabled the people of colder countries to overpower and become the masters of those who live in hot countries. But again the expansion of such people is checked by climate, because it is nearly impossible for them to retain their former energy in a country the climate of which differs from that of their own native lands. Although of all organic beings man is one of the most capable of adopting himself to circumstances, yet the modern sciences and discoveries can help him little in conquering nature and thus there is no further possibility of successful settlement of the people of colder climates in tropical lands.

Accordingly many lands remain as yet without a sign of man, like Spitbergen, Tran Joshep lands and the Selvas of South America. The reason of this is that the climate of these regions is so rigorous that human life cannot be at all supported.

by a jack knife into the very centre of his wooden mantlepiece, then I begin to give myself virtuous airs. I have always held, too, that pistol-practice should distinctly be an open-air pastime, and when Holmes in one of his queer humours would sit in an arm-chair with his hair-trigger and a hundred Boxer cartridges, and proceed to adorn the opposite wall with a patriotic V. R. done in bullet pocks, I felt strongly that neither the atmosphere nor the appearance of our room was improved by it.

Sherlock Holmes made his de'but in the "Sign of Four," that was published between 1886 and 1887. Other works followed in quick succession under various titles, *e.g.*, "The Hound of the Baskervilles" "The Valley of Fear," "His adventures" and "The Case Book of Sherlock Holmes" etc., etc.

Before concluding let us again with a broken heart extend our farewell to Sir Arthur Conan Doyle, Sherlock Holmes and Dr. Watson.

# CLIMATIC INFLUENCE ON HUMAN LIFE

**By Nafis Ahmad**

The rotation and revolution of the earth combined with the fact that it is inclined at an angle of 23½° to its orbit, bring about the difference of climate in various parts of the world. Climate exercises a direct influence on human life and existence. The study of climate teaches us that it affects mankind in two ways. Firstly it produces a direct effect upon races and inhabitants of entire zones, it influences their constitution, their character and mental abilities. Secondly it produces an indirect effect by its influence on conditions necessary to life. This is due to the fact that the plants and animals, with which human beings stand in so much varied a relationship, which supply him with nourishment, clothing and shelter, which when domesticated and cultivated become most valuable and influential assistants and instruments for their development and culture, are also dependent upon climate.

The climate varies from the hottest to the coldest conditions and hence brings about a magical change in the life of men inhabiting various zones. Man has fought against nature as far as he can. Thus even the coldest and the hottest places on earth's surface are inhabited. Thus *Verkhoyansk* situated in the plains of Northern Siberia although being the coldest place in the world having 54°F. as mean temperature for January, is inhabited. In the same manner the hottest place *Massowah* situated in the Italian colony of Eritrea lying on the shores of the Red Sea in Africa, is peopled. But as a matter of fact the climate

The curious thing is, that many people in the world are thoroughly convinced that Sherlock Holmes is a living human being. Conan Doyle got letters asking for his autograph. He got letters addressed to his friend Watson and sometimes addressed to Sherlock Holmes himself to his Baker Street address ! He had even had ladies writing to say that they would be very glad to act as his house-keeper. One of them, when she heard that he had turned to the occupation of keeping bees, wrote saying that she was an expert at segregating the queen and that she was evidently predestined to be the house keeper of Sherlock Holmes.

Conan Doyle wrote a good deal more about Sherlock Holmes than he ever intended to do, but his hand was rather forced by kind friends who wanted to know more, and so it is that this monstrous growth has come out of what was really a comparitively small seed.

Conan Doyle had decided several times to bring the life of Sherlock Holmes to an end but every time his hopes were frustrated. Once, he succeeded, however, in a rather ingenious manner in getting rid of him. He brought him into conflict with his greatest opponent and rival, Professor Moriarty, which terminated in both of them falling down a precipice as a result of the final struggle in which each of the rivals had tried to overcome the other and thus extirpate him. When the death of Sherlock Holmes became known, it produced a general uproar of protest throughout the world, but Conan Doyle was adamant. After several years, however, he was persuaded by his friends to get him back to the world. He gave way and proved by his own methods that Sherlock Holmes was alive and had escaped death by sheer miracle but had preferred to keep his escape a secret, for he regarded his life to be in danger from the associates of the late Professor Moriarty who would have wreaked Vengeance on him. The ecstasy and joy of the whole world was unbounded when the "Return of Sherlock Holmes" was published.

Sherlock Holmes was an extraordinary man—as regards his character, as his mode of living as well as the following extract from one of the narratives of Watson will show

"An anomaly which often struck me in the character of my friend, Sherlock Holmes was that, though in his methods of thought he was the neatest and most methodical of mankind and although also he affected a certain quiet primness of dress, he was nonetheless in his personal habits one of the most untidy men that ever drove a fellow lodger to distraction. Not that I am in the least conventional in that respect myself. The rough and tumble work in Afghanistan, coming on the top of natural Bohemianism of disposition, has made me rather more lax than befits a medical man. But with me there is a limit, and when I find a man who keeps his cigars in the coal scuttle, his tobacco in the toe end of a Persian Slipper, and his un-answered correspondence transfixed

# SIR ARTHUR CONAN DOYLE
## and
# SHERLOCK HOLMES

By Meraj Ahmad Khan

The world has been shocked to learn of the sad news of the demise of Sir Arthur Conan Doyle, the famous spiritualist and the creator of Sherlock Holmes and his rather stupid friend Dr. Watson. In him the world has lost the man who had for years gratified the desires of those who had a craving and longing for things and actions mysterious. Alas! with his departure the world has been compelled to bid "adieu" to Sherlock Holmes and "Dear Watson" as well.

It is difficult to discuss his spiritual and psychic experiences, which task is abandoned to some other occasion. For the present, I confine myself to narrating the events that led to the creation of that wonderful personality, Sherlock Holmes.

The adventures of Sherlock Holmes are of world wide interest and the names of Sherlock Holmes and Dr. Watson are practically household words even in ordinary literary circles. Many of his stories have been translated into a number of languages, including Urdu as well.

The creation of Sherlock Holmes came about in this way, that Conan Doyle was a young doctor at the time, and had of course, a scientific training and he used occasionally to read detective stories. It annoyed him how in the old fashioned detective stories the detective always seemed to get at his results either by some sort of lucky chance or else it was quite unexplained how he got there. He got there but he never gave an explanation. That did not seem to Conan Doyle quite playing the game. It seemed to him that he was bound to give the reasons how he came to his conclusions. At once, he began to think of turning scientific methods, as it were, into the work of detection, and he used as a student to have [illegible] Professor who was extremely quick at [illegible]. He would look at a patient and he would not allow the patient to open his mouth, but he would make his diagnosis of the disease, also very often of the patient's nationality, occupation and other points entirely by his power of observation. So naturally he thought to himself that if a Scientific man like Bell his Professor were to come into the detective business he would set the thing by building it up scientifically. Having once conceived that line of thought, he had a new idea of the detective and one which it interested him to work out. He thought of a hundred little touches by which he could build up his conclusions, and he began to write stories on those lines. At first they attracted little attention, but after a time when he began to write short ventures coming out months after months in the Strand Magazine people began to recognise that it was different from the old detective, that there was something there which was new. They began to purchase the Magazine and it prospered, so also did Conan Doyle. They both came along together and from that time Sherlock Holmes fairly took root.

We are, however, conscious of the fact that the success of a magazine depends on the interest of its student members and contributors, quality and standard of its output and its regular and punctual publication and not on the *weight or volume* of paper only. We should be judged on our merits and not on the basis of prepossessions or expediency.

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

a monitor should not be callous, when inflicting a heavy fine on a fellow student.

Serious offences of course, cannot be dealt with by the monitors. Ordinary infringements of the rules can be punished by light fines. If these can be scheduled, proper checks can be put on the reckless exercise of human discretion. Mature people often feel some difficulty in the imposition of fines. Young monitors must, therefore, feel greater inability in doing so. We request the Principal to rescue the parents from this financial drain.

* * *

The Intermediate College, has not yet, like Turkey, become the *Sick man* of our University. Fair and unfair criticism, however, is being directed against it from certain quarters. We do not mind the former and are even prepared to tolerate the latter if it is made in good taste. But we were very sorry to learn that some of our *elder brothers* actually went and advised a guest, who was to address the students of our College, not to lecture to us as our Union is very rowdy. Obviously every student of our College resented this very much. We were very glad to note that when that guest very kindly delivered a lecture in our Union, we set an example of good behaviour, even for our *elders*. We expect them to realize their responsibility and in future, instead of instigating our guests, advise us and teach us a few lessons in manners and good behaviour if they can.

The attitude adopted by them in persistently ignoring the student office-bearers of our College in connection with social fuctions is equally objectionable, but we fall shy of writing about such trifling matters. We wish and pray that better understanding should prevail between the "*Elders*" and the "*Youngsters*."

* * *

According to the new system of examinations introduced in our College, promotion of students to the next higher class, will henceforth depend on the combined results of four quarterly examinations and not on that of the Annual examination only. We welcome this scheme not only theoretically but practically also. In the appointment of the next Editors we would give due weight to the merit and number of articles contributed. Let the competitors from now "flood" the Magazine with their exquisite contributions.

We notify it in time for all those who can avail of the opportunity.

* * *

We have been told that the Magazine is getting "*thinner*." We wonder if our critics realize if not appreciate our difficulties. It is not the lack of articles but the lack of funds that is responsible for it. There has occurred a considerable fall in our income due to a fall in the number of students and we do not propose to run into debt to please our critics.

# EDITORIAL

We publish elsewhere reports about the 'Social Service League' started by the students of the Morris Hostel under the supervision of its Tutor—Mr. Abrar Husain Kadri. The Members (including non-resident students also) visit the adjoining villages and distribute medicines free to the villagers, disinfect their wells and enlighten them about health, hygiene and sanitation. Kh. Hamid Hassan—the enthusiastic secretary informs us that so far they have visited these villages about half a dozen times as a result of which, village health conditions and sanitation have distinctly improved.

We congratulate the organizers of this movement for their humanitarian work and trust, that, in due course, it would become a permanent feature of our College life. But might we not request them to make it an *all-college* institution instead of restricting it to one hostel only and thus afford an opportunity for all the students of the college to serve the cause of village up lift ?

* * *

We have been lately recieving complaints against the Proctorial Monitors. Allegations have been made that respectable students are treated very badly by them ; that the students are fined for not being in the proper uniform by monitors who do not honour or conform to uniform rules themselves On the top of it comes the report that fines on Inter. College students alone, during the last few months, amount to about Rs. 3,000.

Unless we are quite sure that these complaints are justified, it would be below journalistic dignity to make any definite observations. The matter, however, calls for notice in passing. "As Police is needed" in the words of a former Editor of the University Magazine, "to maintain order in the country so is the proctorial department of the University expected to maintain law and order in the University." We only wish our Proctorial Monitors to play the role of "*educated*" Police They are expected to set an example in following the rules which they want others to follow. Conscientious public servants—and proctorial monitors are nothing more nothing less—never get offended if they do not get proper form of salutation.

They should, above every thing else, learn how to obey without which they cannot know how to command. One can hardly congratulate them for exercising their authority in a place which does not fall within their jurisdiction. Abuse of authority leads to unpleasantness and unhappy results. Politeness and courtesy are the ornaments of a gentleman and the Proctorial *Badge* does not mean a negation of them. Let our University *Police* be jealous of the honour of their *Badge*.

We suggest to the monitors to exercise their authority sympathetically and would advise the students to show keen sense of discipline in obeying the College rules. Fines, however, hit the parents hard and

# OBITUARY

The University had hardly recovered from the loss of its ex-Chancellor, that, it received another shock by the untimely death of H. H. the late Nawab of Rampore. He was one of the Rectors of the University and took great interest in its welfare. He had, for a long time, identified himself with the Aligarh movement and served its cause and institutions with zeal and munificence. Very few Rulers of States combined in them, as he did, rare administrative qualities with literary taste and genuine appreciation of Art. In him the community has lost a generous and selfless leader and his State a wideawake and enlightened Ruler. We publish in this issue his life sketch and commend it to our readers.

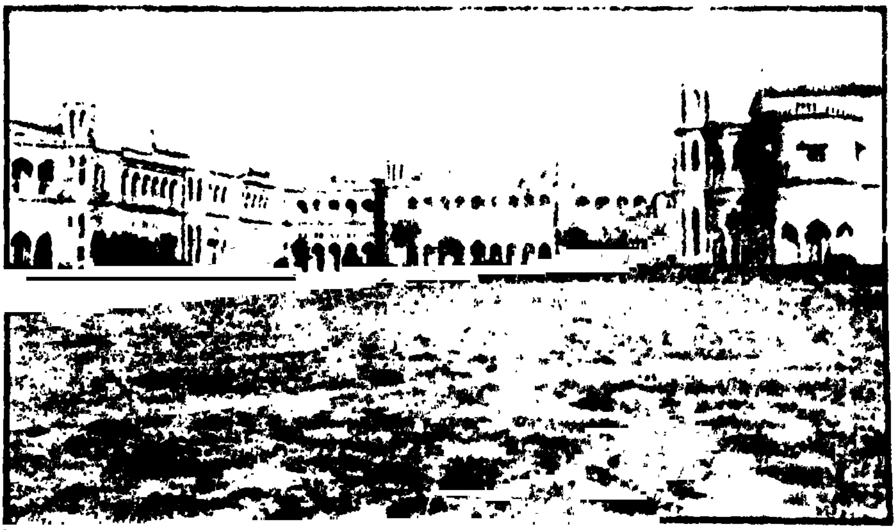
We offer heartfelt condolences to the Royal family of Rampore and pray that the soul departed may rest in eternal peace. Amin!

# M. U. Intermediate College Magazine

## OCTOBER, 1930.

## CONTENTS

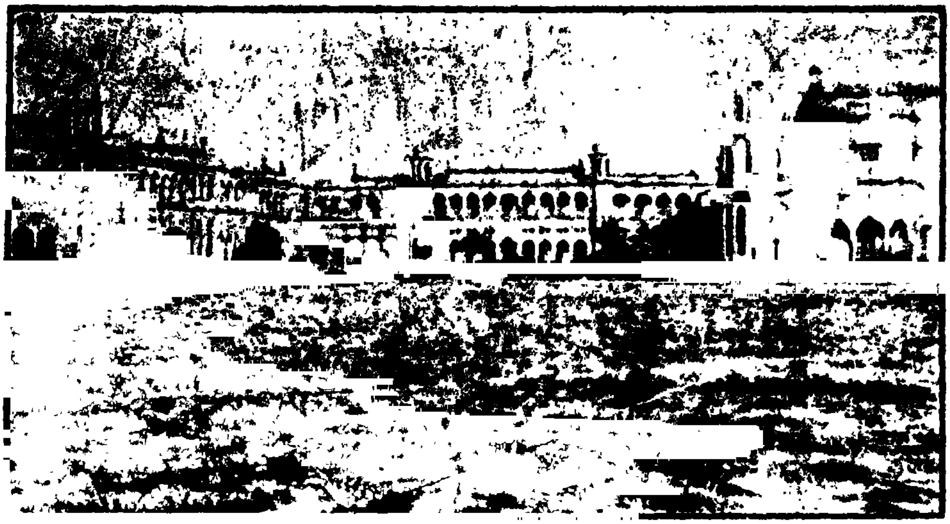
# The Intermediate College Magazine



M. U. INTERMEDIATE COLLEGE, ALIGARH

Vol. 2. | OCTOBER 1930 | No. 10.

ALIGARH
MUSLIM UNIVERSITY PRESS



مسلم یونیورسٹی انٹرمیڈیٹ کالج علی گڑھ

# انٹرمیڈیٹ کالج میگزین

## علی گڑھ


جلد (۲) | بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۰ء | شمارہ (۱۲)

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ۱۳۴۹ھ ۱۹۳۰ء طبع ہوا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# انٹرمیڈیٹ کالج میگزین


نگراں - عبدالعزیز صاحب پھلوری
ایم اے ایل ایل بی

مدیر
حکیم ماجد حامدی

جلد (۲) | بابت ماہ دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء | نمبر (۱۲)


## فہرست مضامین

# نذرِ عقیدت

یہ معلوم کر کے کہ تمام مسلمانانِ ہند اور خصوصاً جامعہ علی گڑھ کے مرکز توقعات ہندوستان کی مہتم بالشان ریاست کے فرمانروائے ستودہ صفات، دودمانِ عم مصطفوی کے نامور اور نازشِ سلف یادگار، عاصمۂ اسلام بہاولپور کے جواں بخت و جواں طالع تاجدار اعلیٰ حضرت ہز ہائنس نواب سر صادق محمد خاں بہادر دام اجلالہ و ملکہ اپنے قدوم سعادت لزوم سے بتاریخ ۳ر دسمبر ۱۹۳۳ء ہمارے جامعہ کی سرزمین کو آسمان بنائیں گے اور علی الخصوص کالج یونین میں شرکت فرما کر اس کی عزت بڑھائیں گے۔ ہماری درس گاہ اپنی خوش بختی و فرخندہ طالعی پر جس قدر بھی ناز کرے کم ہے۔ اس مبارک موقع پر ہم بھی کالج کی جانب سے خدام درگاہِ فلک اشتباہ کی خدمتِ عالی میں خیر مقدم کی نذرِ عقیدت پیش کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔

کلاہِ گوشۂ دہقاں بہ آفتاب رسید
کہ سایہ بر سرش افگند چوں تو سلطانے

احقر مدیر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# انٹرمیڈیٹ کالج میگزین

نگران - عبدالعزیز صاحب پری
ایم اے۔ ایل ایل۔ بی

مدیر
حکیم ماجد حامدی

| نمبر (۱۲) | بابت ماہ دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء | جلد (۲) |
|---|---|---|

## شذرات

سنہ ۱۹۳۰ء بھی ختم ہو گیا - غالباً ہم یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ ہمارا میگزین اب اُس بلندی پر گامزن ہے جہاں پہونچ کر شاعر پکار اُٹھتا ہے ع

نہ ستایش کی تمنا نہ صلہ کی پروا

---

حقیقتاً ہماری اس "غیر معمولی" کامیابی کا راز اُن مہربان اور فرض شناس ہستیوں کی مستقل کرم فرمائیاں ہیں جو عرفِ عام میں "ہمارے اہل قلم بھائی" کہلاتی ہیں۔ اگر آج اُن کی طبیعتوں میں سے فرض شناسی اور استقلال کے عنصر یکسر مفقود کر دیئے جائیں تو یقین جانئے کہ میگزین سادہ اوراق کا ایک بے کار محض پلندہ رہ جائے گا اور بس

---

پیشِ نظر نمبر میں حضرت احسان ساقی صاحب کا مضمون "شام کا طریق تعلیم" متعلمین اور معلمین دونوں کے لئے

غور سے پڑھنے کے لائق ہے اور ہر طرح استفادہ کا باعث ہو سکتی ہے خصوصاً ان حضرات کے واسطے جو ایسے مقامات سے "بسلسلۂ حصولِ تعلیم" قاصد ہونے والے ہیں بہت سی مفید معلومات اپنے اندر رکھتا ہے۔

بالآخر حضرت "تنبیہ الغافلین" کی "جادو اثری" رنگ لا کر رہی اور میاں غلام احمد کہ مہینوں کے مسلسل تقاضوں پر بھی ٹس سے مس نہیں ہوئے اور ہنوز "آج" اور "کل" سے رشتۂ لب قائم کئے ہوئے تھے چند گھنٹوں کے اندر اندر کمرہ کے ایک گوشہ میں "غیر کاغذ، قلم، دوات" سے بے خبر نظر آنے لگے ہمیں مسرت ہے کہ سید اختر امام صاحب طاہر حسین صاحب بیری اور محمود اصل صاحب کے علاوہ چند اور اصحاب نے بھی میگزین کے لئے مستقل طور پر مضامین لکھنے کا وعدہ فرمایا ہے اور انشاء اللہ غلام احمد صاحب ان میں پیش پیش رہیں گے۔ موصوف کا مضمون "گپ" ایک مزاحیہ مضمون ہے جس میں ہماری روزمرہ زندگی کے ایک خاص پہلو کا خاص "رشیدانہ" رنگ میں دھندلا سا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ تاہم ——— گپ کا اعتبار کیا۔

حصۂ نظم میں حضرت جگر مراد آبادی اور قبلہ احسن مارہروی کی نظمیں "الف" سے لے کر "ی" تک پڑھنے کے لائق ہیں اور اردو تغزل کے کمال کا بہترین مرقع۔

مابعد میری نظم "اے گلاب کی کلی" ہے جو "حفیظانہ" طرز میں لکھی گئی ہے اور انگریزی نظم (To a Lonely Rose) سے ماخوذ ہے۔

———

۱۱ نومبر کو منٹو سرکل ڈائننگ ہال میں ایک "محض رسمی" لنچ ہوا جس میں تقریباً منٹو سرکل کی تمام آبادی مدعو تھی، حتیٰ کہ غریب ٹکمیوں تک کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ "چند اصحاب" کا خیال ہے کہ ضیافت ہر طرح کامیاب رہی ——— ممکن ہے۔ ہاں نشستوں کے انتظام کے ہم بھی معترف ہیں کہ زیادہ نہیں صرف دو چار "مہمان نما میزبانوں" کو جگہ نہ ملنے کے باعث ٹھنڈے ٹھنڈے کمروں کو واپس چلا جانا پڑا۔ سنا جاتا ہے کہ اس قسم کی چھوٹی موٹی ضیافتیں ہر مہینہ وقوع پذیر ہوا کریں گی۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ ہر کام سلیقہ مندی اور نفاست کے ساتھ عمل پذیر ہوگا۔

———

آخر کار ہماری "خبر" حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی اور "ہم سب" کے عجیب تذکرۂ کپتان صاحب کے عجیب الطبع تخیلات بتاریخ ۲۲ نومبر ایک عجیب النوع "مذاق" کی صورت میں بمقام "منٹو سرکل گراؤنڈ" ظہور پذیر ہوئے

اور ہماری آپکی اطلاع میں کہ ایسی حرکت کو "تھلا پیا کرنا" ہی کہیں گے۔ ایک "روپیہ" "کمن" سے فضا میں اٹھا دیا گیا اور "پہلے کھیلنے" کا فیصلہ قسمت کی طرف سے "اُن کے کھلاڑیوں" کے خلاف صادر ہوا۔ "ہمارے" کپتان سردار عبدالعزیز صاحب نے گیند پھینکنا شروع کی اور اسی طرح ہر بار پھینکتے رہے تاوقتیکہ کسی نے "اُوور" نہ کہدیا اور کھیلنے والا کھیلتا رہا یا محض "بلا" ہاتھ میں لئے کھڑا او نگتا رہا۔ دریں حالت کہ دوسرا ساتھی کھیلتا رہا۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ ہر دو کھلاڑیوں سے دونوں "حرکات" علی الترتیب سرزد ہوتی رہیں۔ تاوقتیکہ کسی نے "آؤٹ" نہ کہدیا۔ قریب ساڑھے بارہ بجے کھیل بغرض طعام بند کر دیا گیا اور پھر دو بجے سے شروع ہو کر تقریباً پانچ بجے تک جاری رہا۔ "کھلاڑیوں" میں سب سے زیادہ "دوڑیں" یا (Runs) اُن کے کپتان مرزا رفیع صاحب کے حصہ میں آئیں اور ہماری طرف والوں میں سہرا "بھائی" مہدی (والی بال کپتان) کے سر رہا۔ بہر کیف "جیت" ہماری ہی رہی۔

مابعد کھلاڑیوں اور دیگر مہمانوں کو "کرکیٹ کلب" کی طرف سے ایک شاندار پارٹی دی گئی جس میں پرنسپل صاحب نے بھی شرکت فرمائی اور یہ طے پایا کہ ماہ دسمبر کے پہلے ہفتے میں ایک "عالی شان" میچ مابین ممبرانِ اسٹاف و طلباء منعقد کیا جائے امید کی جاتی ہے کہ اس موقع پر جناب قریشی صاحب جملہ کھلاڑیوں کو ضیافت پر مدعو بھی کرینگے۔ ہمیں مسرت ہے کہ اس تقریب پر ہمارا فراموش کیا جانا کسی طرح قرینِ قیاس نہیں۔

اخیر میں ہم "اپنے" کپتان جناب سردار عبدالعزیز صاحب "منٹو ڈیوی" کی خدمت میں کہ کیا شاندار "فتح" پائی ہے ؎

کامیاب آئی از سرِ مقتل　　　خونِ اعدا بتو خدا ریزد
سرخروئی ترا مبارک باد　　　رحمتِ حق بتو ضیا ریزد

---

"ہدیۂ از منِ نیاز سرشت　　　خوش نصیبم اگر قبول افتد
اے کہ ہستی "کھلاڑیِ نادر"　　　ماجدا کاشکہ با حصول افتد

صمیمِ قلب سے "مبارک باد" پیش کرتے ہیں۔

بتاریخ ۹ نومبر انجمن خیابانِ اردو کی طرف سے ایک پُرلطف مشاعرہ زیرِ صدارت جناب حاذق صاحب نیرسس ہال میں منعقد ہوا۔ علاوہ شعراء کے حاضرین کی تعداد چار سو نفوس سے کسی طرح کم نہ تھی۔ جناب صدر ہی کے ارشاد پر معتمد اعزازی سید اختر امام صاحب نے گزشتہ جلسے کی روئداد پڑھکر سنائی۔ مابعد غزلیات شروع ہوئیں۔ شوق صاحب عارف صاحب شبیر صاحب اور جاں نثار حسین صاحب اختر کی غزلیات خوب رہیں۔ کالج کے طلبا میں بہترین غزل عمر علی صاحب مضطر کی قرار دی گئی اور انعامی تمغہ جس کا اعلان معتمد اعزازی کی طرف سے کیا جا چکا تھا۔ آپ کی نذر کر دیا گیا ہوگا ؎

(غزل)

دلِ بے صبر نے منت کشِ فریاد کیا  
خود بھی برباد ہوا مجھکو بھی برباد کیا

روز ایک تازہ ستم او ستم ایجاد کیا  
اس پہ یہ شکوہ کہ کیوں شکوۂ بیداد کیا

دی تسلی بھی مجھے ناحق مرے مستقبل نے  
آہ کس دن کے لئے شاد سے ناشاد کیا

نہ گئی نسبتِ ناکامیِ قسمت نہ گئی  
وہ مجھے بھول گیا میں نے جسے یاد کیا

عجب انداز ہیں غارت گرِ عالم تیرے  
تو نے جس دل میں کیا گھر اُسے برباد کیا

لے اُڑی جب مجھے رعنائیِ عکسِ فطرت  
غازۂ حسن رخِ گلشنِ ایجاد کیا

مجھے معلوم نہیں خود کو پکارا کہ انہیں  
بے خودی یہ تو بتا میں نے کسے یاد کیا

آہ ناکامیِ تقدیر یہی ہے شاید  
جب خزاں آئی تو صیاد نے آزاد کیا

تیرے وعدہ کی قسم تجھکو دعائیں دیگا  
کسی مایوسِ تمنا کا جو دل شاد کیا

میں تو ہر حال میں راضی بہ رضا رہتا ہوں  
آپ نے شاد کیا یا مجھے ناشاد کیا

دائمی جب کہ نہ تھی فصلِ بہارِ ہستی  
کیوں مجھے زیبِ دہِ گلشنِ ایجاد کیا

حاملِ غم تو نہیں بے حسیِ دل مضطرؔ  
آج کیوں کثرتِ غم نے مرا دل شاد کیا

---

موصوف نے دورانِ غزل میں ذرا ترنّم کی کوشش فرمائی تھی کہ کہیں اگلی صفوں میں کوئی "قدر شناس" تڑپ ہی جو گئے کہ :

"خوب مولانا! کیا کہنے ہیں گویا پُرانے ریکارڈ پر گھسی ہوئی سوئی چل رہی ہے"

ہم اختر صاحب سے سفارش کریں گے کہ کم از کم ایک تمغہ مضطر صاحب کے کمالِ موسیقی کی داد میں بھی ضرور دیا جانا چاہیئے۔

سب سے زیادہ داد وتحسین طاہر صاحب کی غزل نے حاصل کی۔ موصوف نے اپنے مخصوص "زہریانہ" انداز میں کہ وہ جو فرمایا تھا میاں حمید الدین محمود نے

"" تمسخرات" کے دریا بہا دیئے تو نے"

یا بقول کسے :ـ

پھڑک اٹھے جگر و دل ترے "اشاروں" سے
"جمالیات" کے دریا بہا دیئے تو نے

مگر ہم تو یوں ہی کہیں گے ؎

ظریفانہ کیا رنگ ہے واہ واہ
کچھ فرما کر "ہنساتے ہنساتے لوگوں" کے پیٹوں میں بل ڈلوا دیئے"

اختتام پر قبلہ احسن مارہروی اور جناب حاذق صاحب کی غزلیات ہوئیں جن کو انشاءاللہ آئندہ اشاعت میں پیش کیا جائے گا جلسہ جناب صدر کی تقریر کے بعد قریب ساڑھے بارہ بجے شب کے کمال کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔

---

ہمیں معلوم ہوا ہے کہ امسال "آل انڈیا مشاعرہ" کے موقع پر "بازارِ عکاظ" کے کسی معرکۃ الآرا شاعرانہ "مقابلہ" کی تمثیل پیش کی جائیگی۔ جس میں امرأ القیس اور اُس کے ہم عصر نزار جائے بیٹھے ہونگے اور ان کی زبان سے جو اشعار ادا ہونگے وہ انہیں مشاہیر کے عربی قصائد یا غزلیات کے منظوم اردو تراجم ہونگے۔

از پریذیڈنسی کالج میگزین

ہمیں مسرت ہے کہ ترجمے کا اہم کام ہمارے محترم بزرگ و رملک کے مشہور و معروف شاعر و ادیب قبلہ شاہ علی احسن صاحب مارہروی نے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ یقین ہے کہ "تمثیل" سالِ گذشتہ کی طرح ہر طرح کامیاب اور تاریخ ادب میں ایک نئے باب کے افتتاح کا باعث ثابت ہوگی۔

مدیر

---

بتاریخ ۲۰ نومبر ۲۷ء سوسائٹی کا ایک "غیر معمولی" جلسہ زیر صدارت جناب مولانا بدرالدین صاحب ایم۔ آر۔ اے۔ ایس۔ منعقد ہوا۔ عمران حسین صاحب متعلم جماعت دوازدہم اور سید اختر امام صاحب معتمد اعزازی انجمن ہذا نے اس موضوع پر کہ "انگریزی زبان اپنے ادبی کمالات میں عربی ادب کی مرہونِ منت ہے" دو مفید اور پُر از معلومات مقالے پڑھے۔ اخیر میں جنابِ صدر نے ایک مختصر تقریر فرمائی اور جلسہ بکمال کامیابی ختم ہوا

مدیر

# ملکِ شام کا طریقِ تعلیم

از

جناب محمد احسان سامی حقی صاحب

یہ بات اہل علم سے مخفی نہیں ہے کہ ہر ملک کی طرز معاشرت، اخلاق و عادات، رسم و رواج لباس و اثاث وغیرہ وغیرہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور جدا جدا ہوتے ہیں۔ اس اختلاف کے اسباب بعض دفعہ سیاسی و اقتصادی تمدنی و عمرانی حالات ہوتے ہیں اور کہیں آب و ہوا ماحول و جوار اس کا باعث ہوتے ہیں۔ اس بنا پر میں چاہتا ہوں کہ اپنے اس مضمون میں سیریا کی طرز تعلیم کا ایک مختصر خاکہ پیش کروں، اور امید کرتا ہوں کہ میرا یہ مضمون دلچسپی اور فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

چونکہ اس بحث کے متعدد فروع ہیں جن کی تفصیل بہت طویل ہے اس لیئے جہاں تک ممکن ہے میں ان تمام فروع پر علیحدہ علیحدہ بالاختصار بحث کرونگا۔

**سیریا کی قومی اور سرکاری زبان:** یاد رکھنا چاہیئے کہ دنیا میں کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی جب تک کہ اس قوم کی زبان زندہ نہ ہو اور زندہ ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس زبان میں (عربی زبان کی طرح اونٹ کے ۲۵۰ تلوار کے ۵۰۰ شیر کے ۰۰۰ ا کتّے کے ۰۰۰ ، اور شراب کے ۰۰۰ ا نام ہوں) بلکہ زندہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ ہر قوم اپنی زبان کو تمام علوم و فنون مختلف نو ایجادات و مخترعات ہر قسم کے آداب و افادات کی اصطلاحات پر حاوی بنانے کی کوشش کرے اور جب انسان اپنی زبان پر اچھی طرح حاوی ہو جاتا ہے یا حاوی ہونے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے لئے یہ بہت ضروری امر ہے کہ اپنے اسلاف کی موروثی کتابوں کا مطالعہ جاری رکھے۔ اس مطالعہ سے اگر انسان کے دل میں کسی قسم کا احساس یا دیگر کوئی فائدہ پیدا نہ بھی ہو تو کم از کم اسے اتنا معلوم ہوگا کہ پہلے کے نسبت اس کی قوم عروج پر ہے یا رو بہ تنزل اگر اس کی قوم تنزل کی حالت میں ہے تو میرا خیال ہے دنیا میں ایسا کوئی کم بخت اور بدنصیب نہیں ہوگا جو ذلت کو عزت پر اور محکومیت کو خودداری اور خود مختاری پر ترجیح دیتا ہو

اس لئے زبان کا سیکھنا اس کی سستی اور کوتاہی کے لئے ایک اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ اور اگر اس کی قوم عروج پہ ہے تو ایک ادنیٰ کا اس کو ضرور خیال ہوگا کہ اسلاف کی موروثی شان وشوکت مال و دولت کو ترقی دے یا کم از کم اس کی حفاظت کرے۔

یہ ساری باتیں انسان کو حاصل نہیں ہوسکتیں جب تک اپنی تاریخ اور لٹریچر پہ حاوی نہ ہو جو اس کے اسلاف کے ہاتھوں سے اور اس کی اپنی زبان میں لکھے گئے ہوں کیونکہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ دنیا میں کوئی قوم دوسری قوم کو اپنے آپ پر ترجیح دینا پسند نہیں کرتی خواہ وہ اس کی نسبت کتنی ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو اس لیئے ہمیشہ دوسری قوموں کے مصنفین کی یہی کوشش رہتی ہے کہ مخالف قوموں کے شان وشوکت ترقیات وفتوحات علوم وفنون پر کسی نہ کسی رنگ میں پانی پھیر یں اس لئے وہ بغیر نسخ وفسخ تحریف وتبدیل کوئی واقعہ پیش نہیں کرتے بلکہ بعض دفعہ غلو میں اس حد تک تجاوز کر جاتے ہیں کہ دوسری قوموں کے نامور بزرگوں کا نام ونشان عالم وجود سے مٹا دیتے ہیں کوئی کسر نہیں چھوڑتے چنانچہ اس امر کی بیشمار مثالیں ہیں مثلاً ہومر اور فردوسی سے کون واقف نہیں ہے ؟ مگر آجکل دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو ان نامور شخصیتوں سے منکر ہیں اور ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ دنیا میں نہ ہومر اور نہ فردوسی کے نام کا کوئی شخص گذرا ہے بلکہ یہ محض فرضی ہستیوں کے نام ہیں جن کا وجود صرف منسوب الیہم قوموں کی قوت واہمہ میں ہے۔

اس لئے قومیت کو قائم کرنے کے لئے اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ ہر قوم اپنی زبان کو زندہ رکھے کیونکہ بغیر زندہ زبان کسی جماعت پر قوم کا لفظ صادق نہیں آسکتا اور جب تک زبان زندہ نہ ہو اس وقت تک وہ قوم دوسری قوم کی زبان کی محتاج رہتی ہے اور اس کی ترقی دوسری قوموں کی ترقی پر منحصر رہتی ہے اور آہستہ آہستہ اس قوم کی قوتِ عقلی اور علمی کم ہوتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ آخر کار ہر لحاظ سے بالکل معطل ہوجاتی ہیں۔ اس لئے زبان کی ترقی قوم کی ترقی پر دلالت کرتی ہے۔

اس امر کو محسوس کرتے ہوئے شامیوں نے باوجودیکہ ابتک وہ بالکل خودمختار نہیں ہیں بلکہ فرانسیسی منڈیٹ کے ماتحت ہیں اپنی سرکاری زبان عربی رکھی ہے اور اصل مصر کی طرح کوشش کی ہے کہ دنیا میں نئی ایجادات کے لئے خاص اور فصیح العبارت نام رکھے جائیں اور وہ اس امر میں نہایت اچھی طرح کامیاب ہوئے ہیں اور آجکل سیریا میں

سائنس، جغرافیا، ریاضی، طب وجراحت کیمیا خانوں وغیرہ مضامیں سب کے سب عربی میں پڑھائے جاتے ہیں مگر اس امر کے باوجود انھوں نے دوسری زبانوں کو بالکل نہیں چھوڑا بلکہ ان کو اپنے سکولوں میں اور کالجوں میں منجملہ دوسرے مضامین کے نصاب میں داخل کر دیا ہے۔

بی۔ اے کا کورس:- مندرجۂ بالا بیان سے واضح ہو گیا ہوگا کہ سیریائی شامیوں کو وہ دقّت برداشت کرنا نہیں پڑتی جو ہندوستانیوں کو برداشت کرنا پڑتی ہے۔ کیونکہ وہاں طالبعلموں کو صرف علوم کی طرف توجہ کرنا پڑتی ہے برعکس اس کے ہندوستان میں طالبعلم اپنی زندگی سے ایک لمبا عرصہ غیر ملک کی زبان کے سیکھنے میں ضائع کرتے ہیں اور اس وجہ سے وہاں بی۔ اے کا کورس (۱۲) سال رکھا گیا ہے جو فی الحقیقت کافی اور وافی ہوتا ہے۔

ان ۱۲ جماعتوں کے پاس شدہ طلبا کو دبکا لوریا یعنی بچلر کی ڈگری دی جاتی ہے۔

سیریا کی یونیورسٹیاں:- سیریا میں علاوہ سرکاری یونیورسٹیوں کے امریکن فرانسیسی اور اٹلی کی یونیورسٹیاں بھی ہیں اور چونکہ یہ یونیورسٹیاں زیادہ تر عیسائیت کی تبلیغ کی غرض سے قائم کی گئی ہیں اس لئے ہر ایک یونیورسٹی نے اپنی اپنی زبان کو اپنے نصابِ تعلیم میں بطور اصلی تعلیمی زبان اور عربی کو بطور فرع کے مقرر کیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان یونیورسٹیوں میں اصلی زبان عربی نہیں ہوتی مگر اس امر میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ بعض یونیورسٹیوں نے عربی کی از حد خدمت کی ہے چنانچہ جب سیریا ترکی کا ایک حصہ تھا (یعنی گذشتہ جنگِ عظیم کے دوران میں) اور ان کی سرکاری اور قومی زبان ترکی زبان ہی تھی اس زمانہ میں بیروت کی امریکن یونیورسٹی کی تعلیمی زبان کے علاوہ عربی بھی پڑھائی جاتی تھی اور اگر یہ یونیورسٹی سیریا میں نہ ہوتی تو شاید ترکی حکومت کے جانے کے بعد ہمیں صحیح معنوں میں سیریا میں عربی جاننے والا سوائے معدودے چند اصحاب کے اور کوئی نہ ملتا مگر اس یونیورسٹی کے بعض فارغ التحصیل طلبا ادبِ عربی میں کمال پیدا کرکے ملک کی اس وقت نہایت عظیم الشان خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔

اگرچہ ہر ایک یونیورسٹی کا مطمحِ نظر دوسری یونیورسٹی سے بالکل مختلف ہے مگر ساری کی ساری ایک انتہائی نقطہ پر متحد ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ان کی ڈگریاں ایک دوسری میں مسلّم ہیں جیسا کہ ان تمام یونیورسٹیوں کی

ڈگریاں یورپ کی ہر یونیورسٹی میں مسلم ہیں۔

میں بتا چکا ہوں کہ بی سے کا کورس سرکاری کالجوں میں ۱۲ سال کا ہے مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس بارہ سال کے پاس کرنے کے بغیر نہ کوئی طالبعلم ڈاکٹری پڑھ سکتا ہے نہ وکالت نہ انجینیرنگ اور نہ کوئی اور چیز بلکہ ہر ایک کے لئے یہ لازمی امر ہے کہ ان بارہ کلاسوں کو پاس کرکے پھر جس فن یا علم کو لینا چاہتا ہے لے سکتا ہے۔

**ڈاکٹری کا کورس:** - یہ واضح رہے کہ سیریا میں سوائے اعلیٰ ڈاکٹری کے اور کسی قسم کی ڈاکٹری نہیں ہے یعنی جیسا کہ ہندوستان میں اسسٹنٹ سرجن ہیمیوپیتھک وغیرہ وغیرہ کے ڈاکٹر ہوتے ہیں وہاں بالکل نہیں ہوتے نیز وہاں حکمت اور عطاری کا دروازہ بالکل بند ہے۔ سیریا میں ڈاکٹر بننے کے لئے علاوہ سابق الذکر ۱۲ سال کے اور چھ سال ڈاکٹری پڑھنے میں خرچ کرنا پڑتے ہیں یعنی اٹھارہ سال کی محنت کے بعد طالبعلم ڈاکٹر ہو سکتا ہے۔

**ڈسپنسر یا کمپونڈر کا کورس:** - عام طور پر ہندوستان میں ناواقف لوگ کمپونڈر کا کام اتنا سمجھتے ہیں کہ نسخہ پڑھکر دوائی کے اجزا ملاکر نسخہ تیار کرتے ہیں لیکن سیریا میں کمپونڈر کو اپنے پیشہ اور فن کے لحاظ سے ڈاکٹر سے کم نہیں سمجھا جاتا ہے کیونکہ جیسا کہ ڈاکٹر کا تعلق زیادہ تر تشریح اور مرکبات کے ساتھ ہوتا ہے اسی طرح کمپونڈر کا تعلق نباتات اور مفردات کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ علم آسان نہیں ہے بلکہ ایک کثیر الفروع اور دماغ طلب علم ہے اس لئے سیریا کی گورنمنٹ نے آج سے نہیں بلکہ عرصہ دراز سے اس فن کی طرف توجہ کرکے اس کو اعلیٰ درجہ تک پہنچا دیا اور اس کے لئے ڈاکٹری سے علیحدہ ایک شعبہ قائم کیا جس کا کورس ان بارہ سالوں کے بعد پانچ سال ہوتا ہے۔ اس بات سے ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ سیریا کی گورنمنٹ نے اس پیشہ کو کتنی اہمیت دے رکھی ہے اور کس حد تک اس کی عزت و احترام قائم کرنے کے لئے کوشش کی ہے۔

اگرچہ کمپونڈر ہر لحاظ سے تقریباً پورا ڈاکٹر ہوتا ہے مگر اس کو بالکل اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی کا علاج کرے یا نسخہ تجویز کرے یا اپنے پاس سے بغیر ڈاکٹری نسخہ کے کسی کو دوائی دے اور اگر اس قسم کا جرم اس پر ثابت ہو جائے تو اسے سخت سزا دی جاتی ہے۔

اس سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ یہ ظلم ہے بلکہ یہ عین رحمت ہے کیونکہ ڈاکٹر اور کمپونڈر لوگوں کی صحت کے محافظ اور نگہبان ہوتے ہیں اس لئے اگر ہم اپنی صحت کو کسی کے سپرد کرنا چاہتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ کسی

ماہرِ فن کے سپرد کریں۔

**دندان ساز کا کورس:۔** جیسا کہ متمدّن قوموں نے ہر ایک علم اور فن کو ایک خاص قانون کے ماتحت کر دیا ہے اس طرح انھوں نے اس اہم فن کو جو آج کل اشد ضروریات میں سے شمار کیا جاتا ہے ایک قانون کے ماتحت منضبط کیا ہے۔

سب کو معلوم ہے کہ ہندوستان میں ڈاکٹر بننے کے لئے عموماً اس سے زیادہ تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ آدمی کسی ڈاکٹر کی صحبت یا کسی دواخانہ یا ہاسپٹل میں کچھ عرصہ کے لئے رہکر اپنے آپ کو ڈاکٹر کہلانا شروع کردے اور ڈاکٹری سے زیادہ آسان بات یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حکیم یا ڈنٹسٹ بننا چاہتا ہے تو اس کے لئے صرف اتنی بات ضروری ہے کہ دکان پر بورڈ لگا کر چند بوتلیں رکھ کے بیٹھ جائے اور بدقسمت ناواقف لوگوں کو تختہ مشق بنانا شروع کردے۔ باقی عمر خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اگر کوئی مر جائے تو اس کی عمر ختم ہو چکی ہوئی اور اگر اتفاقاً کوئی اچھا ہو گیا ہے یا اس کی علالت لمبی نہ ہوئی ہو تو معالج کی عنایت ہے۔

یہ سب باتیں جس طرح کہ یورپ اور دیگر متمدن ملکوں میں نہیں پائی جاتی ہیں اسی طرح سیریا میں بھی بالکل مفقود ہیں۔ چنانچہ ڈنٹسٹ بننے کے لئے علاوہ ان بارہ سالوں کے اور پانچ سال پڑھنا پڑتا ہے تب جا کر ڈنٹسٹ ہو سکتا ہے۔ شاید کسی کا یہ خیال ہو کہ بھلا دانت نکالنا اور دانت بنانے میں کونسی دقت ہے جس میں اتنے سال ضائع کئے جائیں مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ دنیا میں درحقیقت کوئی علم یا فن معمولی نہیں ہوتا بلکہ اگر بالاستقصاء اس پر بحث کی جائے تو شاید عمر ختم ہو جائے اور وہ ختم نہ ہو اور چونکہ دانت کی جراحی ان فنوں میں سے ایک اہم فن ہے بلکہ دانت پر تمام جسم اور صحت کا دارومدار ہوتا ہے اس لئے امراضِ فم اور دیگر امراض کے سیکھنے کے لئے جب تک اتنا عرصہ خرچ نہ کیا جائے تب تک پوری طرح سے معلوم نہیں ہو سکتے ہیں۔

**دایہ کا کورس:۔** ان اہم باتوں میں سے جو آج تک ہندوستان میں پس پشت رکھی ہوئی ہیں ایک دایہ کا کام ہے جس کو عوام الناس بالکل معمولی بلکہ حقیر اور ذلیل کاموں میں سے شمار کرتے ہیں سیریا میں دایہ بہت معزز ہوتی ہے کیونکہ کوئی عورت دایہ نہیں ہو سکتی جب تک باقاعدہ پڑھی لکھی نہ ہو اور چودہ سال کا کورس پاس نہ کر چکی ہو۔

**وکالت کا کورس** :- ان بارہ سالوں کے بعد تین سال کا کورس ہے۔ اس میں کوئی خاص قابلِ ذکر بات نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہاں اب تک پرانا ترکی قانون جو شرع پر مبنی ہے پڑھایا جاتا ہے۔

**انجینیرنگ کا کورس** :- سترہ سال ہے مگر اب تک سرکاری یونیورسٹی میں انجینیرنگ پڑھنے کے لئے بیروت کی فرنسیسی یونیورسٹی میں داخل ہونا پڑتا ہے۔

ان سب ترقیات کے باوجود مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اب تک سیریا میں اجباری تعلیم کا سسٹم جاری نہیں ہوا اور نہ اب تک ڈاکٹریٹ کے لئے کوئی انتظام ہوا ہے بلکہ اگر سیریا میں کوئی شخص کسی علم یا فن میں ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو یورپ جانا پڑتا ہے اور عام طور پر پیرس سے ڈاکٹری حاصل کی جاتی ہے کیونکہ سیریا میں انگریزی زبان کی نسبت فرانسیسی زبان کا زیادہ رواج ہے۔

یہاں تک میں نے مجمل طور پر سیریا کے طریق تعلیم کا ایک خاکہ کھینچا مگر جب تک وہاں کے بورڈنگ ہاؤس سسٹم کے متعلق کچھ بیان نہ کیا جائے اس وقت تک یہ مضمون مکمل نہیں ہو سکتا اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس بارے میں بھی کچھ لکھا جائے کیونکہ جب تک اس قابل تعریف سسٹم سے ناظرین کرام واقف نہ ہونگے تب تک وہاں کے سریع ترقی کا راز نہیں سمجھ سکتے ہیں۔

**بورڈنگ ہوس سسٹم** :- وہاں بورڈنگ میں رہنے کا طریقہ ہندوستان کے طریقہ سے بالکل مختلف ہے کیونکہ وہاں بورڈنگ اور کالج یا سکول ایک ہی بلڈنگ میں اور ایک ہی احاطہ میں ہوتے ہیں۔ اور بورڈر کو سوائے جمعہ کے دن کے (جو وہاں چھٹی کا دن ہوتا ہے) کالج سے باہر جانے کی بالکل اجازت نہیں ہے یعنی طالبعلم کو چھ دن تک لگاتار بورڈنگ ہاؤس اور کالج کے احاطہ میں رہنا پڑتا ہے جس کا نتیجہ عام طور پر یہ ہوا ہے کہ طالبعلم کا دماغ متفرق کاموں میں منتشر اور پریشان نہیں ہوتا بلکہ اپنے مطالعہ اور محنت میں اچھی طرح مصروف رہتا ہے۔

کالج کا احاطہ بہت وسیع ہوتا ہے اور اس میں باورچی خانہ ڈائننگ روم سونے کے کمرے غسل خانہ کھیل تفریح کے سامان وغیرہ وغیرہ تمام ضروریات موجود ہوتی ہیں۔

بورڈنگ میں طالبعلم کو کسی قسم کی تکلیف یا دقت پیش نہیں آتی کیونکہ وہاں سال بھر کے لئے پڑھائی حجامت حمام کھانا پینا کپڑوں کا دھونا وغیرہ کا انتظام کالج کے ذمہ ہوتا ہے اور ان تمام ضروریات کو ایک مقررہ سالانہ فیس

کے عوض میں پورا کرتا ہے۔ یہ فیس طالبعلم تین قسطوں میں ادا کر سکتا ہے۔

اس سے واضح ہو گیا ہو گا کہ طالبعلم کو سوائے اس فیس کے اگرچاہے سال بھر میں ایک پیسہ بھی خرچ کرنا نہیں پڑتا البتہ اپنے کپڑوں وغیرہ کا انتظام خود طالبعلم کو کرنا پڑتا ہے۔

ڈائننگ روم:- ڈائننگ روم ایک بڑا ہال ہوتا ہے جس میں چیزیں قرینہ کے ساتھ چھپی ہوئی ہوتی ہیں جو عام طور پر ہر میز آٹھ لڑکوں کی نشست کے لئے ہوتی ہے۔ کالج کی طرف سے طالبعلموں کو ان میں تین دفعہ کھانا ملتا ہے ایک ناشتہ جو عام طور پر چائے اور ڈبل روٹی اور بعض دفعہ حلوہ ہوتا ہے دوسرا دوپہر کو اور وہ اچھی قسم کا کھانا اور پھل وغیرہ اور شام کو علیٰ ہذا القیاس۔ کھانے کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ سب لڑکے اکھٹے کھاتے ہیں کھانے کے لئے ایک گھنٹی بجتی ہے جس کے سننے پر سب طالبعلم بڑے چھوٹے امیر غریب ایک ہی قطار میں ہو کر بہت خاموشی اور انتظام کے ساتھ ہر ایک اپنی اپنی مقررہ سیٹ پر جا بیٹھتا ہے۔ میزوں پر کھانا ڈشز میں چنا ہوا تیار رہتا ہے اور ہر ایک سیٹ کے سامنے ایک چمچہ ایک کانٹا اور ایک چینی کی خالی پلیٹ ہوتے ہیں۔ جب تمام طالبعلم اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے ہیں تو ہر ایک میز کے طالبعلم کھانے کو آپس میں تقسیم کر کے کھانا شروع کرتے ہیں۔ ڈائننگ ہال میں روزانہ باری باری سے ایک پروفیسر طالبعلموں کے ساتھ کھانا کھاتا ہے تاکہ لڑکوں کو کھانے کی خرابی سے یا دوسری باتوں سے شکایت کرنے کا موقع نہ ہو کیونکہ اگر کھانے میں کوئی نقص معلوم ہو تو پروفیسر نوٹ کر کے رپورٹ کرتا ہے۔ کھانا سب لڑکوں کو ایک ہی ملتا ہے۔

اگرچہ بورڈنگ میں باہر سے کھانا وغیرہ منگوانے کی ممانعت نہیں ہے تاہم اس قسم کے واقعات بہت کم پیش آتے ہیں کیونکہ کھانا کم نہیں ہوتا اور نہ برا ہوتا ہے بلکہ غریبوں کے لئے اعلیٰ اور امیروں کے لئے مناسب ہوتا ہے۔

سونے کا کمرہ:- بورڈنگ ہاؤس میں سونے کے کمرے (ڈارمٹری) کی طرز پر ہوتے ہیں۔ ہر ایک کمرے کی وسعت کے لحاظ سے متعدد پلنگ ہوتے ہیں اور عموماً ۵ سے لیکر ۵ پلنگ تک ہوتے ہیں۔ چارپائیاں لوہے کی ہوتی ہیں۔ بستر کمبل لحاف تکیہ چادر وغیرہ وغیرہ سب کچھ کالج کی طرف سے ملتے ہیں۔ ہر ایک چارپائی کے ساتھ ایک چھوٹی سی الماری ہوتی ہے۔ یہ کمرے صبح سے سونے کے وقت تک بند رہتے ہیں اور کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ صبح کے وقت سب ایک ہی وقت میں گھنٹی کی آواز پر اٹھتے ہیں اور فوراً ہر طالبعلم اپنے کپڑے بدلکر

یعنی سلیپنگ سوٹ اتار کر کوٹ پتلون (جو کا بچوں کا لازمی لباس ہے) پہنکر اور اپنے بستر کو خود ٹھیک ٹھاک کر کے باہر نکل آتا ہے۔ اس کے بعد مسلمان طالبعلم نماز پڑھنے کو جاتے ہیں نماز پڑھکے پڑھائی میں مصروف ہو جاتے ہیں اتنی دیر میں ناشتہ تیار ہو جاتا ہے ناشتہ کر کے طالبعلم اپنے اپنے کلاسوں میں چلے جاتے ہیں۔ جو لڑکا اپنے میلے کپڑے اتارنا چاہتا ہے تو اس کو اتار کر اپنے بستر پر رکھکر چھوڑ دیتا ہے دھوبن آکر اس کو لے لیتی ہے اور چند دن کے بعد دھلے ہوئے اور استری کئے ہوئے واپس جہاں سے لئے تھے وہاں پر رکھدیتی ہے اور اگر کسی کپڑے میں کوئی بٹن کم ہو یا ادھڑا ہوا ہو یا پیوند کی ضرورت ہو وہ اس کو بغیر معاوضہ درست کرا لاتی ہے۔ اس لحاظ سے گویا کہ طالبعلم اپنے گھر میں رہتا ہے۔ ان باتوں کے علاوہ سب سے زیادہ قابل ذکر یہ بات ہے کہ ہر ایک کمرے میں اس کی وسعت کے لحاظ سے رات کو لڑکوں کی نگرانی کے لئے دو تین یا اس سے زیادہ یا کم چپراسی ساری رات جاگتے رہتے ہیں اور پہرہ دیتے رہتے ہیں اور ان کی نگرانی کے لئے بھی ہر رات باری باری ایک پروفیسر متعین ہوتا ہے نیز سپرنٹنڈنٹ کا بورڈنگ میں سونا لازمی ہے۔

اس سسٹم میں یہ فائدہ ہے کہ علاوہ طالبعلموں کی آرام کے جو غرض اول ہے ان کے آپس میں دوستانہ تعلقات پیدا ہوتے ہیں کیونکہ ان سب کا بیٹھنا اٹھنا کھانا پینا یکساں اور اکٹھا ہوتا ہے۔

# غمِ انتظار

(حضرت جگر مراد آبادی)

نظر ہے وقفِ غمِ انتظار کیا کہنا
کھنچی ہے سامنے تصویرِ یار کیا کہنا

یہ چشمِ مست یہ ابرو یہ زلف یہ خد و خال
یہ لب یہ رخ یہ جبیں یہ عذار کیا کہنا

شباب اور مکمل شباب ارے توبہ
بہار اور مجسم بہار کیا کہنا

تصادمِ نگہِ شوق اے معاذ اللہ
تبسمِ نگہِ فتنہ کار کیا کہنا

فروغِ حسن دو نالۂ سرود و طرفِ چمن
شرابِ عشق و لبِ جوئبار کیا کہنا

گل و بنفشہ و نسریں و نسترن کیا خوب
بہار و سایۂ ابرِ بہار کیا کہنا

بیانِ درد و زبانِ خموش و عرضِ نیاز
جبینِ شوق و کفِ پائے یار کیا کہنا

سبک روانیٔ اشک و خنک نسیمِ کرم
نشاطِ دردِ دلِ بیقرار کیا کہنا

گزارشِ دلِ غم آفریں معاذ اللہ
نگارشِ غمِ ہمت شکار کیا کہنا

تمام شوق و شکایت تمام مہر و وفا
فسانۂ دلِ بے اختیار کیا کہنا

شراب ریز نگاہائے ناز ارے توبہ
پیالہ گیر کفِ رعشہ دار کیا کہنا

فسونِ نیم نگاہی و سحرِ استغنا
سکوتِ حسن و لبِ نغمہ بار کیا کہنا

کرم نما ستمِ نازِ حسن ارے توبہ
ستم نما کرمِ خاصِ یار کیا کہنا

نگاہِ ناز کے پیہم اشارہ ہائے لطیف
شکستِ شیشۂ دل بار بار کیا کہنا

حریمِ حسن کے پردے اٹھے ہوئے ہیں جگر
یہی اگر ہے غمِ انتظار کیا کہنا

# گپ

(غلام احمد خاں صاحب)

ڈاڑھی مونچھیں "دارد" ہوں یا "ندارد" لیکن انسان ہو "فارغ البال" تو ہمیشہ "گپ شپ" کی سوجھتی ہے۔

یوں تو انگلستان اور امریکہ سے لیکر افریقہ کے وسط تک ہر وہ جاندار جس پر "ناطق" کا اطلاق ہو سکتا ہے گپ شپ کیا کرتا ہے مگر ہندوستان میں یہ وبا ایسی عام ہے کہ بس "تو چل میں آیا"۔ جہاں دو چار بھائی بند جمع ہوئے ہم چشم اور فرمایا میر صاحب نے کہ "ہاں تو بھیا بندو وہ جو تم نے کئی تھی سو پھر"۔ اور ایک داستان چھڑ گئی طولانی میر صاحب ہیں کہ "سو پھر سو پھر" کئے جاتے ہیں۔ چاروں طرف سکوت ہے اور سناٹا جسے کبھی کسی راہ گیر کا گیت اور کبھی خود میر صاحب کا کھانسی آمیز قہقہہ توڑ دیتا ہے۔ اور اُن کی "آخ تھو" اور "جمعہ زرا چلم تو لوٹ لیجو" کی صدا کچھ دیر کانوں میں گونج کر آس پاس کہیں تاریکی میں غائب ہو جاتی ہے۔

اکثر راتوں کو اور اگر کبھی موقعہ مل گیا تو دن کو بھی یہی مشغلہ رہتا ہے اور بندو کبھی اپنے سفر کے چشم دید واقعات اور کارنامے اور کبھی ایسے قصے جن کا ساری بستی سے تعلق ہوتا ہے اِس انداز سے سناتا ہے کہ آپ کو کیونکہ آپ ٹھیرے "علی گڑھ پاس" خواہ غصہ ہی آتا ہو مگر میر صاحب باوجود اپنی متانت کے لوٹ لوٹ جاتے ہیں بیچارے بندو اور میر صاحب ہی پر کیا موقوف چوکیدار سے لیکر تھانے دار صاحب اور پیشکار سے لیکر ڈپٹی صاحب تک سب گپ مارنا جانتے ہیں اور گپ مارتے ہیں۔ اکثر شام کو ورنہ جب زرا سی مہلت ملے! اور اگر بندو اپنے بریلی جانے کے واقعات سناکر دل خوش کرتا ہے تو تھانے دار صاحب اپنے اُن مظالم کے جنھیں وہ اپنے بے بہا کارنامے سمجھکر اور سمجھاکر داد و تحسین کے خواہاں ہوتے ہیں۔ اور ڈپٹی صاحب اپنی اُن اَن تھک کوششوں کا ذکر کرتے ہیں جن کی بدولت پرگنہ بھر کی مالگذاری، انھوں نے بجائے چار چھ مہینے کی زق زق کے پندرہ روز میں وصول کرلی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ کوئی "سمن بغرض انفصال مقدمہ" جس کی ابتدا لفظ "ہرگاہ" اور انتہا "ساتھ میرے دستخط اور مہر عدالت کے اجرا کیا گیا" ہوتی ہے۔ اجرا کرنا پڑا۔ اور نہ تھانہ جیل خانہ حوالات یا کال کوٹھڑی کی نوبت آئی

جیسے چپکے سے سوراج کا مسئلہ ہندوستان میں چھڑ گیا اور کسی کو خبر نہ ہوئی تا وقتیکہ رہنمایانِ قوم کو ایک آدھ مرتبہ بعلت "قید بامشقت و بے مشقت" جیل خانوں کی ہوا اور کسکسی روٹی نہ کھانی پڑی۔ اسی طرح گپ بھی چھڑ جایا کرتی ہے اور کسی کو خبر نہیں ہونے پاتی تا وقتیکہ کوئی صاحب آکر یہ نہ کہدیں کہ "اجی کہاں ہیں آپ وہ مولانا بیٹھے حاضری لے رہے ہیں" اور پھر آپ آؤ دیکھیں نہ تاؤ اور کتابیں اُٹھا کر اس طرح چلدیں کہ پیچھے سے اختر صاحب آپ کا گلا پکڑ کر فرمائیں کہ "واہ مُرشد کتابیں میری بھی لے چلے"۔

گپ اور شعر میں اتنی ہی مناسبت ہے جتنی سوراج اور "بدیشی کپڑے کے مقاطعہ" میں جس طرح ہندوستانی بغیر کھدر پہنے اور چرخہ چلائے سوراج سے قاصر ہے۔ اسی طرح انسان بغیر "شاعرانہ طبیعت" اور تخیل کی بلند پروازی کے گپ مارنے سے اور جو استاد نے فرمایا ہے کہ "چنانکہ گپ در ہر علمے بکار ہمی شود ہر علمے در گپ بکار ہمی شود" تو کیا جھوٹ فرمایا ہے!

گپّی کو بھی شاعر کی طرح "سلیم الفطرت عظیم الفکرۃ صحیح الطبع جید الرویہ دقیق النظر در انواعِ علومِ متنوع" ہونا چاہیئے۔ اور اگر بقول "اخبار ریاست" کے آپ میں اوپر کی خصوصیات نہ ہوں تو آپ کو سمجھ لینا چاہیئے کہ گپ کے مسئلہ میں آپ قطعی "محض" ہیں۔

یوں تو گپ مارنے میں ہمیں ہمیشہ لطف آتا رہا اور خدا نہ کرے کہ کبھی نہ آئے۔ لیکن لطف آنے کا بھی وقت ہوتا ہے۔ ایک تو وقت وہ ہوتا ہے جب لائبریری کے کسی کونے میں اختر صاحب نظر آجاتے ہیں اور لیجیئے وہ آئے راقم صاحب اور لیجیئے محامد صاحب اور انھوں نے نتھنے پھلا کر قہر آلود نگاہیں اختر صاحب پر ڈالیں اور "واہ ادیب صاحب اور آہ ادیب صاحب" کے نعرے لگائے کہ پھر کیا تھا مجلسِ مشاورت ایک دفعہ کو جم ہی گئی۔ اور اختر صاحب اُردو کا پرچہ پھینک ٹوپی سنبھالتے ہوئے چاروں طرف اِس انداز سے ملتجیانہ نظریں ڈالنے لگے کہ گویا کہہ رہے ہیں۔ "اکیلے پہ سے گر پڑا تھا"۔

دوسرا وقت وہ ہوتا ہے کہ کڑاکے کی سردی میں جب کہ ہندوستانی قوم پرست وطن کی بے مائگی اور "یارانِ وطن" کی بے حوصلگی کی وجہ سے ذرا ڈگمگا سا جاتا ہے اور کھدر کی اچکن کی آن "رین بو" کے سوئٹر کی مدد سے قائم رکھتا ہے یا حتی الوسع رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ خدا بھلا کرے اِن "ساٹھ فی صدی" کی بحث چھیڑنے

والوں کا کہ یہ صاحب نا قوم پرست تو کسی دین کے نہ رہے۔ لالچی ہوں تو خیر کہ وہ اپنے ایک آدھ سیر روئی کے کوٹ ہی میں جاڑے کاٹ دیں۔ اگر یہی حوصلے رہے اور وضع کی پابندیاں توڑ نگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن"" ہم تو بھارت کی سیوا کریں گے" کا لینے سے اگر سوراج مل گیا تو جب سمجھیں گے کہ ہاں سچ کہتے تھے میر صاحب۔ خوب آدمی تھے اللہ بخشے۔

تو ہاں دوسرا وقت وہ ہوتا ہے کہ کڑاکے کی سردی میں دو چار یار دوست ایک کمرہ میں جمع ہوں۔ انگیٹھی دہکتی ہو۔ پان۔ حقہ۔ سگرٹ چرٹ۔ سگار کا انتظام کافی ہو اور اگر حلوے ہوں مقوی دل و مقوی دماغ اور گرم چائے جو "گرمیوں میں ٹھنڈک پہونچاتی ہے" "جاڑوں میں گرمی پہونچاتی ہو تو" پھر دیکھئے انداز گل افشانی گفتار"۔

اور پھر ایک وقت وہ ہوتا ہے کہ فکروں سے تنگ آکر شب دیجور کے کسی انتہائی حصہ میں گوشۂ عافیت کا خواہاں ہوتا ہوں حکیم الحکما مسیحا، مجدد بعیثت مولا بخش یعنی بغل میں سینٹھا دبائے ناگہانی نازل ہوتے ہیں لہ اس آپ کے خادم پر احسان دھرنے کی خاطر بڑی سنجیدگی سے فرماتے ہیں کہ" دیکھا۔ تم بڑے وعدہ خلاف ہو نا۔ نمبر کل جا رہا ہے پریس کو۔ اور جو صبح تک کاغذات نہ پہونچے تو سمجھ لیجئے کہ کل ایک سینٹھے کی اور ضرورت ہوگی۔ پھر ہم ہونگے اور آپ" اور زرا سادگی تو ملاحظہ فرمائیے کس انداز سے فرماتے ہیں وہی پرانی بات کہ "آج واں تیغ و کفن........"

اور جو میں عرض کرتا ہوں کہ تیغ تو خیر آپ کا سینٹھا ہوا۔ اور یہ کفن چہ معنی دارد تو بس حضرت میں کیا عرض کروں کہ محض ٹالنے کی خاطر ایک لمبی سی گپ "بعنوانِ نمائش" یوں چھڑ جاتی کہ موصوف علی گڑھ کی نمائش بلند شہر کی نمائش۔ میرٹھ کی نوچندی سے لیکر ومبلی تک کے واقعات و حادثات سنا جاتے ہیں۔ اور میں کچھ اپنے لطف کی خاطر کچھ جناب کے پاس و لحاظ کی خاطر اور کچھ اُن کی بندہ پروری اور ذرہ نوازی کی وجہ سے اگر کہنا چاہتا بھی ہوں کچھ تو نہیں کہتا اور "تم کو چاہوں کہ نہ چاؤں تو بُھائے نہ بنے" کا مضمون ہوتا ہے۔

اور ان کے بعد جو کبھی کبھی وقت ہوتا ہے تو ڈائننگ ہال کے ڈنر میں کہ لوگ بریانی کباب اور مرغ کو دیکھکر بکری کے سادے قورمے سے یوں مخاطب ہوتے ہیں۔ "ابے۔ فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی"

ہر منیر پر برطانوی اقتدار کی طرح ایک "کھانے کے مانیٹر صاحب" بروزن "تلاؤ کے سکتر صاحب" اس طرح مسلط ہوتے ہیں کہ بھلا مجال ہے کسی بیرے کی کہ چوں کر جائے۔ ورنہ مانیٹر صاحب کی غیر موجودگی میں اگر بیرے

اور سٹوں کا داؤں لگے تو سامنے سے روٹیاں اُٹھا اٹھا کر نہ بھاگیں تو مجھ سے کہنا۔

امّا بعد۔ کھانے کے ساتھ ساتھ "گپ بالسہو" اور بعد از فراغت پانے طعام کے "گپ بالجہر" سب کو تو خیر لطف آتا ہی ہوگا مگر "کھانے کے ماینٹر صاحب" کے دل سے پوچھئے کہ جو ہنستے ہیں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ "اب مت بولو بیچارہ بھوکا ہے۔ مچل جائے گا"

علیٰ ہذا القیاس

# احسن الکلام

کبھی ہی جب سے نظر میں اک آدمی کی طرح
خیال میں نہیں آتی کسی پری کی طرح

سنا جو اُس نے مرا حالِ غم خوشی کی طرح
دلِ فسردہ مرا کھِل گیا کلی کی طرح

نہیں رہا کوئی عاشق کہیں سلیقے کا
بگڑ گئی ہے زمانے میں عاشقی کی طرح

بڑھائیں آپ کی محفل سے کیا بہشت کو ہم
وہاں بھی حور جو ہوگی تو آپ ہی کی طرح

تری نگاہ میں قاتل غضب کی تیزی تھی
اُتر گئی جگر و دل میں وہ چھری کی طرح

دکھاؤں زینتِ مے خانہ کیا تجھے واعظ
کہ بند شیشے میں اک چیز ہی پری کی طرح

مرض تو کچھ نہیں لاحق تمہارے درباں کو
ملا رہا ہی مجھے تم سے اجنبی کی طرح

یہ کیا کہ دوڑ پڑے منہ اُٹھا کے تم ناصح
نصیحتیں جو کرو بھی تو آدمی کی طرح

بُھا لیا ہی تری وضع نے دل احسن کا
پسند آ نہیں سکتی اُسے کسی کی طرح

# چاندنی رات

(از محمد احسن متعلم ... علی گڑھ)

رات کا وقت ہے ہر طرف سناٹا ہے اور خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ طائرانِ خوش الحان جو کہ تمام دن اپنے چہچہوں سے لوگوں کے دل لبھاتے رہتے تھے اب اپنے اپنے گھروں میں آرام کر رہے ہیں۔ مزدوری پیشہ لوگ دن بھر کے تھکے ہارے اپنے اپنے جھونپڑوں میں آرام کی نیند سو رہے ہیں۔ امرا و رؤسا سنجاب و قاقم کے بستروں میں تمام دنیاوی کاروبار کو بھولے ہوئے خوابِ غفلت میں بے حد مدہوش ہیں لیکن علم ہیئت کار جاننے والے اپنی دوربین نگاہوں سے مطالعۂ فلک میں مصروف ہیں۔ عاشقانِ صادق اپنے محبوب حقیقی کی یاد میں محو ہیں۔ اور زاہدانِ ریاضت کیش عالمِ تحیر میں دیدارِ منعمِ حقیقی سے مالا مال ہو رہے ہیں۔ عاشقانِ مجازی وعدہ محبوب کے خیال سے مضطرب ہو کر دل ہی دل میں یہ کہہ رہے ہیں کہ ؎

ہمارے حق میں قیامت ہے حشر کا وعدہ
کہ انتظار میں مر مر کے دن تمام کیا

لیکن میں اپنے کمرہ میں نہایت خاموشی کے ساتھ میز پر بیٹھا ہوا پڑھ رہا ہوں۔ گرمی ہنگامۂ امتحاں سے اتنا مستغرق ہوں کہ دنیا و مافیہا سے ایک حد تک بےخبر ہو گیا ہوں۔ امتحان بہت قریب ہے۔ اور ان باقی ماندہ چند ایام میں نصاب کی کتابوں پر عبور حاصل کرنا ہے۔ یکایک میں اپنے سر میں میٹھا میٹھا درد جو کہ سخت محنت کا لازمی نتیجہ ہے محسوس کرنے لگتا ہوں۔ چنانچہ میں کرسی پر سے اٹھ کر اور انگڑائی لیکر کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھتا ہوں تو عجیب منظر پیشِ نظر ہے۔

چودھویں رات کا چاند صفحۂ ارضی پر لمعہ ریز ہے مہ کامل نے اپنی ضوفشانی سے کائنات کے ذرّہ ذرّہ کو منور کر رکھا ہے۔ بیلا چنبیلی، گلاب غرض ہر ایک خوشبودار پھول نے صحنِ گلشن کو مہکا رکھا ہے چنبیلی کی روح پرور خوشبو ماہتاب کی روپہلی کرنوں پر سوار ہو کر دز دیدگی سے کمرہ میں داخل ہو کر مجھے اس بات پر مجبور کر رہی ہے کہ میں باہر نکلوں اور اپنے پریشان دماغ کو فرحت پہنچاؤں۔

میں اس کیفِ جانفزا کو دیکھ کر ایک سرمست و شیدا شاعر کی طرح پروازِ خیال میں مصروف ہو گیا۔ اور ایک نشۂ خواب میرے دل و دماغ پر محیط ہونے لگا۔ اس رات کے حسن نے میری روح میں ایک بالیدگی پیدا کر دی۔ اس

مختصر مگر خوشنا خطۂ زمین نے جو جو اثرات میرے دل پر کئے وہ طاقتِ قلم سے باہر ہیں۔ درختوں کی میووں سے لدی ہوئی شاخیں اور منہ بند کلیوں سے لدی ہوئی ڈالیاں۔ چھوٹے چھوٹے پودے اور ان کی سبزی۔ ہلکی ہلکی ہوا درختوں کی شاخوں میں ایک سنسناہٹ پیدا کر رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دلفریب چمن اس پُر عیش رات کی شیرینی اور لطافت پیئے جا رہا ہے۔ فضا کی روح پرور نشیلی کیفیت کو چوسے لیتا ہے۔ میں بھی مستانہ وار میٹھی میٹھی خوشبودار ہوا کو رندانِ بادہ خوار کی طرح سے پیتے ہوئے پلنگ پر سے اپنی ہلکی شال اُٹھاتا ہوں۔ اور کاندھے پر ڈال کر باہر نکل آتا ہوں۔ اور بنگلے کے باہر چھوٹے سے باغ میں بالا قامت سرو و شمشاد کے درختوں کے پاس پہنچ جاتا ہوں۔ اور اس نقرئی مملکت میں تاروں کے رقص کو دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں کہنے لگتا ہوں کہ:-

یہ رات کیوں بنائی گئی ہے اگر یہ نیند۔ آرام۔ خواب اور غفلت کے لئے ہے تو دن سے زیادہ دلفریب اور زیادہ دلآویز کیوں ہے۔ صبح و شام سے زیادہ دلربا زیادہ سحر آگیں کیوں بنائی گئی ہے۔ اور کیوں یہ چاند جو سورج سے زیادہ شعریت سے مملو ہے ان نازک اور لطیف چیزوں کو جو گویا سورج کو شرماتی ہیں ٹھنڈی یاسمینی روشنی بخشتا ہے۔ یہ خیالات میرے دماغ میں گشت لگا رہے ہیں کہ میں یکایک ایک خوفناک آواز جو کہ کسی قدر مدہم ہے سنتا ہوں۔ اور سن کر خوف زدہ ہو جاتا ہوں اس لئے عرصہ تک اس دلرُبا منظر سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا چنانچہ اپنے کمرہ میں واپس چلا جاتا ہوں لیکن اب تخیل بالکل درہم برہم ہو جاتا ہے۔ طبیعت میں وہ جولانی باقی نہیں رہی کہ جس نے اس باغ میں چاند کے ٹھنڈے ٹھنڈے اور دل میں گھر کرنے والے عنکبوتی جال سے جکڑ رکھا تھا۔

# انگریزیت

(از اختر امام)

کچھ عرصہ ہوا کہ رسالہ "ہمایوں" میں ایک دلچسپ مضمون "صاحب بہادر" نظر سے گذرا۔ جناب فرحت اللہ بیگ صاحب کا کیا کہنا۔ آپ نے اس کو بھی اپنے مخصوص "خوش مذاقی" (Sight Humour) کے رنگوں میں رنگ دیا تھا۔ اتفاق سمجھئے کہ اس وقت میں کالج کی لائبریری میں تھا۔ ادھر اُدھر کئی طلبا بیٹھے ہوئے تھے جو "اسٹرینڈ میگزین" "وائڈ ورلڈ" (Wide World) اور اسی طرح کے نہ جانے کون کون انگریزی رسائل کے مطالعہ میں غرق تھے "غریب اردو" "ہمایوں" اور "معارف" کو کون پوچھتا ہے۔ ہاں جناب تو میں "ہمایوں" کا تذکرہ کر رہا تھا۔ ہوا یہ کہ جب پڑھتے پڑھتے اس جملہ پر پہنچا کہ "ام نائیں مانگتا" تو بے اختیار مجھکو ہنسی آگئی۔ میرے "انگریزی نواز" احباب اپنی اپنی جگہوں سے اُٹھے اور میرے قریب آکر بیٹھ گئے۔ جب میں نے اُن کی صورتیں دیکھیں تو اپنی اس غیر اختیارانہ "کھلکھلاہٹ" پر کچھ خفیف سا بھی ہوگیا۔ مگر کرتا کیا اس کو نباہنا بھی ضرور تھا اس لئے اُن کے اصرار پر سارا مضمون (صاحب بہادر) الف سے ی تک سنا دیا۔ پھر نہ پوچھئے کہ کیا ہوا۔ میں تو مضمون پڑھتا جاتا تھا اور کمرہ میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارے ایک دوسرے کو "خبطی" سمجھکر قہقہے لگا رہے ہیں۔ یا یہ "ہمایوں میں" "صاحب بہادر" کی بجائے "دیوار قہقہہ" ہے۔

جب بورڈنگ کو واپس ہوا تو بیٹھے بیٹھے یہ خیال آیا کہ کیوں نہیں میں بھی "فرحت اللہ بیگ" کی پلٹن میں نام لکھا کر "انگریزیت" پر ایک مضمون لکھ ڈالوں، مگر جناب کجا میں اور کجا فرحت اللہ بیگ۔ "چراغ مردہ کجا شمع آفتاب کجا" مگر میں نے بھی اب عہد ہی کر لیا ہے کہ جی کڑا کر کے کچھ لکھوں ہی گا۔ اس لئے اب اصل موضوع پر آتا ہوں۔

---

کوتاہ نظر انسان سطحیت کا دالدادہ ہے اور حقیقت سے اس کی نظر ہمیشہ دور رہا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کوتاہ نظری اُسے حقیقت آشنا نہیں ہونے دیتی۔ انگریزی راج سے ہندوستانیوں کی ذہنیت میں کچھ ترقی ہوئی ہو یا تنزلی اس سے ہمیں بحث نہیں۔ ہاں اس سے کوئی ذی ہوش انکار نہیں کر سکتا کہ خدا کے فضل سے اب اچھی خاصی "انگریزیت" تو آگئی ہے۔

آج کل انگریزی داں نوجوانوں کی ایک "انگریزیت" یہ بھی ہے کہ آپ حضرات شام کیوقت ہر طرح سے "آراستہ" ہوکر، سیر و تفریح کے لئے نکلا کرتے ہیں۔ اس تفریح سے آپ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ خدانخواستہ اپنے احباب کے یہاں یا کسی اور کھُلی فضا میں جی بہلانے جایا کرتے ہونگے۔ نہیں بلکہ یہ سیر صرف ریلوے اسٹیشن ہی تک محدود ہے۔ اگر آپ اُن سے سوال کریں کہ "آخاہ! بھئی غلام احمد یہاں کہاں؟ دوست کیسے آنا ہوا" تو آپ برجستہ جواب پائینگے کہ "ایک صاحب یہاں سے گذریں گے، میرے بڑے قدیم کرم فرما ہیں، دہلی جارہے ہیں۔ ملنے آگیا" مگر بندۂ خدا! آخر یہ کون سا فیشن ہے کہ جب کسی شام کیوقت دیکھئے تو آپ پلیٹ فارم کے کئی کئی پھیرے کر رہے ہیں۔

اگر آپ کو "انگریزیت" کا صحیح مرقع دیکھنا ہو تو براہ مہربانی کسی شام سینما، تھیٹر یا اور کسی تفریح گاہ میں تشریف لائیے کیونکہ یہی وہ جگہیں ہیں جہاں آپ "انگریزیت" کی تکمیل دیکھ سکتے ہیں۔ لطف اندوز ہونے کے لئے "سینما کی ایک شام" ذہن نشین کر لیجئے جہاں کھیل شروع ہونے سے چند گھنٹے قبل تماشائیوں کی بدولت ایک اچھی خاصی چہل پہل رہا کرتی ہے۔

عام طور سے یہاں تین ہی طبقے نظر آئینگے۔ ایک تو وہی شہر کے اُچکّے اور لفنگے جن میں ایک یا دو اپنی اپنی حیثیت کے مطابق فیشن پرست بھی ہونگے۔ مگر یہاں "انگریزیت" کا گویا فقدان ہے۔ اس کے بعد دوسرا طبقہ اُن لوگوں کا ہے جو عوام کی زبان میں "سفید پوش" بزرگ کہلاتے ہیں۔ اور اس گئی گذری حالت پر بھی اپنی پرانی وضع کو نباہ رہے ہیں، اس جماعت کے سپوت ہیں اب روز بروز "انگریزیت" ترقی کرتی جارہی ہے۔ طرفہ تماشا تو یہ ہے کہ یہ حضرات اپنی چال ڈھال سے "انگریز نما" بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ان کے پاس انگریزی لباس مکمل نہ ہو تو اس کی انھیں پرواہی کیا۔ کچھ نہیں تو ایک تنگ پتلون ہی سہی گو یہ دیکھنے میں کچھ "شرعی" ہی کیوں نہ معلوم ہو۔ (شرعی پاجاموں کی طرح اونچے) اپنے روزمرہ کی گفتگو میں اور وہ بھی خاص طور سے جب کسی غیر شخص سے مخاطب ہوں تو نامانوس انگریزی الفاظ۔ مثلاً "ٹائم" "لائٹ" وغیرہ استعمال کئے بغیر نہیں چوکتے۔

اور کبھی کبھی اسی "انگریزیت" کے جوش میں آکر اپنا لب و لہجہ بھی "گورے" "ٹامیوں" کی طرح بنانیکی کوشش کرتے ہیں۔ اور مزا تو یہ ہے کہ دل ہی دل میں سمجھتے ہیں کہ میری اس "ٹامیانہ" اردو سے مخاطبین پر کچھ رعب تو ضرور ہی پڑ رہا ہوگا۔ بار بار "ٹائم" دریافت فرمائینگے۔ ایسا معلوم ہوگا گویا آپ ایک بہت ہی مصروف شخص ہیں اور جناب کو ہر وقت اپنے "وقتِ عزیز" کا خیال لگا رہتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس "انگریزیت" کی نقل خدا ان ہی کو مبارک کرے اِن سے "کالے"

تو کیا "گورے" بھی نفرت کرنے لگیں۔

---

اب اس کے بعد ایک نیا طبقہ آیا۔ وہ آتا ہے جو اپنے خیال میں آپ کو "مہذب" "تعلیم یافتہ" اور غیر بی اے پاس شدہ گریجویٹ کو "وحشی" محض سمجھتا ہے اور اس گروہ کا ہر فرد تقریباً زیادہ تر صاحب بہادر ہی بنا رہتا ہے۔ اس میں کچھ تو اعلیٰ عہدہ پر ہیں اور کچھ دفاتر کے کلرک، اسٹیشن ماسٹر صاحبان اور دیگر بے روزگار "گریجویٹ" حضرات بھی شامل ہیں۔

ریل کے سفر میں ہمیشہ انگریزی لباس ہی میں ملبوس ہونا زیادہ پسند فرماتے ہیں اور اپنی ترکیبوں سے "صاحبیت" کے روشن چراغ اس جماعت کا ہر فرد ہمیشہ سفر میں اس بات کا شائق رہتا ہے کہ جب ریل کسی اسٹیشن پر ٹھہرے تو پتلون کی جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈال کر نہ وہ ٹہلا جائے۔ خواہ گاڑی کہیں دو منٹ کیوں نہ ٹھہرتی ہو۔ خورجہ یا ہاتھرس جیسے اسٹیشنوں میں جب تک انجن سے گارڈ تک ایک دو چکر نہ کرلیں انھیں چین کہاں نصیب۔

ایک بار میں جلیسر روڈ سے "ہاتھرس" جا رہا تھا کہ اسی قماش کے ایک "انگریز نما انسان" کو دیکھا۔ ابھی تھوڑے ہی دنوں کا یہ ذکر ہے کہ ہمارے صاحب بہادر "گاڑی" ٹھہرتے ہی ایک ڈبہ سے برآمد ہوئے۔ اور پھر حسب فیشن جب آپ پر "انگریزیت" کا بھوت سوار ہوا تو لگے آپ گارڈ سے انجن تک کا معائنہ کرنے۔ گاڑی "جلیسر روڈ" میں بہت ہی کم ٹھہرتی ہے۔ ابھی آپ انجن سے لوٹ ہی رہے تھے کہ انجن نے سیٹی دی ٹرین میں ایک تھرتھراہٹ پیدا ہوئی اور پھر چلنے لگی۔ بھلا آپ اس وقت "ہندوستانی" کیسے بنجاتے۔ کچھ تیز چلے مگر پھر "صاحبیت" نے باز رکھا۔ جب آپنے یہ دیکھا کہ اب تو گاڑی ہی چھٹا چاہتی ہے تو کچھ دور دوڑے بھی گئے اور جب اپنا خانہ سامنے آیا تو پھر پوری جست کے ساتھ ایک چھلانگ مار کر گاڑی کی چھڑ سے لٹک گئے اب چڑھ تو گئے مگر آپ کی ٹوپی ایک طرف گر گئی لیکن کیا پروا اسی دن سے طے کر لیا کہ اب کالج بھی ننگے سر جائینگے۔ حضرات بدقسمتی سے آنجہانی ڈارون صاحب کی کہ اپنے نظریہ کا ایک عینی مشاہدہ کرنے سے محروم رہ گئے۔ اس میں ہمارا قصور کیا۔ کسی بڑے "مقام اتصال" (Junction) پر کھڑے کھڑے چائے نوشی۔ اور ساتھ ہی ساتھ بار بار اپنے پتلون کی "شکن" کو بھی "صاحبانہ" طریقہ سے دیکھنا۔ ہوٹل والے سے "ٹومیانہ" اردو بولنا اور نوکر کو انعام دیتے وقت ایک خاص ادا سے سر کو جھٹکا دیکر "لوک شیش ھہ ای" کہنا۔ اور "چائے نوش" ہندوستانی بھائیوں سے "گٹ پٹ" کرنا۔ ہر پانچ منٹ پر لوگوں کی نظر بچا کر اپنے دستی رومال سے جوتوں کی صفائی کرنا۔ فی الحال "انگریزیت" ہے یہاں

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

# اے گلاب کی کلی

اے گلاب کی کلی — اے فروغِ دلبری
اے بہار کی پری — کر لے قاصدی مری
جا خدا کے واسطے
اور اس سے پوچھ آ
کس لئے ہے یہ جنوں
اس سے مدعا ہے کیا
آپ کو بھی اور مجھے — کیوں ہے یوں ڈبو رہی
عزلتوں میں بیٹھ کر — وقت کو ہے کھو رہی
لیکن اے کلی ذرا
سُن خدا کے واسطے
ایک اور عرض ہے
ہاں حضور میں ترے
کہنا نذر دیکے یوں
پارہ ہائے دل مرے
بسکہ دی مشابہت
رُخ کو تیرے حُسنِ غنچہ سے
ڈھونڈتا ہوں جب کبھی
اُس کے حُسن میں تجھے
پاتا ہوں میں کیف زا — جیسے ایک موجِ مے
کس قدر نظر فروز — کس قدر حسیں ہے
اے گلاب کی کلی

دسمبر ۱۹۳۰ء

کہنا اُس سے جا کے یوں — میرا حال ہے زبوں
میرے عشق کا جنوں — حد سے ہو گیا فزوں
کیا عجب کہ مان لے
میرے حالِ زار کو
شاید اب بھی جان لے
میرے اضطرار ہے
وہ کہ جس کا حُسن ابھی — بے نیازِ دید ہے
جس کی طلعتِ صبیح — رشکِ صبحِ عید ہے
جس کو خاص بُعد ہے
عام جلوہ گاہ سے
بھاگتی ہے جو ابھی
عاشقوں کی چاہ سے
کانپتا ہے جس کا دل
درد خیز آہ سے
رہتی ہے جو بے خبر
عشق کی کراہ سے
کاش اب ہٹ سکے
ظلم و کیں کی راہ سے
ورنہ حال ہوگا یہ — جیسے لالے کی کلی
دو رکھل کے دشت میں — یوں ہی خشک ہو گئی
اے گلاب کی کلی

---

لاکھ ہو حسیں کوئی — لاکھ مہ جبیں کوئی

نازآفریں کوئی یا عدوئے دیں کوئی — ہیچ اُس کی زیست ہے
گرچہ ہو قربتاً — ہیچ اُس کی زندگی
قدر اس کی کیا مگر — اس کے جلووں کا نہو
گر پڑی نہو کبھی — گر کوئی نظارگی
اُس پہ شوق کی نظر — کہدے اُس سے جاکے تو
اے کہ جس کا حسن ہو اک جہانِ نازکی — اس میں شرم کا ہے کی
جس کے حسن تازہ سے ہے چمن میں تازگی — عزلتوں کو چھوڑدے بزم میں ہو جلوہ گر
ہائے اس طرح رہے — سحرِ حسن فتنہ زا پھونکدے جہان پر
بن کے وہ بھی پردگی — اے گلاب کی کلی
بے نتیجہ حسن ہے
بے مآل دلکشی

(ماخوذ)

# سین تیسرا

## ننھے خاں ۔ خانصاحب ۔ ممن اور لطیفن

(گذشتہ سے پیوستہ)

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ ۴۴ اشاعت ماہ اگست ۱۹۳۰ء)

خانصاحب ۔ حکیم صاحب میری بیٹی ملاقات کے لئے ابھی آتی ہے ۔

ننھے خاں :۔ بسروچشم میں اس کی خاطر اپنی تمام طبی لیاقت سے کام لونگا چونکہ آپ کے خاندان کے سب افراد کی بہبودی میرے مدنظر ہے لہذا میں چاہتا ہوں کہ آپ کے شیر خوار بچے کی دایہ کی بھی نبض دیکھوں ۔

ممن :۔ (الگ کھنکھرا) یہ ہرگز نہ ہوگا ۔ ہٹو پرے ۔

ننھے خاں :۔ کیوں جی یہ گستاخی حکیموں کے کام میں مزاحم ہوتے ہو ۔ الگ رہو ۔

ممن :۔ ایسی کی تیسی تمہاری حکمت کی ۔

ننھے خاں :۔ یاد رکھ بخار چڑھا دونگا ۔

لطیفن :۔ (ممن کو بازو سے پکڑ کر ہٹاتی ہے) اجی تم الگ ہو ۔ میں خود اس سے نبٹ لونگی ۔ کیا میں اپنا بچاؤ نہیں کرسکتی ؟

ممن :۔ میں ہرگز برداشت نہیں کرسکتا کہ یہ تم سے اس طرح مذاق کرے

ننھے خاں ۔ ارے احمق اپنی بیوی پر اتنی بدگمانی ۔

خانصاحب ۔ لیجئے میری بیٹی آگئی ۔

# سین چوتھا

## صفیہ ۔ جمن ۔ خانصاحب ۔ ممن ننھے خاں اور لطیفن

---

ننھے خاں ۔ کیا مریضہ یہی ہے ۔

خانصاحب ۔ جی ہاں یہ میری اکلوتی بیٹی ہے ۔ خدانخواستہ اگر یہ چل بسی تو میرے لئے دنیا اندھیری ہوجائیگی ۔

ننھے خاں ۔ اے ہرگز کوئی ایسی حرکت نہ کرنے دیجئے ۔ اس کی کیا مجال کہ حکیم کے نسخہ کے بغیر عدم کی راہ لے ۔

خانصاحب ۔ ارے کوئی ہے ۔ ایک کرسی لے آؤ ۔

ننھے خاں ۔ واللہ مریضہ تو خوب طرحدار ہے ۔ ایک تندرست نوجوان کے لئے بہت ہی موزوں جوڑ ہے

خانصاحب ۔ بہت خوب آپ نے تو اسے ہنسا دیا ۔

ننھے خاں ۔ مریض کی ہنسی مبارک شگون ہوتا ہے ۔ لڑکی تمہیں کیا شکایت ہے کہاں درد ہے ۔

صفیہ ۔ (اپنا ہاتھ باری باری منہ اور سر پر اور ٹھوڑی کے نیچے رکھکر اشاروں سے جواب دیتی ہے) ہا ۔ ہی ۔ ہو ۔ ہا

ننھے خاں ۔ ہیں ؟ کیا ؟

صفیہ ۔ (اسی طرح اشاروں سے) ہا ۔ ہی ۔ ہو ۔ ہا ۔ ہی ۔

ننھے خاں ۔ کیا ؟

صفیہ ۔ ہا ۔ ہی ۔ ہو ۔

ننھے خاں۔ (اس کی نقل کرتے ہوئے) ہا۔ ہی۔ ہو۔ ہا۔
میں کچھ نہیں سمجھا۔ یہ گونگی زبان بول رہی ہو۔

خانصاحب۔ جناب یہی تو اس کو شکایت ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ یہ کیسے گونگی ہوگئی۔ اس حادثہ کی وجہ سے اس کی شادی مجبوراً ملتوی کی گئی ہے۔

ننھے خاں۔ یہ کیوں؟

خانصاحب۔ اس کا منگیتر چاہتا ہے کہ شادی اسکی شفا یابی کے بعد ہو۔

ننھے خاں۔ دنیا میں ایسا احمق کون ہے جسکی یہ خواہش نہیں کہ اس کی بیوی گونگی ہو۔ کاش کہ میری بیوی کو یہ عارضہ لاحق ہوتا۔ پھر تو میں بھولے سے بھی کوشش نہ کرتا کہ اسے شفا ہو۔

خانصاحب۔ آپ کچھ تدبیر کیجئے کہ اسے شفا ہو جائے

ننھے خاں۔ آپ کچھ فکر نہ کیجئے۔ یہ بتائیے کہ اس مرض سے کیا مریضہ کو بہت تکلیف ہوتی ہے؟

خانصاحب۔ ہاں جناب۔

ننھے خاں۔ کیا درد شدید ہوتا ہے۔

خانصاحب۔ بہت شدید۔

ننھے خاں۔ بہت خوب۔ کیا مریضہ ..... جایا کرتی ہے؟
آپ اُمید ہے کہ میری بات سمجھ گئے ہونگے۔

خانصاحب۔ بالکل۔

ننھے خاں۔ کیا کھل کر........

خانصاحب۔ اس کا مجھے علم نہیں۔

ننھے خاں۔ اس کا جاننا تو ضروری ہے۔

خانصاحب۔ جناب یہ باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔

ننھے خاں۔ (مریضہ سے مخاطب ہوکر) لاؤ میں ذرا نبض تو دیکھوں (تھوڑی دیر کے بعد) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی بیٹی گونگی ہے۔

خانصاحب۔ بس جناب بالکل ٹھیک۔ اس کو یہی مرض ہے۔ آپ نے فی الفور تشخیص کرلی۔

ننھے خاں۔ (نہایت دانشمندانہ طریقہ سے سر ہلاکر)
ہوں۔ ہوں۔

لطیفن۔ حکیم صاحب نے کیا جھٹ بیماری کو پہچان لیا۔

ننھے خاں۔ ہم نامور حکیم بات کی تہ کو فوراً پہونچ جاتے ہیں۔ ایک کم علم اور ناتجربہ کار معالج لغلیں ہی جھانکتا رہتا۔ کبھی کچھ مرض بتاتا کبھی کچھ عارضہ تشخیص کرتا مگر میں نے نبض کو چھوتے ہی مرض کا سراغ لگالیا۔ میں پھر ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ آپ کی لڑکی گونگی ہے۔

خانصاحب۔ بجا ارشاد ہوا۔ آپ یہ فرمائیے کہ یہ گونگا پن کس وجہ سے ہے۔

ننھے خاں۔ یہ تو بہت آسان بات ہے۔ وہ محض یہی ہے کہ اس کی طاقتِ گویائی سلب ہوگئی ہے۔

**خانصاحب۔** بہت خوب۔ میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ طاقتِ گویائی کس وجہ سے گم ہوئی ہے۔

**ننھے خاں۔** سب ماہرانِ طب متفقہ طور پر اس کی وجہ آپ کو یہی بتائینگے کہ زبان کے فعل میں رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے۔

**خانصاحب۔** میں جناب کی ذاتی رائے اس رکاوٹ کے بارے میں دریافت کرنا چاہتا ہوں۔

**ننھے خاں۔** اس کے بارے میں حکیم ارسطو........ بہت سی حکمت آموز باتیں کہتا ہے۔

**خانصاحب۔** خوب۔

**ننھے خاں۔** حکیم ارسطو فی الحقیقت بہت ہی بڑا عالم تھا

**خانصاحب۔** اس میں کیا شک ہے۔

**ننھے خاں۔** (اپنا بازو کہنی سے بڑھا کر) بہت بڑا شخص تھا۔ اتنا بڑا جتنا کہ میں (کہنی دکھا کر) اس سے بڑا ہوں لیکن اب نفس مضمون پر غور کیجئے۔ میری رائے میں مریض کی زبان کے فعل میں یہ رکاوٹ چند اخلاط کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ جن کو ہم حکما اپنی اصطلاح میں اخلاط فاسد کہتے ہیں۔ فاسد یعنی فاسد اخلاط مقام مرض میں تبخیر کی وجہ سے جو بخارات پیدا ہوتے ہیں جنہیں ہم اپنی اصطلاح میں کہتے ہیں۔ آپ عربی تو سمجھتے ہیں۔

**خانصاحب۔** جی نہیں میں بالکل کورا ہوں۔

**ننھے خاں** (نہایت تعجب سے اٹھ کر) ہیں کیا آپ عربی نہیں جانتے؟

**خانصاحب۔** نہیں۔

**ننھے خاں۔** چند تمسخرانہ حرکات کرتا ہے اور عربی کے چند مہمل اور ثقیل الفاظ بولتا ہے۔

**خانصاحب۔** افسوس میں نے کیوں علم نہ پڑھا۔ یونہی اپنی عمر برباد کی۔

**لطیفن۔** لقمان ہے۔ لقمان۔

**جمن۔** اس قدر قابل آدمی ہے کہ میری سمجھ میں تو ایک حرف بھی نہیں آیا۔

**ننھے خاں۔** اس طرح پر بخارات جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے دائیں طرف سے گذر کر جہاں جگر ہے۔ بائیں طرف جہاں دل ہے پھیپھڑے کی جانب جنہیں ہم عربی میں...... کہتے ہیں۔ جن کا تعلق دماغ سے ہے جسے یونانی میں نمس کہتے ہیں ...... کے ذریعہ سے جس کو یہودی اصطلاح میں کو بائیل کہتے ہیں۔ اپنی حرکت فعلیہ میں ابخرات مذکورہ سے ملتے ہیں جو کہ بطن اللوح میں ہوتے ہیں......... ازراہِ کرم ذرا غور سے سنئے........ اور چونکہ ان ابخرات میں ایک خاص قسم کا زہریلا اثر ہوتا ہے اس لئے ........ ذرا اس بات پر خاص توجہ دیجئے۔

**خانصاحب۔** جی ہاں میں غور سے سن رہا ہوں۔

**ننھے خاں۔** ایک خاص زہریلا اثر ہوتا ہے جس کی وجہ سے........ غور سے سنئے۔

خانصاحب - میں ہمہ تن گوش ہوں

ننھے خاں - جس کی وجہ ان اخلاط کی تلخی ہے.......
اور کچھ ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ یہ ابخرات......
آپ سمجھ گئے نہ۔ بس اسی وجہ سے آپ کی بیٹی کو یہ عارضہ لاحق ہو گیا ہے۔

لطیفن - حکیم صاحب نے کس خوبی سے وضاحت کی ہے

ممن - ہائے ہائے میری زبان کیوں اس طرح نہیں چلتی۔

خانصاحب - حکیم صاحب آپ سے بڑھکر فاضلانہ طور پر کوئی شخص دلائل پیش نہیں کر سکتا۔ مگر معاف کیجئے ایک بات مجھے حیران کر رہی ہے۔ اور وہ جگر اور دل کی جائے وقوع ہے۔ آپ ان کا وقوع بالکل مخالف جگہوں میں بتاتے ہیں حالانکہ دراصل دل بائیں جانب ہے اور جگر دائیں جانب

ننھے خاں - ہاں پرانے زمانے میں بیشک یہی حالت تھی۔ مگر اب ہم حکماء نے یہ نظام بدل دیا ہے اور بالکل مختلف اصول پر علاج کرتے ہیں۔

خانصاحب - بس جناب میری تشفی ہو گئی۔ معاف کیجئے ہم جاہل لوگ ان رموز کو کیا جانیں۔

ننھے خاں - آپ لوگوں کو ہماری طرح ہوشیار و باخبر ہونیکی چنداں ضرورت نہیں۔

خانصاحب - بیشک کوئی ضرورت نہیں۔ آمدم بر سر مطلب۔ اب فرمایئے کہ کس ترکیب سے لڑکی کو جلد شفا حاصل ہوگی۔

ننھے خاں - مشورہ تو یہ ہے کہ اسے پھر بستر پر لٹا دیجئے۔ اور دوا کے طور پر شراب میں روٹی بھگو کر کھلاتے جایئے۔

خانصاحب - یہ کیوں؟

ننھے خاں - اس لئے کہ روٹی اور شراب کے ملنے سے ایک خاص تاثیر پیدا ہو جاتی ہے جو گفتار کی موید ہے۔ کیا آپ کو بھول گیا کہ طوطے کو باتیں کرنا سکھانے کے لئے شراب میں روٹی بھگو کر دیتے ہیں۔

خانصاحب - بجا - بجا۔ بالکل بجا۔ واللہ آپ کی لیاقت اور قابلیت کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ ارے کوئی ہے۔ فوراً بہت سی شراب اور روٹی لے آؤ۔

ننھے خاں - میں شام کو پھر مریضہ کی حالت دیکھنے کے لئے آؤنگا (دایہ سے) دایہ تم ذرا ٹھیر جاؤ۔
جناب میں آپکی دایہ کو بھی کچھ دوا دینا چاہتا ہوں۔

لطیفن - کیسے؟ مجھے؟ میں تو بالکل تندرست ہوں۔

ننھے خاں - یہی تو خرابی ہے۔ بہت صحت بھی خطرناک چیز ہے بہتر ہوگا کہ تمہاری فصد لیکر کسی مسکن دوا کی پچکاری کر دیجائے تاکہ خون کا جوش کم ہو جائے۔

خانصاحب - یہ کیوں جناب؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تندرست آدمیوں کی فصد لینے کی کیا ضرورت ہے۔

ننھے خاں - جس طرح ہم پیاس روکنے کے لئے پیاس سے

قبل پانی پی لیتے ہیں۔ اسی طرح مرض کے سدِباب کیلئے پہلے ہی فصد لے لیجاتی ہے۔

لطیفن (جاتے ہوئے) اجی جاؤ۔ مجھے تمھارے مشورے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے جسم کو حکیموں کا دواخانہ نہیں بنانا چاہتی۔

ننھے خاں۔ اچھا تو تمہیں میرے علاج پر اعتراض ہے؟ بہت اچھا دیکھنا تو کس طرح راہِ راست پر لاتا ہوں۔ (خانصاحب سے) جناب اب بندہ رخصت ہوتا ہے۔

خانصاحب۔ ذرا توقف کیجئے۔

ننھے خاں۔ کس لئے؟

خانصاحب۔ اپنا محنتانہ لیتے جائیے۔

ننھے خاں۔ (اپنے جبّے کے نیچے سے ہاتھ بڑھا کر جبکہ خانصاحب تھیلی کھول رہے ہیں) اجی اس کی کیا ضرورت ہے۔

خانصاحب۔ جناب......

ننھے خاں۔ ہرگز نہیں۔

خانصاحب۔ ذرا توقف کیجئے۔

ننھے خاں۔ مطلق نہیں۔

خانصاحب۔ میری عرض قبول کیجئے۔

ننھے خاں۔ آپ تو دل لگی کرتے ہیں۔

خانصاحب۔ اب فیصلہ ہو گیا۔

ننھے خاں۔ آپ مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں۔

خانصاحب۔ چلئے بات ختم ہو گئی۔

ننھے خاں۔ میں طبابت حصولِ زر کے لئے تھوڑی ہی کرتا ہوں

خانصاحب۔ بجا ارشاد فرمایا آپ نے۔

ننھے خاں۔ خیر اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو کچھ چارہ نہیں۔ (روپیہ لیکر) روپئے کھرے تو ہیں۔

خانصاحب۔ بالکل مطلق فکر نہ کیجئے۔

ننھے خاں۔ میں کوئی طمّاع حکیم نہیں ہوں۔

خانصاحب۔ درست۔

ننھے خاں۔ روپیہ کا خیال کبھی میرے نزدیک پھٹکنے نہیں پاتا

خانصاحب۔ اجی یہ ناپاک خیال کبھی میرے دل میں نہیں گذرا

# سین پانچواں

ننھے خاں۔ (تنہا۔ روپیہ کو دیکھتے ہوئے) واللہ خوب مزے میں رہے۔ اگر.........

اصغر۔ جناب میں مدت سے آپ کا منتظر کھڑا ہوں۔ آپکی مدد کا خواستگار ہوں۔

ننھے خاں۔ (جھٹ اس کی کلائی پر ہاتھ رکھکر) اوہو۔ تمھاری نبض بہت خراب ہے۔

اصغر۔ جناب میں بیمار نہیں ہوں۔ میں اس لئے آپکے پاس حاضر نہیں ہوا۔

**ننھے خاں۔** اگر بیمار نہیں ہو تو کہتے کیوں نہیں؟

**اصغر۔** مختصراً عرض یہ ہے کہ میرا نام اصغر ہے۔ میں اس لڑکی کا چاہنے والا ہوں جسے آپ ابھی دیکھ کر آئے ہیں۔ چونکہ اس کے والد کی خوشنودی کی وجہ سے مجھے اس کے قریب پھٹکنا بھی نہیں ملتا۔ میں یہ درخواست کرنیکی جرأت کرتا ہوں کہ آپ برائے خدا میری مدد کریں۔ میں نے ایک تجویز سوچی ہے جس سے میں اپنی معشوقہ سے چند الفاظ کہہ سکونگا۔ میری تمام خوشی کا انحصار آپ کی مدد پر ہے۔

**ننھے خاں۔** (غصے کا بہانہ کرتے ہوئے) کیوں جی مجھے تمنے کیا سمجھا ہے! کیا میں کوئی دلال ہوں؟ تمہیں میری مدد کی درخواست کرنیکی جرأت کیسے ہوئی؟ میں کیوں تمہاری اس عشقبازی میں مدد کرکے اپنے پیشے کو ذلیل کروں اور اپنی حیثیت کو بٹہ لگاؤں؟

**اصغر۔** جناب خدا کے لئے غل نہ کیجئے۔

**ننھے خاں۔** غل نہ کروں؟ میں غل کروں گا۔ گستاخ بدمعاش کہیں کا۔

**اصغر۔** ذرا آہستہ بولئے۔

**ننھے خاں۔** بدتمیز کہیں کا۔

**اصغر۔** میں منت کرتا ہوں۔

**ننھے خاں۔** میں تم پر ثابت کروں گا کہ میں اس قماش کا آدمی نہیں ہوں جیسا کہ تمنے تصور کیا تھا۔ تمنے میری ہتک کی ہے

**اصغر۔** (تھیلی دیتے ہوئے) جناب......

**ننھے خاں۔** (تھیلی لیکر) اچھا تو تم میری مدد چاہتے ہو۔ میں بھلا ذکر نہیں کر رہا تھا۔ تم تو بہت ہی شریف الطبع انسان ہو۔ مجھے نہایت خوشی ہوگی اگر کسی طرح تمہارے کام آؤں۔ حقیقت یوں ہے کہ دنیا میں بہت سے بدسرشت انسان ہیں جو دوسروں کی نسبت نہایت غلط رائے قائم کر لیتے ہیں جس سے میری طبیعت میں اشتعال پیدا ہو جاتا ہے۔

**اصغر۔** میں اس گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔

**ننھے خاں۔** نہیں کچھ مضائقہ نہیں۔ تم اپنا مطلب بیان کرو۔

**اصغر۔** جناب واقعہ یہ ہے کہ صفیہ کی یہ بیماری جسکے علاج کیلئے آپکو طلب کیا گیا ہے بناوٹی ہے۔ کئی حکیموں نے ایڑی سے چوٹی کا زور لگایا ہے مگر سب کے سب مرض کی تشخیص میں ناکام رہے ہیں۔ کوئی اسے خللِ دماغ بتاتا ہے۔ کوئی جگر کا عارضہ سمجھتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ تلی کی خرابی ہے اور کسی کے نزدیک یہ آنتوں کا مرض ہے۔ غرضیکہ جتنے حکیم اتنی ہی رائیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ عارضۂ محبت ہے۔ صفیہ نے بیماری کا بہانہ محض اس شادی سے جس سے اس کو سخت نفرت ہے بچنے کیلئے کیا ہے۔ مبادا ہمیں کوئی اکٹھا دیکھ لے آیئے ذرا یہاں سے سرک جائیں۔

**ننھے خاں۔** بہت اچھا۔ تمہاری داستان سنکر مجھے تمہارے معاملے میں گہری دلچسپی ہوگئی ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر میرا علاج کارگر ہوا تو یہ لڑکی یا تو عدم کا راستہ لیگی اور یا تمہارے گھر کا۔

# نقد و نظر

**جامعہ** جامعہ مِلّیہ اسلامیہ کا یہ علمی و ادبی رسالہ ہر مہینے کے پہلے ہفتہ میں دہلی سے شائع ہوتا ہے۔ ادارۂ تحریر اسلم جیراجپوری و ڈاکٹر عابد حسین ایم اے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کاغذ عمدہ۔ لکھائی چھپائی پاکیزہ۔ سرورق دیدہ زیب اور خوبصورت مگر اسلامی شان سادگی کا ہر طرح حامل۔ سالانہ چندہ درج نہیں

ہم "جامعہ" کے متعدد نمبروں کو بغور پڑھتے رہے ہیں اور بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ "اُردو" اور "معارف" کی طرح یہ رسالہ بھی محض "قبولِ عام" کی خاطر اپنے معیار کی بلندی کو فنا کرنا نہیں چاہتا خصوصاً اس کے ردی تراجم اور تاریخی و دیگر محققانہ مضامین کا سلسلہ اس قابل ہے کہ عوام تو عوام خواص اس سے استفادہ کریں۔

پتہ:۔ جامعہ مِلّیہ اسلامیہ قرول باغ۔ دہلی

**دستکاری** چالیس بیالیس صفحات کا یہ ماہوار رسالہ زیر ادارت جناب ڈاکٹر شفیع احمد صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی مسلسل سترہ سال سے نہایت خوش اسلوبی اور پابندیٔ وقت کے ساتھ جاری ہے۔ اور بغایت کامیابی ملک و قوم کی خدمت انجام دے رہا ہے ہمارے خیال میں دستکاری پر اُردو کا یہ پہلا رسالہ ہے۔ زیرِ ریویو نمبر میں مضامین زیرِ عنوانات "دولت کے راستے" "فلسفۂ بخل و کفایت شعاری" "کھلونے بنانا" "پرفیوم بنانا" اور "سائنس کی کرشمے" نہایت مفید کار آمد اور غور سے پڑھنے کے لائق ہیں۔ ان کے علاوہ "سوالاتِ عام" اور "جوابات" کی سرخیوں کے تحت میں اُن استفسارات کو جو مختلف حصصِ ہند سے اڈیٹر کو موصول ہوتے رہے ہیں مع اُن کے جوابات کے درج کیا گیا ہے۔

عطریات اور دیگر مختلف اشیا کے نسخہ جات بھی مندرج ہیں۔ ہماری رائے میں رسالہ کو ابھی اور وسعت دینا چاہیئے۔ ضرورت ہے کہ ہندوستان کی قدیم دستکاری کو از سرِ نو زندہ کیا جائے اور اس موضوع پر بحث و مباحثات کے لئے مستقل عنوانات قائم کئے جائیں ہمیں امید ہے کہ شفیع احمد صاحب ہمارے استدعا کو جامہ عمل پہنانے کے لئے عجلت سے کام لیکر ہر ممکن کوشش عمل میں لائیں گے۔ اور گویا اس طرح یہ رسالہ ادبی دنیا کے صحافت

زیرِ ہندیث کا پیچیگر ہیں
میں بھی ایک نئے باب کے افتتاح کا باعث ہوگا۔

نفیس کاغذ۔ لکھائی چھپائی عمدہ سالانہ چندہ ۳ر

پتہ :۔ دفتر رسالہ دستکاری بلیماراں دہلی

## ہمارے رسول

موجودہ عہد کے انگریزی داں طبقہ میں جو بے دینی کے آثار پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں اُن کی جڑیں حقیقتاً بچپن ہی سے ہمارے "معصوم دلوں" میں مضبوط کردی جاتی ہیں۔ اگر رائج الوقت نصاب تعلیم کی بجائے ہماری شروع کی درس و تدریس کتب مذہبی کی مرہونِ منت ہوتی تو آج ہم کو ان ناخوشگوار نتائج سے دوچار ہونا نہ پڑتا۔ زبان اردو میں اس قسم کی کتابیں یا تو موجود ہی نہیں اور جو ہیں اُن کا عدم و وجود یکساں ہے۔ مکتبۂ جامعہ ملیہ نے اسی "مشکل کے حل" کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سیرۃ نبوی پر کتابوں کا ایک مفید اور قابل قدر سلسلہ شائع کرنا شروع کردیا ہے۔ "ہمارے رسول" اسی سلسلہ کی غالباً چوتھی کڑی ہے۔ خواجہ عبدالحیٔ صاحب فاروقی کا اسم گرامی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ جناب خواجہ صاحب نے جس کاوش اور محنت کو کام میں لاکر اس کتاب کو ترتیب دیا ہے وہ ہر طرح قابلِ ستائش ہے۔ مجموعی طور پر زبان بہت پاکیزہ سادہ سلیس اور صاف ہے۔ کہیں کہیں ذرا خامیاں بھی ہیں مگر وہ اس قدر کم اور معمولی ہیں کہ شمار میں آنے کے قابل نہیں۔ حقیقتاً بچوں کی تعلیم کے لئے اس سے زیادہ موزوں زبان اور ہو بھی نہیں سکتی۔ کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس حقیقت سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ پہلا اڈیشن شائع ہوتے ہوتے ختم ہوگیا۔ دوسرا اڈیشن بھی ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہا ہے۔ مدارس کے نصاب میں داخل ہو چکی ہے اور پنجاب اور یوپی کے مدارس اسلامیہ میں بھی پڑھائی جاتی ہے۔ حقیقتاً ایسی مفید اور جامع کتاب سے کسی مسلمان بچے کا بستہ خالی نہ رہنا چاہئے۔ قیمت پہلے ۸ر تھی مگر اب ۶ر کردی گئی ہے۔

ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ جامعہ ملیہ۔ قرول باغ دہلی

# اشتہارات

ھُوالکل

## آٹھ کروڑ مسلمانوں کا ایک رہنما

تمام داعیانِ اسلام اور جن کے قلب میں ملّت کا درد ہے۔ اُن کو معلوم ہونا چاہیئے کہ آٹھ کروڑ مسلمان اس وقت تک مرکز پر جمع نہیں ہو سکتے جب تک کہ اُن کا ایک رہنما نہ ہو۔ اس لئے تمام داعیانِ اسلام کو چاہیئے کہ اپنے علاقہ کے تمام سیاسی اور غیر سیاسی اور علماء و مشایخ اور امراء اور ملّت کا درد رکھنے والے اصحاب کی ایک فہرست مع پورے پتہ کے ارسال کریں۔

داعیانِ اسلام کا فرض ہے کہ نہایت سرعت سے کام کریں۔ اعلان پڑھنے کے بعد ایک منٹ کی تاخیر ایک سال کی دیری کے برابر ہوگی۔

خادم کشفی شاہ نظامی۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۲۶۔ رنگون

## ہندوستان کو جاپان بنا دو

انگلینڈ۔ امریکہ۔ جرمنی۔ فرانس۔ اٹلی کی بڑی بڑی مشینوں کا مقابلہ اپنی انگلیوں سے اور میلوں لمبے کارخانوں کا بانس کی جھونپڑیوں میں بیٹھ کر جاپان نے کیا تو وہ مہذب ملکوں میں شمار ہونے لگا۔ حالاں کہ جاپان کا رقبہ ہندوستان کی ایک چھوٹی ریاست کے برابر بھی نہیں اور ہم ہندوستانیوں کا کفن بھی غیر ملک سے بن کر آتا ہے۔ اس لئے یہ ملک غلام رہنے ہی کے قابل ہے۔

## اب اگر سورلج مل گیا

تو ہم تعزیراتِ ہند اور ضابطۂ فوجداری کی چند دفعات میں تبدیلی کرنے کے علاوہ موجودہ ان ضروریات کے لئے غیر ممالک کا ہی محتاج

انٹرمیڈیٹ کالج میگزین

رہیں گے کہ جن کی عادت ہمیں موجودہ روشنی نے ڈال دی ہے۔ اس لئے آج ہی آپ رسالہ دستکاری بلیماران دہلی سے ماہوار پرچہ جاری کرا لیجئے۔ جو آپ کو انگلینڈ۔ امریکہ۔ جرمنی۔ جاپان کی نہایت خفیہ دستکاریاں سکھا کر دولت مند بنا دے گا۔ آج کل سالانہ چندہ پانچ روپیہ کی بجائے تین روپیہ کر دیا گیا ہے۔ نمونہ کا پرچہ مفت نہیں بلکہ چار آنہ میں ملتا ہے۔ سال بھر کے رسالے حفاظت سے جمع کرنے صرف محصول ڈاک ادا کر کے دوسرے سال مفت رسالہ جاری کرا سکتے ہیں۔ کیوں کہ ہمارے ہاں پرانے رسالوں کے خریدار ہمیشہ موجود رہتے ہیں ہ

لو جان بیچ کر بھی جو علم و ہنر ملے
جن سے ملے جہاں سے ملے جس قدر ملے

## منیجر

## رسالہ دستکاری

بلیماران۔ دہلی

give them bread twice a day and to make India free and prosperous. That was not possible unless India had attained complete independence which would not be brought by the knights of the Round Table as a gift from Britain but would be bought at the price of pure Indian blood. Concluding he said that Freedom comes from within and never from without. After an appeal to the members of the house to keep up their traditions of nationalism, he retired.

He was followed by Mr. Mohamed, the (non-official *Leader of the Central Loyalist Party*. He made a brilliant speech and his critiism of the proposer and his followers was very trenchant. He held that the salvation of the Muslim Community lay in the Round Table Conference where, he was sure, leaders like Maulana Mohamed Ali can safeguard Muslim interest. Mr. Ahmad Abbas too received his due share of the criticism and at least I who had been carried away by his sentimental appeal now went over to Mr. Mohamed's side. After an appeal to the house to place Muslim interests before national interests, he retired.

A number of speakers followed him who made more or less good speeches. The only noteworthy speech was that of Mr. Ansar who spoke against the motion.

For a 9th Class student, his speech was really remarkable. We must advise him, however, to be a bit more courteous, when referring to persons whom his opponents honour and respect. If he keeps on speaking and cultivates a habit of reading extensively, I hope he will one day become an ornament of our Union.

The rejoinder was short but the Hon'ble proposer was able to refute almost all the arguments of his opponents. A heated controversy arose as to the truth of his statement that all the members of the Round Table Conference are servants of the Government. The Proposer explained that by the word servant he meant one who would obey the orders of the Government. But Mr. Mohamed objected to it on the ground that a man can be called a servant only when he receives money from the Government. Mr. Abbas, however, came to the rescue of the Hon'ble Proposer and informed Mr. Mohamed that if that was the only definition of a servant then Mr. Noman was right because the members of the Round Table Conference are getting 21 shillings a day from the Government.

After the rejoinder, when put to vote, the motion was lost.

Conference was Dominion Status and now even that is doubtful. The members of this Conference, he remarked, are either title-holders or self-styled leaders with no following among the masses of India The princes who are supposed to be representatives of the States have no sympathy with the national aspirations as they have to justify their own primitive and inhuman rule. He referred to the various demonstrations against the members of the Conference and went on to prove that the members of the Round Table Conference do not represent nationalist India but only the *die-hard* section. Concluding he said that (1) the Conference cannot even recommend complete independence for India (2) that it is composed of self styled leaders who belong to the die-hard section of Indian politicians and lastly that the real representatives of India like Mahatma Gandhi, Pt. Jwaharlal and Abul Kalam Azad being absent, it is not in a position to solve the Indian problem.

Mr. Noman is one of the promising speakers of our Union and deserves congratulations on coming forward to propose a subject in the Union. He has a fairly good vocabulary and a good command over the language. An extensive study, however, would greatly help him in improving his style and language.

The opposition was to be led by Mr. Nafis Ahmad—the professional leader of opposition but owing to indisposition he could not speak. He had, however, requested (and also lent his cap to) Mr. Zahir Kureishy to speak for him. Everyone including myself was astonished to see him supporting the cause of the R. T. C. but he hastily explained that it was more to please a *sick* friend than a *healthy* conscience that he took his stand on that side. This was also evident from the short speech that he delivered. He was standing on one side, but was advocating the cause of the other and his words accorded with neither.

Mr. Kh. Hamid Hasan who spoke third, made an extremely interesting and emotional speech. He referred to the various occasions when the Englishmen had not kept their promises and said that this Conference would result in nothing. The only purpose of the Round Table Conference, in his opinion, was to divert the attention of the Indians from the non-violent war they are engaged in.

Then came Mr. Aftab Ali Khan who spoke for the proposition. It seemed as if he had come without adequate preparation. He being an old speaker, we expect from him well prepared and interesting speeches which may serve as an example to the new speakers.

Mr. Ahmad Abbas, naturally, spoke for the proposition. He said he was surprised to see Mr. Zahir on the side opposite but that his speech had clearly proved that he was not at all *serious*. About the members of the Round Table Conference, he said that neither Indians nor Englishmen were taking them seriously. Their own countrymen had openly called them traitors to the national cause and the Englishmen had shown their regard for them by not giving them any *lift* at a London Air-craft display. The Indian problem was to better the wretched condition of the masses, to

# FROM THE GALLERY

**By Critics.**

The first debate of this term was held on Sunday, the 26th October, at 8 p.m. when Khwaja Ahmad Abbas proposed that, "Parrallel institutions are essential for the attainment of India's complete independence." It was disappointing to note that the students in majority did not care to attend even the first debate of the session. The subject was an interesting one and the Hon'ble proposer might have dilated upon it at length but he very wisely *cut short his speech according to the number of the audience*—which was deplorably poor.

In a lucid though short speech he said that the establishment of parallel institutions was essential for the independence of a subject nation, that they had been successful in Ireland and there was no reason why they should not be successful in India.

It is necessary, he remarked, to train the people of India in all the aspects of a truly democratic state before we make India self-governing and free and it is only possible if the parallel institutions are established in India.

The opposition was led by Mr. Nafis Ahmad, who swept everything that came before him and it seemed as if he had shattered entirely the case made by the proposer. There was not much, however, in his speech except loud voice and sentimental and attractive gestures, and his only argument was that as the parallel institutions had been introduced by the Congress which, he said, was "anti-Muslim" and so they were not essential for the attainment of India's independence. A curious argument, indeed!

He was followed by a number of speakers who made more or less good speeches. The most interesting speech was that of Mr. Raja Ali Mohammed who, standing on the right side of the house, talked about everything including the Viceroy's Visit, the picketing of Colleges and the money granted to the University by the Government but took care not to utter a single word about the "parallel institutions".

The reply ler was short and the only point which the Hon'ble proposer wanted to clear, was that the question as to the Congress was irrelevant and that the parallel institutions were necessary to win every war of independance started by any one at any time.

The motion was put to vote and was rejected. One wonders, how?

A very interesting debate was held on Monday, the 17th November when Mr. Noman Zoberi proposed that, "The Round Table Conference cannot solve the Indian problem." He began his speech with a pathetic description of India's poverty, ignorance and exploitation. To remove these miseries of India, is the real Indian problem. The time had passed when Indians would have been content with Dominion Status, now they are fighting for nothing less than complete independence. The best that could be expected of the Round Table

# NEWS AND NOTES.

Our Vice-Chancellor, Dr. Syed Ross Masood returned from Europe on 1st November by the evening train via Delhi. The time of his arrival had been duly notified and long before the train was due one could see a "flood" of Black Coats and Red Fez on the platform. The train steamed in about five minutes late and when it stopped all surrounded and rushed into his compartment to meet and garland him and to "shower" torrents of rose petals on him. The compartment had been decorated like a "bride" with flowers and garlands before the departure of the train from Delhi by *Wilayati, Afghani, Hyderabadi, Kashmiri* and *French* friends.

Profusely garlanded—upto suffocation and choking, with a bright and beaming smile he alighted from the train amidst constant and deafening cheers and a procession was formed headed by the Police Band hastily, proceeding with a dignified and measured gait towards the Hathras Gate where his car had been 'stationed.' He met every one and gave us surprises by addressing us by our names. Outside the Station our University Riding School Squad furnished the guard of honour and he was very pleased to meet the young *cavaliers.*

A procession of cars was formed with the Riding Squad escorting his car followed by a dozen others. It proceeded very slowly not because the mud guards of the Vice-Chancellor's car were over loaded and over-flooded by students but because the "rush" of eager admirers and friends necessitated it. When counselled to walk apart they protested that they had not seen him for six months and were not prepared to deny themselves the pleasure of seeing him for a longer duration on the road. And when some one remarked that the car would collapse or break they answered that they would replace the same by a *Rolls Royce.* It looked like the "elopment" scene from some American Film. When the Vice-Chancellor himself realized it we could understand why his compartment had been "decorated and beautified" at Delhi. It was a pleasure for the "squad" to escort the procession up to the residence of Dr. Masood. His patience was not, however, taxed or exhausted.

The P. V. C., Provosts, Principal, and the Proctor, deserve credit for the excellent arrangement and organization of the reception.

---

Dr Giotto-Dainelli of Italy and the leader of the Karakoram expedition together with two other members, Miss Cabie and Mr. Hashmatullah Khan recently paid a visit to Aligarh and were the guests of Lt. M. Haidar.

The learned doctor, addressing the members of the C. Geographical Society, gave an account of his recent investigations of Karakoram glaciers and its geological formations. He was glad to have found the missing link in the geological sequence of rocks which he could not do during his last expedition, 14 years back. He was satisfied with the success achieved by his expedition party, the members of which he praised and eulogized.

The Pro-Vice-Chancellor, Mr. Martin congratulated and thanked the learned doctor on his success in adding to our knowledge.

and illustrated in black and white by Joyce Denny's. Joyce Denny's work in "The Sketch" and other papers is well-known. Here she has satirised the troubles and difficulties of a doctor's wife with a great deal of underlying truth and no little humour. It is essentially a Christmas gift book for all classes.

Crown 8vo 5s. net.

Messrs. John Lane The Bodley Head Limited published on October 31st, a new novel by Mrs Francis Brown, author of "Margaret Deshwood", entitled SUSAN PRICE or RESOLUTION. Mrs. Francis Brown's first experiment in Jane Austen pastiche last year was certainly a success and she has now followed it up by taking a character from "Mansfield Park" and writing a book around her in the same manner. It is a charming story and should be as popular as her first book.

Crown 8vo. 6s net.

The Library Association, Lahore is publishing from this month "THE MODERN LIBRARIAN", a monthly journal of All India Library Service. It will publish news of interest for the Library workers and Library readers and will guide them to make progress in their own sphere. Libraries in India will have ample opportunity of advancing on modern lines and some sort of uniformity will prevail among them

With Dr. Mowbray Velte, M A, Ph. D, and professor A.K Sulhanta M. A, S. F M., as Chief and Managing Editors respectively, the success of the journal is assured.

Its annual subscription will be Rs. 2-4-0. We welcome the idea of the Association and shall be glad to render every help to our contemporary in its laudable and useful work.

## A MERE FACT.

**By Hamid Hasan.**

Mr. Peir Pont Morgon was an American Multi-millionnaire, who had purchased a very large number of trading ships of England for three hundred million pounds and had put them all in the Pacific Ocean. Sometime afterwards on a boat going to America, while crossing the Pacific Ocean, an English man asked an American, "What ocean is this." The American replied. "It used to be called Pacific Ocean, but now it is only a pond belonging to Mr. Pier Pont Morgon.

Muriel Hine's new novel is essentially a modern story and tells of ten consecutive days in the lives of her charaters, each day being treated by itself. It may seem incredible that so much in the way of engagements made, broken and remade could have happened in so short a space of time, but Muriel Hine's art not only makes this seem convincing but also compels our interest and sympathy with her characters in the situations in which they find themselves.

Crown 8vo. 7s. 6d. net.

On November 7th, Messrs. John Lane The Bodley Head Limited published THE SHORT STORIES OF 'SAKI' (H.H. Munro) complete in one volume, with an Introduction by Christopher Morley. "Saki's" wit and clever cynical humour have placed him in the front rank of modern writers of his class. Those who know their "Saki" will welcome a complete volume of his stories of over seven hundred pages, printed on thin opeque paper and in a handy size. Those who do not will find no better investment among the omnibus volumes of to-day.

Crown 8vo. 7s. 6d. net.

On November 7th, Messrs. John Lane The Bodley Head Limited published a further volume in The Collected Works of Lt.-Col. Sir Reginald Bankin, Bt. A TOUR IN THE HIMALAYAS AND BEYOND. This book has never beed bublished before and is a record of a trip through the Himlayas in 1898. Further volumes in this Collected Edition will be published shortly.

Demy 8vo, 12s. 6d. net.

Messrs. John Lane The Bodley Head Limited published on October 31st, TINKER, TAILOR—, An Account of a Journey round the world for a wager, by 'Greenhorn". The author of this book, who was in poor health after the war, accepted a bet from a friend that he would not work his own passage right round the world in five years without receiving any money from home. He won the bet and here tells us the story of those five years how he worked in lumber camps, mines, sailing ships, and tramps, how he was a sheep farmer in Australia and in a North West Mounted Policeman, how he worked his passage as a plate boy in a third class liner and as a steward in an emigrant ship until his final return to England. It is a story of courage and endurance.

With illustrations from photographs.

Crown 8vo. 8s. 6d. net.

On October 31st, Messrs. John Lane The Bodley Head Limited published a new edition of THE RED LILY by Anatole France with twelve full-page illustrations in photogravure and numerous smaller illustrations in black and white by Donia Nachshen. Anatole France's masterly study of love and jealousy has attracted the talent of a young book illustrator, whose work is certain to receive attention. It has insight and imagination and whether in the vein of irony, wit or passion, her drawings are always intensely alive.

Medium 8vo. 16s. net.

On October 31st, Messrs. John Lane The Bodley Head Limitted published MRS. DOSE THE DOCTOR'S WIFE written

# LITERARY NOTES.

Messrs. John Lane The Bodley Head Ltd. have published in October THE GLORY OF BRITAIN by David Masters author of "The Romance of Excavation," etc. The author has endeavoured to state in this book with absolute frankness how much the peoples of the earth owe to Britain for the marvellous inventions, striking medical discoveries, the ideas which have helped to sweep away slavery, tyranny and intolerance for her literature, justice and forms of government. The author is outspoken and controversial on many subjects of burning interest at the present moment but few will read this book without realising what British brains and hands have done for modern civilisation.

Fully illustrated. Crown 8vo. 8s. 6d. net.

In October Messrs John Lane The Bodley Head Ltd. have published KATINKA a new novel by Irene Forbes-Mosse, author of "Don Juan's Daughters," translated from the German by Oakley Williams. Those who remember and enjoyed "Don Juan's Daughters" will find the same qualities of subtle and graceful literary style and distinction in this new book. Its heroine is a little stray, grey cat whose fate is interwoven with another feline, though human, waif and stray, Katchen Pelzer, until the identity of the one becomes almost merged in that of the other. Both are sinuous, insinuating and fascinating, both inevitably come to a bad end. The story is enacted against the sombre background of the years of the War and reconstruction period.

Crown 8vo. 7s. 6d. net

Messrs. John The Bodley Head Ltd have also published THE GONE AWAY a Romance of the Dales in Three Acts by Dorothy Una Ratcliffe with illustrations in colour and black and white by Charles Simpson. Mrs. Ratcliffe is well known as a writer on Yorkshire and Yorkshire life and her new play is set in Yorkshire of the mid nineteenth century. It is a play of hounds and hunting with a very original scheme and full of dramatic force.

Crown 4to. 10s. 6d. net

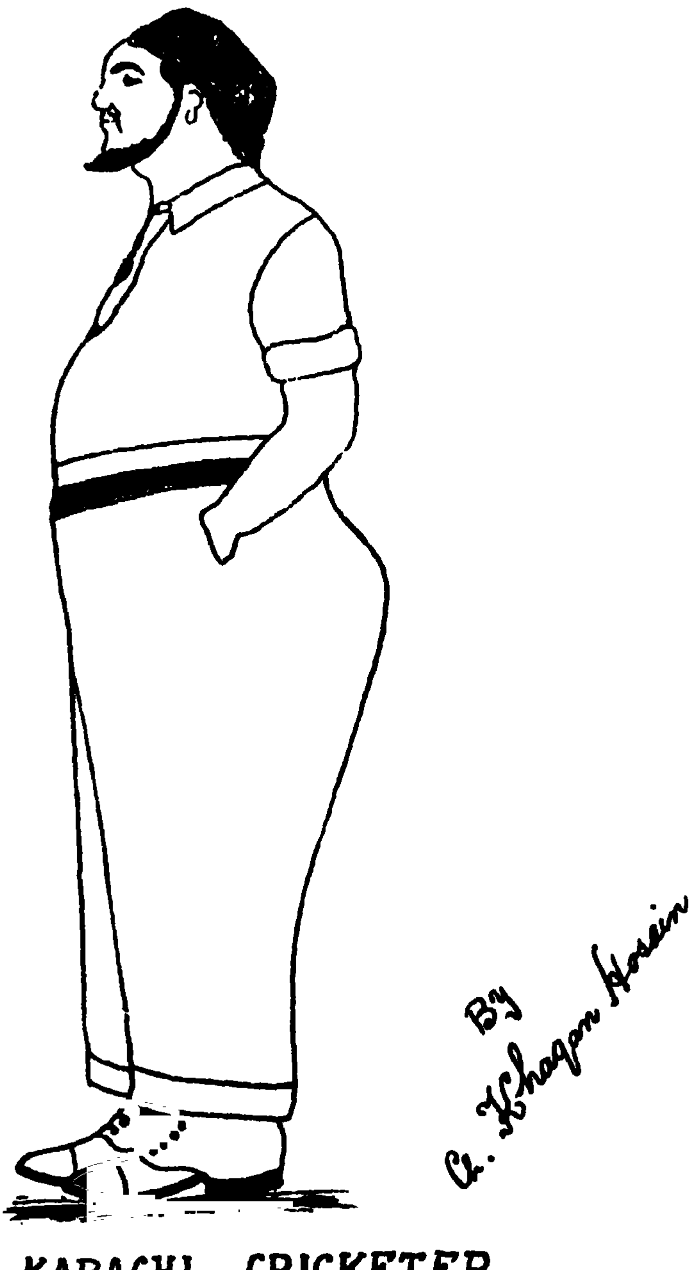
Messrs. John Lane The Bodley Head Ltd have published in October A HIGHLAND COOKERY BOOK by Margaret Fraser with an Introduction by the Marquis of Northampton. Compiled by a Scottish stalker's wife, who has been a cook all her life, this book will appeal to all cooks and housewives who wish to know the best way of cooking game, venison, trout, oatcakes, etc.

Crown 8vo. 2s. net.

Messrs John Lane The Bodley Head Ltd have published a new volume in their Week End Library, namely WORKS AND MORE by Max Beerbohm.

Foolscap 8vo. 3s. 6d. net.

Messrs. John Lane The Bodley Head Limited published on November 7th, TEN DAYS' WONDER, a new full length novel by Muriel Hine. Miss




A "YOUNG" KARACHI CRICKETER.

tribution. Selection of actors was made and parts were allotted to them It is proposed to start Rehearsals very soon. The Secretary, Mr. Zaheer Baber Kureishy hopes to "smash" all previous records of amateaur plays. Let us wish him every success in his efforts provided they are "serious." Just when we are correcting the final proofs, we are informed that "Pompey the Great" has been replaced by "Great Catherine" and "Augustus Does His Bit". *Said-e-Havas*, an urdu drama, will also be staged. We hope it is a change for the better

## Cricket Club.

Mr. Rafi is very enthusiastic about "pickups" and net practice. Our College XI takes part in the matches played on the famous "cricket lawn." The Captain is a very reliable "bat" (we hope the word is not ambiguous). We have yet to witness 'thrills' in his game this session. He and his players contributed their quota towards defeating the Karachi XI the other day, and the Punjab University selected on 17th, 18th & 19th November.

## Hockey Club.

The Club has been very active this term. In addition to daily "pick-ups" several matches have also been played. We defeated the Agra Medical College team on the University field by 6—0. Our College and University combined XI met the Delhi University selected on Sunday 9th November and the guests accepted our hospitality of a defeat by 2—1. They, however, showed commendable 'sporting spirit and were all along cheered and applauded by the spectators. Their *goalie* stood like a wall in the goal and it was not an easy thing for our "forwards" to score. We have to mention that Messrs. Omar Osman, Ismail, Aziz and Wasi Khan put up a very good show and 'played the game.' They are, however, capable of something more and we look forward to another opportunity to see them in their elements. We congratulate Mr. Wasi and Sirdar Aziz on a series of victories and successes.

When this goes to press we are informed that our XI defeated the Karachi and University Cricketers by one goal.

## Tennis Club.

Tennis is attracting more "admirers" than other games this term. The "rush" of players has resulted in the opening of two new courts. It is now possible for the members to play at least two sets every day. It is gratifying to note that the Secretary and the Senior players are engaged in the laudable work of coaching the "beginners."

Mr. Masood Ali Tahir and his partner Mr. Hamiduddin played for our College against the Delhi University "pair" on our own courts. The match, however, resulted in a draw. We wish our "heroes" better luck next time.

## Football Club.

Just when we are correcting the proofs we are informed that the football club has started 'kicking.' On the 14th November it defeated the Meerut College team by two goals. We congratulate Mr. Toosi for this victory and hope we will have many more occasions for it.

# OUR SOCIETIES AND CLUBS.

## Geographical Society.

A meeting of the Society was held on Saturday, the 8th November in the sixth period in the Geography room. Mr. Kadri delivered a very illuminating and interesting lecture on "The influence of State on the Commerce of a country with special reference to the Indian Commercial Geography." The meeting was well attended and the members found the lecture instructive. We congratulate Mr. Nafis, the Secretary for holding several successful meetings but is it not possible for some members also to read papers on Geographical subjects?

## Arabic Society.

The Secretary informs us that during the month one meeting was held in which Mr. Mohamed Wasil read an interesting paper on *Abul Ataiya*, the great Arabic poet. The Arabic Society is certainly the most active of all the Societies and Mr. Alvi, the President, Mr. Akhtar Imam, the Secretary, and all the members deserve our congratulations for holding so many successful meetings.

## Social Service League.

Mr. Kh. Hamid Hassan, the enthusiastic Secretary, reports that upto this time the members have treated more than 350 patients and disinfected about fifty wells. He intends to arrange lectures on first aid which would be of great practical help to the members.

## Logic Society.

It is no more true that the Logic Society is deep in meditation. On Saturday the 8th November, a meeting of the Society was held in the 4th period when Mr. Yakub Beg Naim lectured on, "How to study Logic in the Intermediate Classes." The lecture was very interesting and instructive for the Logic students.

## Urdu Society.

Mr. Akhtar Imam deserves our congratulations for arranging an extremely interesting *mushaera* on Sunday the 9th November. Mr. Mohammed Haziq, the well known poet of our College presided. A great many, serious as well as humorous, poems were read. Mr. Omar Ali Siddiqi got the Secretary's medal for the best poem. Mr. Tahir Zoberi's humorous poem was much appreciated and applauded and Sardar A. Aziz Khan promised him a medal.

In the end Mr Haziq delighted the audience with his beautiful poetry. This successful function came to a close late at mid-night.

## The Dramatic Society.

A preliminary meeting was held in the College Staff room on Monday 10th November with Mr. Syed Wali Mohamed in the chair. Messrs. Abrar Husain Kadri, Moinul Haq and A. A. Puri were also present. After some discussion it was decided to stage "Pompey the Great" on the occasion of the Annual Prize Dis-

Gay Fawkes Day, and Divali, in India. Instead, they would be packed with chemical gases, liquid fire, shrapnel or smoke-producing powder.

## Robot directs traffic.

Robot will henceforth stop or beckon on the streams of traffic through and across Ludgate circus, in London. Eight automatic traffic signals have been installed, two on each of the four sides of the circus. They consist of upright posts with three glass indicators, which are lit up from within. The top indicator is red and means "stop"; the third green, meaning "come on," the second merely indicates that a change in the traffic directions is about to be made. These eight signals are all worked by one policeman; who stands on a wooden box, pulling the various levers which control the indicators

## A human bird.

An Austrian inventor is of the opinion that one day people will be able to fly just like birds. He has invented a flying jacket which is worn strapped to a person's back. Two vertical propellors stick up above the wearer's head and a metal helmet protects the head. At the back is a small engine run electrically with weights at the front to counter balance the weight of the engine. The problem before the scientists is how to guide and control this flying jacket. It will be no use if the flier just rises straight up like a baloon until he reaches the moon or loses his balance. If this scheme is successful anyone could buy it in future which ought to be as easy to win and ride as the bicycle is today.

## Seeing music.

A machine has recently been invented which makes it possible for speakers, singers and musicians to see the sound waves they produce The waves are transmitted by a radio microphone to the machine which is called Osiso. Then by means of a powerful light they are reflected on a screen on which the sound waves arrange themselves in patterns. The patterns produced by each speaker are different This invention is very useful in music Schools, where the pupil can compare the waves produced by the teacher with his own and improve accordingly.

## Tomapotato.

Tomapotato is the name of a plant which produces potatoes at its roots below the ground and tomatoes on its stalk above the earth. It took full twenty years of experiment for Mr. Oscar Soderholm, foreman of a greenhouse at Worcester, to develop this curious plant.

In grafting this queer plant, Soderholm starts by planting a piece of potato in the ground and tomatoe seeds in a pot. When both grow to vines he makes cuts diagonally across each, matches them and ties the grafting with a cord.

viceous circle and soon finds himself landed into a comfortable berth. Might crushes right in broad day-light and right dies unwept, unhonoured and unsung. That is all what the poet has called "بے سلسلہ می رقصند" One is only degrading himself if he is inclined to dance to the tune of such iniquities. He will then be not only wasting his time and his energy, but also actually playing into the hands of the Devil.

---

# SCIENCE AND INVENTION

## Door opened by a Shadow.

An automatic sliding door that opens and closes without conscious human effort has been perfected in the laboratories of the General Electric Company at Schenectady, U. S. A. A person walks towards the door and when he approaches within the proper distance it opens, lets him pass, closing only when he is inside or outside. Hotel waiters and others who carry burdens in their arms need no longer struggle to hold the door when such an installation has been made. A photo-electric cell does the work for them. A ray of light is focused past the door threshold on a photo-electric cell. This ray, when interrupted by the body of a person approaching the doorway, sets an hydraulic device which is somewhat similar to that used in "tube" carriages for closing the doors. The tube is connected so that it controls, by a three tube ampliger, an automatic relay, which in turn starts a small motor that operates the hydraulic device. A lever then forces the door open and "holds" it for a period of time, adjustable to the varying conditions under which the door may be used.

## Radio to Foil Pirates.

A radio robot to fight pirates infesting the South China seas has been conceived by an inventor of Hongkong. A wireless alarm, easily fitted to any vessel, starts broad-casting distress in case of a pirate attack. The alarm has a radius of several hundred miles. It connects with buttons on the bridge in the engine room and at other accessible parts of the ship. By pressing any of these buttons a signal of alarm, with the name and position of the ship, is radioed continually.

## A Skyrocket War.

The next war should prove the delight of small boys for it will be fought, in part, with Skyrockets. European engineers in France, Italy and Germany are experimenting with highly explosive skyrockets in an effort to find some means of propelling explosives, accurately, through the air without using cannons. General Staffs are convinced that cannons will soon be obsolete. They are too clumsy to move, too easily damaged and too costly to furnish in vast quantities. Skyrockets need no cannons for firing, can be stood on the ground, touched off and landed within a certain area by regulating the amount of powder charge. The army Skyrockets would not be filled with coloured stars and pretty sparks as are those used on

# SIDE LIGHTS ON HAFIZ

**By Maulana Azbar Ali Azad.**

صد باد صبا اینجا بے سلسله می رقصند
این نسه حریف ایدل تا باد نه پیمائی

The above couplet from Hafiz was referred to me by an esteemed friend the other day. I was informed that another reading of the text gave "باسلسله" in place of "بے سلسله" "in the first line and" "طریق" for "حریف" in the other line. Also that the couplet was referred to Sir Iqbal, who was pleased to suggest the substitution of "بادیه پیمائی" for "باد نه پیمائی"

I am afraid I cannot afford to accept either view. I consider the text as it stands on top, reliable. The only inaccuracy I am able to discover is the absence of او، between "این نسه" and "حریف" That may have been due to the printer's devil. I think the insertion of the اوز there may not only clear the whole mist, but give us a far more poetic reading of the couplet that no sound taste can afford to sacrifice.

There are a hundred and one charms and attraction in this world. They have no method, no system, no harmony. Sometimes they come to you, one by one, from different directions. Sometimes two or three come together from one and the same direction and two or three from another. At other times they come up all together. There is no knowing when or from what quarter what unexpected things will come up all of a sudden, when you are in no way prepared to face them. It is these that you have to think of, as also of the "حریف" the Devil, who is always busy, laying these snares for you.

"تا" "Beware of these temptations. "تا باد نه پیمائی" is to harmonise with "باد صبا" above. If you fall a prey to these charms and attractions, you are not worth your salt. You are a man and placed far above other creatures in existence; and you have to demonstrate to the world that you have a backbone. The charms and attractions as aforesaid may, for instance, be the charms of a sweet girl, or, stand for wealth, for power and such other earthly things that can have no value in the eye of a philosopher or a saint ("درویش") Let us take another view of the case.

There are method, system and harmony, so far as the laws of nature go. But no such system and regularity appear to regulate the happenings that we experience in life here everyday. We have to meet iniquties here almost at every turn. For instance, virtue is not always triumphant, vice is not everywhere crushed. We always hear it said that honesty is not in all cases to be the best policy. It is a trite saying that Fortune is blind. What was true in the days of the Great Hafiz, is literally true in a number of cases even to-day; and we are not very wide of the mark if we sing with him

ابلهان را همه شربت زگلاب , قند ست
قوت دانا همه از خون جگر می بینم

It is a matter of our common experience that a viceous man creates, in time, a

centration This will enable what to know and what to say You already know how to say it. A still more practice will help you to learn how to say that you have said it.

It is a misconception that you do not require much preparation for an Urdu debate. I suppose you do, perhaps more than you need for an English debate. The reason is obvious There are not many books yet in Urdu, which you can consult for your knowledge and information. Urdu literature and reference books are yet in the making Naturally you have to consult relevent books in English and it requires a cultivated skill to render the gist of your references and notes into Urdu without previous and thorough preparation.

You must always know what you mean, and say what you mean and mean what you say. Remember that the audience can atonce detect what you do not know even if it does not know how to appreciate what you know."

At this stage my servant Chhotey woke me up with the pleasent news that my "*nashta*" was ready. I needed a good breakfast after the strain and fatigue resulting from a lengthy speech to brace me up for the whole of the day. It is difficult for me to feel the same interest in the midday meal supplied by the Dining Hall, I don't, however, miss dinners. After my nashta I came to the College and Mr. Crone told me that he had also dreamt that I was delivering a speech, of which he was taking notes 'in the gallery.'

Students, however, were not present in our dreamland. Hence both of us chummed up to reproduce this speech for them and the columns of our magazine

---

## PATRIOTISM.

How can man die better
Than facing fearful odds,
For the ashes of his fathers
And the temples of his Gods?

of the speech at its various stages We must cultivate in reality, declamation or a vigorous sonorous delivery. This is however, not the end but only a means to gain the end. Force is necessary for a good and sucessful speech. But this can be obtained in other ways also, say, by having a mind behind the words or "putting life" in the speech.

Francis, in his "Orators of the Age" has said about Macaulay that in the House of Commons he used to rise or rather dart up from his seat when an opening was made in a discussion and plunge himself atonce into the very heart of his subject without exordium or apologetic preface. Thus he used to import "force" in his speech. I cannot recommend this to you all, for only a skilled speaker can acquit himself well in this practice. Youngmen are apt to start with a high pitched voice—monotonous and rather shrill and go like an express train, which does not stop even at the chief stations. This is bound to bring disaster at the very outset. This is to court a collapse. You come to the dais not to "show" but to "score" and this you cannot do unless you impress your audience. If you follow Macaulay you cannot do so. Matter and convincing exposition and persuasive manner of speech cannot be denied to a good speech. It is no good "blowing" a thunderstorm to sweep clean and instead of leaving "impression" behind, carry everything with it—even "prepossessions."

You are required to understand your subject and theme and then to:

1. State your case.
2. Clear your case.
3. Prove your case.
4. (In a rejoinder) to clear points misunderstood.
5. Sit down at the proper time.

or

in other words, your duty as a speaker is:

1. to say what you have to say.
2. to say it.
3. to say that you have said it.

For this purpose, you require language, *voice and breath* and complete mastery and control over them. You have to speak in that language which your audience can understand, in the voice that is clear and audible and in that breath that can stand you to the last and not fail you in the middle of a speech.

You may, perhaps, question me about matter in a speech and how to prepare it. How to consult books in the Library and how to utilize the knowledge gleaned from books are questions which I am sure you will not ask me for I suppose, you know all this. You can read and observe for yourself, think over what you have read and assimilate it. You have then to "chew the cud" to weave out a speech. You either write your speech out or prepare a "brief" of the same.

You need not cultivate the habit of committing your speeches to memory but must develop confidence and reliance in yourself and your readiness of wit. But when you have not much time at your disposal you should try to consult the Table of contents of the books on your subject and find out portion relevent to your purpose. You may then take notes and imbibe them. For thinking over a subject you must have a clear head and con-

very different way producing its own atmosphere. In fact it will succeed precisely in so far as it becomes an embodiment of all that is best in the national life and not a mere replica of Western institutions. *The ideal one does set before an Indian university is that it should be a place where sound learning flourishes, that it should be dignified and beautiful in its external surroundings and its inner life that it should be able by its atmosphere and traditions to win the affection and gratitude of its pupils and that the good influences it imparts to its students should permeate through them to a wider circle and inure to the good of India as a whole.*

---

# A SPEECH IN A DREAM

**By A Speaker**

On 5th September, I left the Marris Hall dissatisfied with the number and quality of speeches delivered by the students in the debate that night. I should have welcomed an opportunity of delivering a speech to the budding speakers on "Hints on Public Speaking." It would however, have been rather presumptuous on my part for my "mental bankruptcy"--by now an open secret and therefore the very idea would have infuriated the Union *intelligentia* I could not help brooding over the matter before sleeping that night. Nature does not disappoint men in the fulfilment of their desires. What I could not do while awake I accomplished while asleep (of course in a dream). I dreamt that night that I was invited as a distinguished guest by the Union authorities to address the students and I delivered the following fine speech :—

"Gentlemen, I have been asked to make a speech and the subject has not been specified. I can therefore go on unbridled saying everything which I feel inclined to say. I am a guest and therefore cannot be congratulated on speaking in candid and blunt manner. I am, however, determined to speak, come what may, so that you may relish the feelings one has when a speech is being inflicted on him "Do as you wish to be done by." Most of you have been guilty of inflicting speeches on others and my speech is a punishment of that crime under section 110 of the "Irrelevent speeches ordinance of 1930."

I should like to impress upon your mind the first essentials of a speech you are required to address an audience with a view to convey something to your listeners. For that you require good delivery and lucid expression. In this, you should not forget that ease, audibility and expressiveness are primarily necessary. In expressiveness, one should have proper ejaculation, fervour and raising and lowering of different pitches of voice to suit the subject matter

educated, and in the last conversation I had with him, this great political warrior told me that there was nothing which would please him better than to spend his last years in his old College of Oxford.

## Underpaid Teachers.

I now come to India, the universities of which are modern, not the growth of centuries but the creation of satute, not the spontaneous outcome of the Indian genius but importations from outside, constructed on a western pattern.

Time has not mellowed their walls or enshrined their traditions. They have been evolved rather hurriedly to meet a cry ever increasing and more insistent for university education. The resources available have seldom been sufficient to do all that is required of them and ultimate ideals must often be sacrificed to immediate and pressing needs. They have no ample endowments and are dependent for existence on external support. The numbers of students who have flocked to their gates have threatened to outstrip the abilities of their teachers to deal with them and in many universities (I do not know whether it is so in Agra) it has become necessary to sacrifice that close personal contact between teacher and taught which is the foundation stone of good university teaching. In many universities (and again I do not know whether it is so in Agra) the teachers are too few and they are underpaid. A university must suffer in its teaching if its teachers are not given abundant leisure for the prosecution of their studies, and while it is impossible to pay teachers very high salaries, it is important to remember that the acquisition of culture is expensive and that the University teacher should be in a position to acquire in reason the books which he needs and to enrich his mind by travel.

These difficulties and inconveniences mean little more than that the newly founded universities of India have not yet had time to adapt themselves completely to the environment in which they exist or to cope with the immense demands which are made upon them. It matters little that the ideal is not attained, provided that it is followed. What would be fatal, would be to abandon the struggle, to be content with something less than the ideal, and sacrificing the true university spirit to allow a university to sink into a mere degree giving machine, the efficiency of which is judged by the prodigality of its output. I have little fear that in the long run this will happen. There are enough Indians imbued with the spirit of true wisdom and conscious of the tremendous mission, which universities must perform in the national life, to overcome the temporary difficulties which beset universities and to steer their policy in the right course, so that the university in India will become primarily a place for the cultivation of spiritual and mental well-being and not a place for the advancement of material interests.

I hope I have not conveyed the impression that I desire an Indian university to become exactly like a western university. That is far from my idea. It has a different civilisation and culture behind it and it should develop in a

They should learn in the university to have a respect for law and civil liberties, since it is on law and civil liberties that we depend for our civilisation. They should acquire patience, moderation and a sense of proportion. They should respect and learn to understand the opinions and feelings of others, and be unwilling to attribute evil or interested motives to those with whom they are in disagreement. They should nourish an undying passion for liberty and truth, and a hatred for injustice and humbug, and above all they ought to cultivate that quality which should be the distinguishing characteristic of the University and which Mathew Arnold described as sweet reasonableness.

## Learning and Beauty.

Then I should like to draw your attention to the connection between learning and beauty. There are many kinds of beauty both external and internal, and of those which belong to the soul of men, the most outstanding are the beauty of wisdom and the beauty of holiness. It is a remarkable thing that the most beautiful external manifestations of man's handiwork are the outcome of these two internal beauties. The most lovely buildings are schools and colleges devoted to the study of wisdom, and mosques, temples and churches devoted to the pursuit of holiness. In architecture the palace of kings may be gorgeous and splendid, courts of justice stately and sombre, government offices prodigal and magnificent; but they seldom achieve real beauty and are not comparable in this respect with edifices devoted to religion and learning. It is not easy to understand to what this association between external and internal beauty is due. To take as an illustration the University of Oxford. It is the growth of many centuries, it is the work of numberless architects, it seems to have been devised on no coherent plan and it has been built to the orders of men who had no special skill in architecture and generally no ample funds to lavish on buildings. Somehow nevertheless its many builders have achieved something which is complete in itself, a unity almost perfect in all its parts. It embodies the spirit of the place and in turn it keeps that spirit alive. We can only believe that beauty in the mind insensibly, but necessarily, communicates itself to external objects; and that the loveliness of the Universities in England and America is, to use the words of the catechism, an outward and visible sign of an inward and spiritual grace.

Now the result of all this is that to many Englishmen scattered all over the world and engaged in very diverse occupations, the university and the years they spent there, mean more than almost anything else in life. It represents an inspiration, a memory of good and a bond of fellowship. This feeling is often not expressed but it reveals itself in unsuspected directions. That great man, Lord Birkenhead, was regarded as a brilliant statesman; a keen, ambitious and practical man and a great controversialist. Few would regard him as an idealist or as one inspired with a spirit of reverence. Yet nothing could exceed his lifelong devotion to the university in which he was

but not imitated. The aims of the university are apt to be perverted by ideas of big business and their outlook is too utilitarian. This, however, is only true of some, and the more famous universities of America can challenge comparison with the best universities of Europe.

**British University Traditions.**

The English attitude to universities is curious. The English are, above all other people, reputed to run to type, to be lovers of the ordinary, to distrust enthusiasm and to suspect originality. Yet inspite of these characteristics they have managed to turn out more extraordinary men with a greater variety of characteristics than any people in the world; and by extraordinary I do not necessarily mean men of extra-ordinary gifts. I mean men out of the ordinary. It can scarcely be said that the English are great lovers or admirers of learning. The last thing the ordinary father would desire for his son is that he should become a professor; the high brow is suspect; and if a man possesses learning he would do well to conceal it in ordinary society since it is the tradition of the English to conceal their best qualities. Thus the Universities in England might have been expected in England to meet with a certain measure of neglect. Soon, however, the average Englishman made the surprising discovery that the universities for whose learning he had but little use somehow managed to produce exactly the type of Englishman he most admired. There was something in the atmosphere of the place, in the quiet of its immemorial buildings, in the aggregation of learned men leading celibate lives (as they were then required to do), in the assembly of generous youth from all parts of the kingdom, in the maintenance of hoary traditions, something quite intangible but very definite, which worked on the spirits of its students and sent them out into the world well fitted to take their place in the life of their nation. If the universities taught but badly in those days, they did at least unconsciously instil a love for beauty, a respect for tradition, a spirit of moderation and a wide outlook which have been of incalculable value in building up the national character. This development was not without its evils. The influx of the wealthy or moderately wealthy created difficulties for the poor student who had been the backbone of the universities in the Middle Ages. Among the wealthy came many who had no desire or intention to devote themselves seriously to the studies of the place, and the teachers were no longer anxious to teach since students did not desire to learn. Gibbon has told us in language perhaps too unmeasured and general, of the decline of the University of Oxford in the eighteenth century and it was not till the beginning of the nineteenth, that its studies were reformed and modelled to the stern pattern of the examination system. If, however, the universities decayed in learning, they did not decay in the humanities, and their gain was a gain to the general social life of the country. One of the great missions of a university is to instil into the minds of those, who may one day be our governors, those qualities which may enable them to govern rightly.

around him is great by example and inspires in his associates an admiration for things which are of good repute and even the inclination to pursue them.

### Attitude towards Gurus.

In fact, the civilisation of a country may in no small degree be judged by the attitude it adopts towards men of learning. In the nineteenth century Germany outstripped other nations in its admiration for learning and was in the forefront not only in the measures it took for the education of the masses but also in the facilities it afforded to its learned men to devote themselves to the higher studies. The professor in Germany was rather like a brilliantly endowed younger brother in a family of robust, boisterous and athletic elders. He was regarded with a certain pity as a man not fitted for the rough and tumble of life, with great tenderness and with an immense admiration. He lived humbly and modestly and was poorly paid, but Germany knew what it owed to him, and the poor professor was enriched by the knowledge that he was the pride of his country and that his reputation was European. He did much to spiritualize a nation whose rather too abundant virility is apt to produce qualities which are the reverse of admirable. The French, in whose temperament a passion for glory is always at war with the sternest, practically regarded the man of learning as mainly an instrument of instruction; and in the higher realms of scholarship they have always been attracted rather by wit and brillance of expression than by profundity.

### American Ideas of 'Big Business.'

The United States patronize (and I use the word deliberately) learning on a very large scale. They are not a people whose mind naturally runs to scholarship, and there are many indications that in some parts of the States the purpose of a university is regarded purely utilitarian. The university is however one of many aspects of life on this planet, and in that aspect, as in all others, the United States have made up their minds to lick creation. One of the favourite methods by which the American millionarie pays ransom for gains which the proletariat are apt to regard as ill gotten, is to endow or add to the endowment of a university. Enormous sums are lavished for this purpose and the buildings and surroundings of some of the American universities are beginning to rival in beauty and dignity the buildings of the older universities of Europe. They have succeeded in doing also something which is much more difficult and which represents one of the most valuable achievements of a university. They have created an atmosphere and tradition of their own so that the American business man looks back on his university with the affection due to an Alma Mater. Possibly it may be said that the Americans have committed the cardinal mistake, a mistake not unknown in this country, of lavishing too much money on buildings and too little on men. The university teacher in America is badly paid; and in a country where undue reverence is paid to wealth ; he suffers in prestige from that cause. America with its devotion to commerce and its pursuit of prosperity is apt to look down on learning as an occupation for lesser men who should be encouraged and patronized

its own sake and not for the titles which it carries with it. The material rewards of learning in this and in nearly all countries are small. The man who devotes his life to scholarship seldom rises to place or power, to material wealth or even to a widespread fame. He has some of the characteristics of the hermit in that the inner life is more to him than the outside world. He aspires to the cultivation of his own mind rather than to a mastery over the minds of others, and this aspiration towards self perfection. irrespective of its external advantages, is a quality which is even more familiar to Oriental philosophy than it is to the Western world. The learned man, however, differs from the eremite by the fact that he is relieved from all reproach of selfishness in that he imparts his wisdom to others and so sweetens not only his own life but the life of his pupils who fall beneath his influence. It is however essential that a university, if it is to take its place on an equal footing with the other universities of the world, should afford ample scope to those whose main mission in life is study and scholarship rather than classroom teaching. Learning is constantly progressive and it is the business of universities to be in the van of progress. If the entire energies of your ablest men are absorbed by the business of imparting text book knowledge and preparing the young for the degrees, it is inevitable that scholarship should stagnate and progress end. It is for this reason that I was glad to see that Canon Davies in his speech at the first convocation of this University said that he would never be satisfied until research had a recognised place in Agra. It was a realisation of the same truth which led Sir Ashutosh Mukerji to devote his energies to the development of higher studies in the University of Calcutta possibly at some sacrifice in other directions.

**A greater prize than material success.**

In an age, the chief passions of which are sport, speed and machinery, it may be asked by some what useful purpose the scholar achieves in the scheme of things. It is true that there are some learned men whose learning has a material value. They tell us how to make two ears of corn grow where one grew before, or they produce some miracle of ingenuity in the realm of science, but it is not to those I refer, but to those whose studies are devoted to non-utilitarian ends, such as philosophy, history and languages. Such men never fly from England to Australia; they show no great proficiency at games and they do nothing to win the admiration of the masses. I think I gave the answer earlier when I said they sweeten life. Of itself it is a good thing in the midst of the crowd's ignoble strife to contemplate those who are not striving. The scholar's life in its perfection is as much a work of art as a beautiful picture or a piece of sculpture. It is good for the soul to contemplate; and if we cannot withdraw ourselves from the struggle for existence with its unpleasant necessities and its often sordid ambitions, it is a refreshment to our spirits to realize that there are men to whom those things are as nothing and that there is a greater prize in life than mere material success. Apart from this the immediate influence of the scholar on those

use them in after life, and as you are judged, the university which has equipped you, will be judged.

**Catholic Character of Universities.**

In a Convocation such as this and in a new university, we see degrees conferred with all the ancient ceremonial, the strange titles such as bachelor, master and doctor, and the antique robes which have distinguished the conferment of degrees and the solemn acts of the universities of the West for some seven centuries. At first sight it might seem inappropriate and even incongruous to introduce into an oriental country with traditions so different from the pageantry of Europe, but I believe the founders of universities in India acted wisely in this matter. The identity of forms and ceremonies is a symbol of the catholic character of universities and betokens the brotherhood which should unite men of learning throughout the world. The University of Oxford is probably not less different from the University of Paris than it is from the University of Agra. Each university developes its own characteristics and its own corporate type, but shares with other universities a unity of purpose in its devotion to scholarship and wisdom. The Europen universities found their origin in a nucleus of persons devoted to the pursuit of learning, and as their learning became known, those who cared for the higher studies flocked to them to be taught. The birth of a university was almost unconscious, and though it is often possible to fix a date at which a university attained a corporate existence and was recognised by Royal Charter, it was generally the case that long before this event it was a seat of unrecognised and unincorporated learning. In the middle ages scholars gathered at a university from all parts of Europe. They were often incredibly poor, uncouth and ragged. They were fiercely contentious, undisciplined and riotous. Within the university itself, nation set itself against nation, religious against secular, one school of philosophy against another in a strife which did not stop short of physical violence, and the scholars only achieved a common purpose in their resistance to a common foe, whether it were the townsmen of the town in which their university was placed, citizens whom they regarded with the same antipathy as the Bolshevik bestows on the bourgeoisie, some great ecclesiastic who claimed to exercise jurisdiction over them or even the king himself. One thing, however, may be said in their favour and that is that for the most part they pursued learning for no material ends. They were inspired by a desire to acquire wisdom and the records of those days are full of accounts of men who spent almost their whole lives wandering from university to university in Europe in the search for that scholar who could teach them most.

**Manufacture of Degrees.**

It is equally true today that a university fails short of its ideal if it is not primarily a place of learning. It is not a factory for the manufacture of degrees and though teaching must occupy a prominent place in its functions, it is necessary that it should number among its members those who follow learning for

quite fair, or a candidate feels doubtful whether, full credit has been given to him for his answers. No one knows better than I do how bitter some of these accidents may be, and how disastrous is the effect they may have on the future career of a student. Nothing has delighted me more than the temper in which Indian students endure adversity. I cannot remember that during all these years an Indian in the moment of severe disappointment has said or written anything which was rude, bad tempered or intemperate. They have been invariably good humoured and courteous, and whether we have done right or wrong they have been willing to credit us with the desire to do our best. There is no better test of a man's character than the way in which he stands disappointment and in this respect the Indian student stands very high.

I regard this matter of the quality of the Indian student as of vital importance to the future welfare of India, because it is only Indians of the highest character, moral and intellectual, who will be equal to the greater responsibilities which consitutional changes must cast upon Indians at no distant date. India must look to the Universities for its future statesmen, and everything depends on the power of the universities to constitute themselves nurseries of statesmen who will lead India to a happy and prosperous future. It is for this reason that I am devoting the greater part of my address today to a discussion of those ideals the pursuit of which may make a university a beneficent force in the life of the country. Perhaps I need hardly apologize, if I base my address chiefly on an experience of the universities of the West, because they have for the most part existed as many decades as the Indian universities have existed years, and the true influence of an institution can only be studied by surveying its history over a long course of years. I am aware of course that I am addressing an affiliating university with colleges scattered over a wide area and, if I speak of the ideals of universities and appear to disregard the colleges, I will only say that I do it for purposes of brevity, and to avoid repetition will say now that the aims of a college should be identical with the aims of the university of which it is a component part.

I must first, however, congratulate the young men who, on the completion of their university career or of a stage in their university career, have today received degrees in many branches of learning. I wish them heartily success in any career on which they may embark, and I hope that their proficiency will redound not only to their own benefit but to that of India. To use the words of Milton, I hope you will all go out of the university enflamed with the study of learning and the admiration of virtue, stirred up with high hopes of living to be brave men and worthy patriots, dear to God and famous to all ages. I would have you remember that in wider sense your education is only just beginning. You are like apprentices who have collected the tools of your craft. You will be judged by the way in which you

# AGRA CONVOCATION ADDRESS

**By Sir Ross Barker.**

**(Chairman, Public Services Commission).**

**The Ideal for an Indian University.**

Mr. Vice-Chancellor and Members of Convocation,—I need hardly say how highly I appreciate the honour of being invited to deliver the convocation address of Agra University. Agra is a place endeared to the whole world by its beauty and its history. It is memorable for many things, but addressing a gathering of the members of the University, I like best to associate it with the great name of Akbar. So much was the city his that at one time it was commonly known as Akbarabad or the city of Akbar. Here he lived a great part of his life and here he was buried. He was a great emperor and a great patron of learning. He was a lover of tolerance and in his pursuit of wisdom he was impatient of the controversies which divided class, race and creed. It would be well that something of his spirit should infuse the University of this city. Nothing could have rejoiced him more than to find in his old home so large a body of men devoted to the study of learning. We all know how tongue-tied he proved to be when he attempted to expound his religion from the mosque at Fatehpur Sikri. I cannot help thinking that if he occupied my place to-day, his diffidence would have vanished and he would have addressed you with a wisdom and an eloquence to which I cannot aspire.

A journalist recently wrote that a person who is called upon to deliver a convocation address to outgoing graduates of a university, needs all the sympathy that one has to spare; and I demand your sympathy not only because you know so much more about everything than I do about anything, but because it is so difficult for the navigator of a convocation address to steer a course between the Scylla of the platitudinous and the Charybdis of the controversial.

**Qualities of Indian Under-Graduates.**

There is, however, one matter in which I hope to enlist your agreement. I am a profound believer in the qualities of the Indian under-graduate of the present day, both mental and moral. I have in the last few years seen many hundreds of Indian under-graduates, and I have been greatly impressed by their capacities. Of course in any large number of men there are the good and the bad. Among the bulk, however, the industry, grit and perseverance shown in acquiring knowledge, often amidst great difficulties and obstacles, which the student of the West has seldom to encounter, have won my unfeigned admiration. And this is not all. During those years, in the office which I hold, it has been necessary on many occasions to inflict on the students, who come before us, the keenest disappointments and sometimes to give effect to decisions which may seem harsh. The conduct of examinations is a difficult matter, and I know that occasions arise when an examination does not seem

# MY NATIVE LAND.

**By Edrie Thomson.**

Tell me, kind traveller, who
Hast wandered round the earth,
Seen sweetest roses blow,
Heard the happiest mirth,
Hast seen the rivers all,
And heard the city's roar,
Hast climbed high mountain peaks,
And sailed the oceans o'er.
Of all the lands which thou hast seen
Which is the land thou crownest queen?
Shall I tell thee, child, where
Nature is most blest?
And shall I tell thee which
Of all the lands are best?
Aye! 'Tis wher'er we're born,
Where kith and kin abide,
Where loved ones wait for us,
To drift in with the tide.
Tho' it be rocky shore,
Or sandy desert, plain,
Or verdant moutain vale,
The beauty is the same.
Of all the lands that I have seen
My native land I crown the queen.

On the way we hurried past the relics of certain ancient monuments whose significance my friend pointed out to me. But my eyes were fixed at the horizon in front and I was tensely waiting for the moment when the Minar would first glean on my sight. Before long the spire of the Minar appeared slightly above the tree-tops and, as we approached near, it seemed to rise higher. As we reached the place where the ancient Minar stands, we jumped out of the cab. I felt an awe and experienced a feeling - perhaps the same kind of feeling which the poet had when he wrote :-

*Mortality ! Behold and fear,*
What a change of flesh is here;
Think how many royal bones
Sleep within these heaps of stones.

The Minar to me appeared to be the symbol and living expression of the high and ambitious aspirations of our past generations and also of the rulers of the past who had a taste in building and architecture which has been declared to be unrivalled even in the modern days of engineering and architectural *skill and which will go down to posterity* as such That ancient monuments also symbolize to me the transitory character of all human undertakings. We then climbed to the top of the Minar and looked around at the landscape. It was a beautiful sight indeed. Everything looked wonderfully tiny and remote. We gazed at all the familiar objects that we had already seen and took a child-like delight in the action. For the moment we quite forgot ourselves, everything, even the historical background of the scene before us.

When we climbed down my mood changed. We looked round the mausoleum of Iltumish and some other monuments. As I looked round these, I grew more pensive. I thought of the mighty monarchs of the past and then of the iron heal of time which was mightier still because it was able to grind their existence from the face of this earth. Everywhere there was a sigh of decay and crumbling old age. This made me think of the future when even these decadent relics would be gone and nothing would be there to remind men of these ancient personages when there would be absolute effacement and oblivion

We strolled among the ruins inspecting each decayed piece of architecture and amusing ourselves with melancholy thought, I do not know for how long, till my friend aroused me from my reverie *and said that it was time for us to be* returning to the station. We returned and came to the place where our cab was standing. As we sped along the road by which we had come, the old Delhi gradually faded from our sight. The brisk and din of whirling trafic in the city soon drew out the sad thoughts that had crawled into my mind not long ago.

picture of a place where grandeur and romance go hand in hand. Probably that is the reason why Delhi, like Agra, attracts every year a large number of tourists from all parts of the globe.

Thus by May, 1926, I had more than once listened from my friends two graphic descriptions of days spent in exploring the ruins of Old Delhi, and of happy hours passed in the shade of crumbling walls with all the grace of antiquity about them. My imagination had been kindled and I found that my heart was full of a longing to be in Delhi to actually see the land of my dreams. I was on the look out for a proper companion when I received a telegram from a friend asking me to be in Delhi on the morning of May 4, for he was passing that city on his way to Simla and wanted to see me. This removed the last obstacle in my way, and I felt very much pleased at the prospect of a journey that I had so longingly looked forward to.

I immediately made the necessary preparations and started. The journey ended without any unusual incident. It was 11 o'clock in the night when I reached Delhi. The station was ablaze with myriad lights and at its sight my heart was filled with a yearning and an impatient eagerness gripped me to know what lay beyond the illumined walls of the station. But I managed to suppress this first impulse and retired to one of the waiting rooms for the night. Sleep, of course, was out of the question but I managed to doze.

In the morning my friend came and with his arrival all the weariness and fatigue (the inevitable consequences of a sleepless night) disappeared. When the first transports of joy were over, we lost no time in starting on our intended trip. My friend who had been to Delhi before, thought that the right thing would be to go round the Raisina first and then go to the Qutub, which lies at a distance of some miles from Delhi. So we headed towards Raisina. As we passed through the straight roads and round the sharp turnings of the so-called New Delhi, I felt how poor artificial beauty was as compared to beauty evolved out of nature. Although it was day time, I tried to imagine the picture of Raisina in the night and wondered if I could like it better. Our taxi-driver who appeared to be quite a talkative fellow, drew our attention to the fact which is supposed to be based on historical evidence, that more than one king built a new Delhi and in each case the construction was followed by a downfall of the builder. Then he suggested as to what should be the fate of the builders of Raisina. We felt quite amused at this logic but we managed to abstain from laughing for we did not want to encourage him to further familiarity. The Raisina is very well in its way and might have its own appeal for some people but did not conform very closely to my ideas of beauty. Specially in May, it gave one the unmistakeable impression of students' boarding houses during long vacation. It was almost altogether deserted. My friend noticing my indifference instructed the driver to proceed to the Qutub. Accordingly in a few minutes we were on our way to that place.

soon he thought of the possibilities of commercial production. His ideal was a world-wide undertaking. In accordance with his ambitious plans first a central factorary developed and soon numerous branches were established throughout the world. In 1895, the Kodak concern was making £ 200,000 per annum. But it was destined to go further.

### Motion pictures.

The invention of Movie-cameras gave a new scope to the Kodak Company. The demand for film was great and Eastman realized that if the 'Cinema-plague' broke out seriously his trade would considerably expand. The trade did expand with the result that in the year 1913 the Kodak Company produced 200,000 feet of film. Today, the quantity of film produced must be double of what it was in 1913. Perhaps an idea of it can be obtained from the fact that last year the profits of the Kodak Company reached the astounding figure of £ 4,500,000.

As for disposition of his wealth, his maxim is, "If a man has wealth, he has to make a choice, because there is the money heaping up. He can keep it together in a bunch and then leave it for others to administer after his death. Or, he can get it into action and have fun, while he is alive. I prefer getting it into action and adapting it to human needs, and making the plan work."

It is estimated that his charities amount to no less than £ 15,000,000. He has bestowed large sums upon the University of Rochester, the Rochester Dental Dispensary, the Rochester School of music, Oxford University and numerous other useful institutions.

He is a striking looking man and dignified in all his actions. He is modest, retiring and hospitable. It is interesting to note that the man who can be called the father of photography, has rarely had his own photograph taken

This is a short account of the successful and instructive career of one who is an inventor, industrialist, organiser, and an enterprising business man.

---

## A TRIP TO THE RUINS OF OLD DELHI.

By Mohd. Shamim.

Delhi! what a host of memories—sweet and bitter are bound up with this single word. This is the name of a place that has witnessed the highest pitch of glory and magnificence as well as the most pathetic scenes of devastation and ruin. People say that this town was seven times built and then destroyed. The site seems to have had a peculiar fascination for our ancient builders. Whatever be the historical associations of the word, it still carries to the mind the

deprived of his father and his mother was compelled to earn her living by accommodating paid-guests. He began as a clerk and a book-keeper and after 12 years when he had saved about £ 1000 he left his job and started business of K, his own, as manufacturer of photographic material.

At that time wet plate, with all its complications and inconveniences was the only known method of photography. Of this Eastman gave a graphic description when he wrote :—

> "I bought an outfit and learned that it took not only a strong but also a dauntless man to be an out-door Photographer. My lay-out, which included only the essentials, had in it a camera about the size of a soap box, a tripod which was strong and heavy enough to support a bungalow, a big plate-holder, a *dark-tent*, a nitrate bath, and a container for water. The glass plates were not, as now, in the holder ready, for use; they were what is known as *wet plates*—that is, glass which had to be coated with collodion and then sensitized with nitrate of silver in the field just before exposure. Hence the nitrate of silver was something that always had to go along and it was perhaps the most awkward companion imaginable on a journey. Being corrosive, the container had to be of glass and the cover tight for silver nitrate is not a liquid to get intimate with. The first time I took a silver bath away with me, I wrapped it with exceeding great care and put it in my trunk. The cover leaked, the nitrate got out, and stained most of my clothing."

### Photography.

Eastman, from the very beginning has been so closely connected with the development of photography that his biography cannot be complete without a reference to the history of the art for which he works and lives. Notwithstanding the valuable contribution made by brilliant scientists notably by Wedgewood, Davy, Fox, Tafoot, and Scott Archer to the art of photography, its process was still complicated and, as Eastman has described, entailed great inconvenience To simplify the process of photographing, was Eastman's life ambition But it was not till 1877 that he invented dry plates and thus got rid of the "dark tent and silver bath". He began, in his spare time, to compose an emulsion that could be coated and dried on the glass plate and retain its properties long enough. His first results did not amount to much, but after repeated experiments, he came upon a coating of gelatine and silver bromide that had all the necessary photographic qualities. At the end of 1879 he got patented his device for coating glass. Next he invented the transparent film which could not break as the glass plate and which could be manufactured in a continuous strip. In the same year he patented a mechanism to hold the film in the camera.

Thus after great difficulties and trouble he was able to present before the world the first portable hand-camera.

At first he had tried to make photography simpler for himself but

remained in America. They continued to hold responsible positions in foreign lands, even though their sole ambition was to serve India.

Injustices done to American trained students can no longer exist. They are sick and tired of being pushed down into the mire and of being called weaklings without being given the opportunity of entering a tournament in which to try their strength. India must give them a chance where they can challenge combat and meet any Oxford swaggerers in fields of religion, science, philosophy, politics, yes, and even in games.

They are not like shrinking violets, nor are they like the pirates on the high seas. But by the work of their intellect and desire to ameliorate the ills of their country, they can prove to India that their degree is not merely child's play, but is equal to the much honoured British degree. Let India send her youth not only to England, but to America, Russia, Japan, Germany, Italy, France and other progressive countries of the world in search of higher learning. If India is to be a leading nation she must develope a sense of appreciation and place a valuation upon the various cultural and scientific standards of the world.

That is not by any means saying that the English system of education, or English thought, commerce or industry, should be in any way discredited, or that the sentiment regarding things ultimately British is fatal and disastrous to the Indian people. The criticism is levelled against the fanatical sentimentalism which clothes the English system of education and [illegible] the minds of the people in delusion. To speak thus is not to speak in disparagement of the English system [illegible] as the philosopher [illegible], "To the [illegible] nothing is foreign. [illegible] is to free yourself." Let India give chances to the American trained student and learn that England alone does not hold monopoly over the wisdom of the world.

---

## GEORGE EASTMAN – THE INVENTOR OF "KODAK."

By MAX.

How many of us have heard of Kodak Cameras and Photograhic material? Almost everybody. And yet few people know who invented the word 'Kodak' and why did he choose this particular word.

Mr. George Eastman, inventor of *Kodak*, wanted a strong and easily pronounced word as a trade mark. In 'Kodak' he found his ideal of a trade mark. It was firm and strong and began with, K, the first letter of his mother's name. He made use of two Ks for "two appealed to him more than one."

**Early career.**

Eastman's career has been remarkable—almost romantic. In 1862 when he was only eight years old he was

he returns home, but pathos of the situation is greatly increased when he learns that the American degree stands no show in his native land. The degree is merely a fly-swatter, so he sits like one recalling a half-forgotten dream and kills flies. The American trained students have long been bleeding and no more can they bear the arrows.

Americans in general cannot appreciate what this means to the young Indian man and woman, to find that his labour for over a period of years is fruitless and is often a drawback in a case where there was absolute sincerity and confidence in striving. Competition with such a system is practically impossible.

This widely spread idea that American degrees are inferior to the English is not really in accordance with the facts but woven by sentiment and prejudice. The fact that the educational system in England is carved out for only a chosen few and the method of instruction and examination is different from the American, thus allowing only a minority to receive degrees, is no basis for setting the English degree upon a pedestal.

The valuation set upon degrees should not be judged from the absolute sense, but from the utilitarian standpoint. It is not irreverent to say that the greatness of America lies in her educational system. The American universities are sending out competent men and women and producing geniuses who are responsible for making the country one of the most advanced and efficient nations in the world.

In commerce, industry, science, invention and even in art America deserves no less credit than any European country, in fact she excels without the least shadow of doubt. Whence has come this advancement? Can a country with a frail, easy-going system of education train her children to be the masters of the social, economical and scientific phenomena of the world in which they live?

It seems strange that Europe, when in search of an atheletic expert, sends to America for an Olympic trainer, or when she feels the need of spanning bridges across her waters, she sends to America unhesitatingly for an engineer It is absurd and contrary to common 'horse-sense' for a person of average intelligence to place condemnation upon or hold in low esteem the American degree.

India has lost many competent leaders because of this hypercritical veneer that coats the English degree, and never offering co-operation or sympathy to the American trained student. Those who went to India after a long period of hard working in America, fell back into the old rut, since to them no facility of the expression or utilization of their training was available, and after growing tired of begging for jobs they sank into a state of laziness and dejection.

There were a favoured few, however, who received recognition because of their social standing and political pull, yes, they have such a thing in India as political pull. Many students were forced to take up work out of their fields and expected to make good. If they failed, they gained publicity, but if they made good, the story remained untold.

Seeing the condition their fellow-students were plunged in, many have

# INDIA AND AMERICAN DEGREES

By Miss Sakina Karamat, B. Sc., B. A. (U. S. A.)

American college degrees are considered practically worthless in comparison with the English degrees in India today. Not long ago thirty-seven students left Calcutta in search of higher education in the Western world. Because of the prejudice against American education, thirty-five of this group, who came from homes of wealth, landed in England, and only two who were the victims of circumstances went to America.

They were men who had seen life in its nakedness, met the irressistible forces; unflinching ambition and the desire to alleviate the conditions of their country had brought them to America, the only country in the world which gives a man a chance to obtain an education if he is willing to face the hardships which are inevitable in the case of persons without means. But these same students encountered difficult problems when they returned to their home, and faced a peculiar fate.

The writer does not speak with malice or antagonism, for many years of actual experience in obtaining an education in America support her statements. It is only the student with mental strength to endure suffering and adversity with courage who meets the variegated problems and attains his goal.

Human society has ever held back by pre-judgment without due examination, holding back the concordant functioning of human society. In every country and among every race, except the Islamic people, class or colour prejudice has always existed. American leaders have attempted to rid America of the disease of the mind which holds thousands back from winning their desired ends. Yet so deeply rooted is the colour prejudice in the minds of the American public that the man with a dark skin appears to be merely a peculiar shadow of humanity, devoid of intelligence, passion and delicate sensibilities. The Indian student suffers gross indignities at the hands of the ignorant public who are incapable of knowing that pigmentation of the skin is a biological phenomenon and not the mark of a lower human state.

Finance is one of the greatest drawbacks to a high standard of living for the student from India. The struggle for a mere existance is a difficult process, for professional jobs and partially skilled labour are not easily opened to the Indian student. In Chicago the majority of Indian students work as peddlers for want of better employment.

Imagine a soft-eyed Brahmin lad with centuries of philosophical thought at his back and a mind keenly mystified by the mirages of religions and metaphysics, trying to be a peddler in the poorer districts of a metropolis. Imagine him in the cold winter with his bag full of perfumes, soaps, powders, facial cream and even ladies' under-wear knocking from door to door, and many times being turned down by some corpulent, greasy woman.

He studies hard and works faithfully, hoping to apply the fruit of his toil when

# EDITORIAL

The welcome extended by the Staff and the students of all the institutions of our University to Dr. Syed Ross Masood, our Vice-Chancellor, on his return from Europe on the 1st of November was unique and mirrored the great esteem and affection in which he is held by all. He had gone to the West for expert medical treatment and we are glad to note that he looks much better and healthier now.

We, on behalf of our College, heartily welcome him and hope that in him our Magazine too would find a kind patron.

---

The article " India and American Degrees " has been contributed by Miss Sakina Karamat. We thank her very heartily for this kindness and hope that in future also she will not forget our Magazine. May we request her to write her second article on "The Art of Public Speaking."?

---

We have been informed that the New Circle Dining Hall held a High Table Function in the first week of November. Some people say that the dishes served were sumptuous and tasteful but we have no *personal* knowledge to confirm or contradict this report.

---

We beg to thank the editors of the following journals for the courtesy of exchanging their magazines with us.

1. Ravi (Government College Magazine, Lahore).
2. Crescent (Islamia College Magazine, Lahore).
3. My Magazine, Madras.
4. Dayal Singh College Magazine, Lahore.
5. Islamic Review, London.
6. Indian Educator, Madura.
7. Education, Cawnpore.
8. Muslim University School Magazine, Aligarl
9. Murray College Magazine, Sialkot.

---